کلیات رشید احمد صدیقی

(خاکے۔ دوم)

جلد چہارم

ترتیب وتدوین

ابوالکلام قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

کلیات رشید احمد صدیقی

(خاکے۔ دوم)

جلد چہارم

ترتیب و تدوین

ابوالکلام قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110066

پہلی اشاعت : 2009
تعداد : 1100
قیمت : -/219 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1338

Kulliyat-e-Rashid Ahmad Siddiqui, (Khakey-2) Vol.-IV
Compiled by
Abul Kalam Qasmi

ISBN :978-81-7587-327-8
ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک ـ 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی ـ 110066
فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159
ای ـ میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرس، C-7/5، لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی ـ 110053
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

کلاسیکی ادب کی بازیافت کا سلسلہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں جاری ہے۔ مگر بیش تر زبانوں میں اس وقت بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب متعدد ادب پارے دست بردِ زمانہ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس دشواری کا ایک حل یہ ہے کہ ان اہل قلم کے شہ پاروں کو محفوظ کرلیا جائے جو زیادہ عرصہ نہ گزرنے کے باوجود نئے کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور جن کے بارے میں اندازہ ہے کہ امتدادِ وقت کے ساتھ ان کے فن پاروں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس ضمن میں ایک بڑے منصوبے کی صورت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے سب سے پہلے پریم چند کے کلیات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ تقریباً ایک دہائی قبل اس کلیات کی تمام جلدیں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہو کر قبولیت عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔

کلیات پریم چند کے بعد یہ سلسلہ جاری ہے اور متعدد نئے کلاسیک سے متعلق جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اس ضمن میں ایک بڑا منصوبہ ''کلیات رشید احمد صدیقی'' کی اشاعت کا بھی ہے جس کی تدوین کی ذمہ داری پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے قبول کی ہے اور توقع ہے کہ بہت جلد اس کی تمام جلدیں شائع ہو کر منظر عام پر آ جائیں گی۔

رشید احمد صدیقی، بیسویں صدی کے نصف اول میں غیر معمولی طور پر فعال اور زرخیز ذہن کے مالک ادیب کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ ان کی تصنیف و تالیف کا عرصہ تقریباً ساٹھ برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے خاکے بھی لکھے، طنزیہ مضامین بھی لکھے اور انشائیے بھی لکھے۔ وہ تنقید نگاری میں بھی مصروف رہے اور تقریباً سو سے زیادہ اہم کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔

مگر صنفی اعتبار سے اس تنوع کے باوجود رشید احمد صدیقی کو نمایاں طور پر طنز و مزاح اور انشائیہ کی اصناف کے بنیاد گذار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر اردو طنز و مزاح اور انشائیہ کی اصناف کو رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری نے ایسا استحکام نہ بخشا ہوتا تو بعد کے زمانے میں مشتاق احمد یوسفی، مختار مسعود، کرنل محمد خاں اور مجتبیٰ حسین جیسے طنز و مزاح کے نمائندہ ادیبوں کی تحریروں میں ایسی رنگا رنگی نہ پیدا ہوئی ہوتی۔ رشید احمد صدیقی کا ایک بڑا کارنامہ علی گڑھ اور دبستانِ علی گڑھ کو ایک روایت میں تبدیل کرنا بھی ہے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو جس طرح ایک تہذیب، ایک کلچر اور ایک شائستہ طرزِ زندگی کی علامت کی شکل میں پیش کیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علی گڑھ، عرصۂ دراز تک اپنے علمی اور تہذیبی کارناموں کے ساتھ رشید احمد صدیقی کی تحریروں کے حوالے سے بھی زندہ رہے گا۔

مجھے خوشی ہے کہ کلیات رشید احمد صدیقی کے پروجیکٹ میں ان کی کتابی شکل میں مطبوعہ تحریروں کے ساتھ رسائل کے صفحات میں منتشر تحریروں، ان کے خطوط اور غیر مطبوعہ تحریروں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ کلیات محض رشید احمد صدیقی کی تحریروں کی دوبارہ اور یکجا اشاعت ہی نہیں، تحقیق و تلاش اور تدوین کا بھی عمدہ نمونہ بن کر قارئین کے سامنے آ رہا ہے۔ قومی اردو کونسل کی کوشش رہتی ہے کہ اس طرح کے اپنے تمام منصوبوں میں اعلیٰ معیار برقرار رکھا جائے۔

قارئین سے گزارش ہے کہ اس کتاب میں اگر انھیں کوئی کوتاہی نظر آئے تو قومی اردو کونسل کو باخبر کریں تاکہ اس کوتاہی کا ازالہ اگلی اشاعت میں کر لیا جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

مقدمہ

رشید احمد صدیقی کے خاکوں کا سب سے بڑا امتیاز مختلف شخصیات کی ممتاز صفات اور خصوصیات کی نشان دہی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے کسی بھی شخصیت کی انسانی کمزوریوں کو کسی طرح چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ مگر یہ کمزوریاں، کمزوریوں کے طور پر نہیں بلکہ فطرت کے تقاضے اور انسانی جبلّت کے نشیب و فراز کے طور پر سامنے آئی ہیں۔ چوں کہ رشید صاحب کا اندازِ بیان اور اسلوب نگارش ان کی ہر پیش کش کو غیر معمولی طور پر دلچسپ اور پُر وقار بنا دیتا ہے، اس لیے شخصیت کی خوبیاں ہوں یا خامیاں، ان کے بیان میں کہیں بھی تلخی، تلون، ناپسندیدگی یا کسی منفی نقطۂ نظر کا گمان تک نہیں گزرتا۔ کہتے ہیں کہ کسی صاحب اسلوب کے ایسے رویے، کشادہ قلبی، وسیع المشربی اور سیر چشمی کے بغیر نہیں پیدا ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ رشید احمد صدیقی اس نوع کی سیر چشمی کی بہترین مثال تھے۔ ورنہ صورت حال یہ ہے کہ طنز و مزاح نگار ہو، انشائیہ نگار یا خاکہ نگار، اگر اس کے مزاج میں ذرا بھی تلخی یا تلون کی کیفیت ہے تو وہ اسے کبھی چھپا نہیں پاتا۔

رشید صاحب کے خاکوں کی ایک اور خصوصیت اپنے شخصی موضوع کے ساتھ ان کے کمالات، انفرادی نقوش اور علمی و ادبی امتیازات تک کو شخصیت کے اجزائے ترکیبی بنا کر پیش

کر دینا بھی ہے۔ چنانچہ ان تمام خاکوں میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ ان میں بعض شخصیات کی حیثیت شاعر کی ہے تو بعض کی دانش ور کی، بعض کو عہدے اور مناصب حاصل ہوئے تو بعض دنیاوی نام ونمود سے بے نیاز رہے، بعض کی دانش ورانہ حیثیت تسلیم شدہ رہی تو بعض کا سب سے بڑا امتیاز، خود، رشید کا دوست اور ان کی پسندیدہ شخصیت ہونا رہا۔ غرض رشید صاحب، ہر رنگ میں بہار کا اثبات کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخصیت رشید صاحب کے خوابوں اور تمناؤں کے شہر علی گڑھ اور وہاں کی دانش گاہ سے کسی بھی طور پر ہم رشتہ رہا ہے تو پھر تو رشید صاحب کی گل افشانیٔ گفتار قابلِ دید ہوتی ہے۔

چوں کہ رشید احمد صدیقی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تمام خاکوں کو ایک جلد میں سمونا ممکن نہیں تھا اس لیے خاکوں کے لیے دو جلدیں مخصوص کی گئی ہیں۔ دونوں ایک دوسری کی تکمیل بھی کرتی ہیں اور نوعیت کے اعتبار سے الگ الگ منظر نامہ بھی تیار کرتی ہیں۔

000

رشید صاحب کے تحریر کردہ خاکوں کا پہلا مجموعہ ''گنج ہائے گراں مایہ'' پہلی بار ریاض ہند پریس، علی گڑھ سے 1942 میں شائع ہوا تھا۔ دوسری بار کتابی دنیا، دہلی سے 1946 میں شائع ہوا، پھر اسے مکتبہ جامعہ، دہلی نے 1962 میں شائع کیا۔

''ہم نفسانِ رفتہ'' کی پہلی اشاعت دارالمصنفین، اعظم گڑھ سے 1960 میں ہوئی۔ انڈین بک ہاؤس، علی گڑھ سے اس کی اشاعت 1966 میں اور سرسید بک ڈپو، علی گڑھ سے 1972 میں ہوئی۔ اس کے علاوہ پاکستان سے بھی مختلف اداروں سے یہ دونوں تصانیف متعدد بار شائع ہو چکی ہیں اور اب بھی شائع ہو رہی ہیں۔

''گنج ہائے گراں مایہ'' مطبوعہ مکتبہ جامعہ 1963 اور ''ہم نفسان رفتہ'' مطبوعہ 1972 کو ہی مرتبین نے سامنے رکھا ہے۔ یہ دونوں مجموعے رشید صاحب کی زندگی میں ہی شائع ہوئے تھے اور رشید صاحب نے اس میں کوئی ترمیم یا اضافہ نہیں کیا تھا۔

اس کے علاوہ رشید صاحب کے تحریر کردہ وہ خاکے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے اور ان دونوں مذکورہ مجموعوں میں شامل نہیں ہیں، ان خاکوں کو بھی اس مجموعے میں شامل کر دیا گیا ہے۔

رشید صاحب کے تحریر کردہ ان خاکوں کی نوعیت تاثراتی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ مجموعہ میں شامل شخصیات کے مختصر حالات تعارف کے طور پر درج کردیے جائیں اور پیدائش اور وفات کی معلوم اطلاعات فراہم کردی جائیں، نیز ماخذات کی نشان دہی بھی کردی جائیں۔

'گنج ہائے گراں مایہ' میں سولہ اور 'ہم نفسان رفتہ' میں سات خاکے ہیں اور ان خاکوں کی تعداد جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں اور ان دونوں مجموعوں میں نہیں ہیں ان کی تعداد آٹھ ہیں۔ شیخ نیازی اور ذاکر صاحب پر تحریر کردہ خاکے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

'گنج ہائے گراں مایہ' اور 'ہم نفسانِ رفتہ' میں شامل خاکوں کی تعداد مجموعی طور پر تئیس (23) ہے۔ یہ تمام خاکے 'خاکہ' سے متعلق پہلی جلد میں شامل کر لیے گئے ہیں اور ایسے تمام خاکے جو ان دونوں مجموعوں میں شامل نہیں، اور ان کی اشاعت متفرق انداز میں رسائل و جرائد میں ہوتی رہی یا پھر 'شیخ نیازی' کی ایک الگ کتابچے کی صورت میں شائع کیا گیا، ان کو دوسری جلد میں شامل کرلیا گیا ہے۔

خاکوں کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ انھیں مختصر ہونا چاہیے مگر رشید احمد صدیقی کے بعض خاکے طویل ہی نہیں اس حد تک طویل ہیں کہ انھیں الگ سے کتابچے کی شکل میں شائع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا گیا۔ تاہم صنفی اعتبار سے اسے 'خاکے' کی صنف سے الگ کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔ 'خاکے' سے متعلق دونوں جلدوں میں حسب ضرورت حوالے اور حواشی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ فارسی اشعار کا ترجمہ درج کیا گیا ہے اور پہلی بار ان خاکوں کو معاصر تدوینی اور اشاعتی معیار اور طور طریقے کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔

شاید اس بات کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ 'کلیات رشید احمد صدیقی' کی تمام جلدوں کی تکمیل، تدوین اور تحقیق میں میرے معاون جناب مہرالٰہی ندیم کا بھرپور تعاون حاصل رہا ہے جس کا حق ادا کرنا آسان نہیں —— بس اظہارِ تشکر کیا جاسکتا ہے۔

ابوالکلام قاسمی

●●●

فہرست مضامین

●

ڈاکٹر ذاکر حسین
(1897-1969)

ذاکر صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ ایک ماہر تعلیم اور عظیم دانش ور تھے۔ 1897 میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد وکالت کرتے تھے۔ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ سے 1913 میں ہائی اسکول پاس کر کے علی گڑھ کالج میں داخلہ لیا۔ 1918 میں بی۔ اے کیا۔

ترک موالات کی تحریک سے متاثر ہو کر علی گڑھ خیر باد کہا اور قومی تحریک میں شامل ہو گئے۔ 1922 میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے جرمنی گئے اور معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر 1926 میں ہندوستان واپس آئے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے طویل عرصہ تک جامعہ کی ترقی و تعمیر میں اپنی صلاحیتیں وقف کر دیں۔

1948 میں ذاکر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد یونیورسٹی پُر آشوب دور سے گزری۔ ذاکر صاحب کے دور میں ادارہ کو استحکام ملا۔ 1956 میں ذاکر صاحب نے خرابیِ صحت کی بنا پر استعفیٰ دے دیا۔

1957 میں ذاکر صاحب نہرو جی کے اصرار پر بہار کے گورنر ہوئے۔ 1963 میں جمہوریہ ہند کے نائب صدر اور 1967 میں صدر جمہوریہ ہند کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ مرتّب o

مرشد

مارواڑی عورتوں، بنگالی مردوں اور شرعی مسلمانوں کے ساتھ سفر کرنے میں مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ ایک بار ان صاحب کا ساتھ ہوا، مرشد بالائے علم! حقیقت یہ ہے کہ مرشد نہ ہوتے تو زنجیر کھینچ لیتا یا سمت مخالف سے آنے والی گاڑی پر کود جاتا۔ ایک میں مالی نقصان تھا دوسری میں جان کا۔ کچھ ہوتا، یہ کیا کم تھا کہ اپنا ہی ہوتا۔ قومی نقطۂ نظر سے یہ صورت مناسب نہ تھی پھر مرشد کا ساتھ، جن کی معیت میں ایک بار کانگریس کے پنڈال اور حکیم اجمل خاں مرحوم کے مطب میں ہو آیا تھا۔ بہرحال قوم کی خاطر میں نے زندہ رہنا اور سفر کرنا گوارا کرلیا۔

اسی طرح کی قومی الجھنوں اور ذاتی وسوسوں میں مبتلا تھا کہ مرشد پر نظر جا پڑی، معلوم ہوا کہ برہمی کے بجائے اضطراب کا عالم ہے۔ مرشد کا اضطراب دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو جب بھوکے ہوتے ہیں اور ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ بھوکے نہ ہوں دوسرا ایک واقعہ ہے جس سے شاید کم لوگ واقف ہوں۔

جس سال کالج نان کوآپریشن کی زد میں آیا مرشد اور میں ہم نوالہ، ہم اقامہ، ہم سبق اور ہم خیال تھے۔ مرشد ان طلبا میں سے تھے جن سے کالج کے اربابِ حل وعقد مرعوب یا مشتبہ

رہے۔ وہ یوں کہ ان کی حاضری ہمیشہ کم رہتی تھی، لیکن اچھے سے اچھے نمبروں سے پاس ہوتے۔ یونین کے بے مثل مقرروں میں سے تھے۔ کرتا، پاجامہ گھریلو، داڑھی شرعی، شیروانی حیدرآبادی، غذا ڈائننگ ہال کی، ناشتہ دوسروں کا، دوا دہلی کی، مرشد کو ہمیشہ اس کا اندیشہ رہا کہ ان کی تندرستی ناقابل اعتبار ہے۔ اس لیے آس پاس کے تمام معتبر اور غیر معتبر حکیم اور ڈاکٹروں سے رجوع کیا کرتے تھے، جن میں حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار انصاری بھی تھے اور ایسے بھی جن کے نام سے یا تو ان کا سائن بورڈ واقف ہوتا یا خود مرشد یا پھر وہ جن کے بارے میں کہا گیا ہے۔

آں را کہ خبر شد خبرش باز نہ آید

دہلی جا کر ان سے سب کی تجویز کردہ یونانی انگریزی ویدک دوائیں خرید تے، طرح طرح کے پھل اور مٹھائیاں بھی ہوتیں۔ اسٹیشن کے خوانچہ فروشوں سے بھی کچھ نہ کچھ خرید لاتے۔ بورڈ تک پہنچ کر اعلان کرتے، مریضوں اور مخلصوں کا اجتماع ہوتا۔ ان فتوحات میں شریک ہونے کی ایک شرط تھی یعنی جو شخص پھل یا مٹھائی میں حصہ لگائے گا اس کو دوا بھی کھانی پڑے گی اور جو شخص اپنی پسند کی دوا کھائے گا اس کو مرشد کا انتخاب کیا ہوا پھل کھانا پڑے گا۔ اسی طرح اس کے برعکس مرشد دواؤں کے خواص اس مخلصانہ انداز سے بیان کرتے کہ ہم سب اپنے میں کوئی نہ کوئی بیماری یا اس کے آثار محسوس کرنے لگتے۔ کسی نے دوا کھانے میں تامل کیا تو اس کو امراض کے عواقب سے اس طور پر ڈراتے جس طرح مولوی عذاب عقبیٰ سے۔ اپنی لائی ہوئی دوائیں مرشد خود بہت کم استعمال کرتے۔ البتہ جہاں کہیں پہنچ جاتے اور کسی اور کی دوا رکھی ہوئی مل جاتی تو اس کو کھائے بغیر نہ رہتے تھے۔ کسی مریض یا مرض کے لیے دوا تیار ہونے کا اہتمام یا چندہ ہوتا تو مرشد خود شریک ہوتے۔ قدمے، دامے، سخنے۔

ایک دفعہ عطاء اللہ خاں درّانی[1] کے کمرے میں پہنچ گئے۔ خان کو کیمیا بنانے اور کھچڑی پکانے سے غیر معمولی شوق تھا۔ صبح سے شام تک سید محمود (کچی بارک) کے برآمدے

---

1. عطاء اللہ درّانی نے دیوان غالب کا انگلش میں ترجمہ کے لیے یونیورسٹی کو ایک لاکھ کی رقم دی تھی۔ ترجمہ کا کام آل احمد سرور صاحب کے سپرد کیا گیا تھا۔ سرور صاحب نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ ترجمہ مکمل کر کے درّانی صاحب کو دے دیا تھا، لیکن وہ ترجمہ بھی شائع نہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مسئلہ پر ذاکر صاحب سرور صاحب سے خفا تھے!

میں انگیٹھی دہکتی رہتی۔ کیمیا سے سیر ہو جاتے تو کھچڑی کی دیگچی آگ پر رکھ دیتے اور کھچڑی سے فراغت پاتے تو کیمیا بنانے میں مصروف ہو جاتے۔ نمونیا سے ڈرتے تھے اور کسی لڑکی پر عاشق تھے۔ مرشد نے فرمایا بھوکا ہوں کچھ کھلاؤ۔ خان نے کہا کھچڑی میں تو دیر ہے اور اس وقت کچھ اور موجود نہیں۔ بریکٹ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا اس مرتبان میں کیا ہے۔ فرمایا، 'معجون جالینوس' دہلی سے منگایا ہے۔ اتنے میں خان کسی دوسری طرف متوجہ ہوئے، مرشد نے ساری معجون مرتبان سے معدہ میں منتقل کر دی۔

مرشد پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کہنے لگے ہندوستانی دواؤں میں شکر خوشبو یا بد بو کے علاوہ کوئی اور بات قابلِ اعتنا نہیں ہوتی۔ اس لیے مقدار کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ پھر بات دیسی طریقۂ کار علاج پر چلی۔ فرمایا، اطبا مرض کا علاج کرتے ہیں، ہونا چاہیے مریض کا علاج۔ مرض ایک غیر شخصی چیز ہے، مریض ایک شخصیت، عام طور پر اطبا دونوں کو ایک قرار دیتے ہیں۔ اسی سبب سے کبھی کبھی مرض جاتا رہتا ہے تب بھی مریض ماؤف رہتا ہے۔ عرض کیا مرشد، آپ کی قسمت میں دوا کھانے کے بجائے دوا تجویز کرنا ہوتا تو کیا کرتے؟ فرمایا ہر مرض کا علاج اچھی سے اچھی غذا سے کرتا۔ میں نے کہا، علاج الغربا شاید اسی اصول پر تصنیف کی گئی ہے۔

ذکر تھا کالج پر نان کوآپریشن کے حملے کا اور بیچ میں آ گئے یہ 'صفحات معترضہ'۔ مرشد کو نان کوآپریشن کی تحریک سے کوئی ایسی دلچسپی نہ تھی بلکہ ارباب کالج کے ایک حد تک معاون تھے اور نان کوآپریشن کی تحریک کے جلسوں اور ہنگاموں میں تفریحاً شریک ہوا کرتے تھے۔ وہ رات آج بھی یاد ہے جب ہم دونوں شورش مچانے والوں کی 'سعی لاحاصل' پر صاحب باغ میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ صبح کالج تو جانا نہیں ہے۔ ناشتے میں دلیا کی بجائے کھچڑی کیوں نہ ہو، اتنے میں سید نصیر الدین علوی گاتے، گالی دیتے اور ہکلاتے آ گئے۔ ان سب سے فارغ ہو کر گویا ہوئے۔ ''صبح مجھے غسل کر کے مولانا محمد علی کی ہونے والی تقریر کا جواب سوچنا ہے۔''

ذاکر صاحب نے کہا۔ ''یہی مجھے بھی کرنا ہے۔''

بحث کی نوعیت یہ تھی کہ ذاکر صاحب کہتے تھے دو باتوں میں سے ایک کرنی ہوگی یا تو میں نہاؤں گا آپ تقریر کا جواب سوچیں گے یا آپ غسل فرمائیں گے میں تقریر کا جواب

سوچوں گا۔ دونوں حرکتیں دونوں نہیں کریں گے۔ علوی صاحب کو اس پر اصرار تھا کہ پہلے یہ طے کرلیا جائے کہ غسل کا حق مرجح کس کو ہے۔ اس پر تا دیر دونوں میں طرح طرح کی بحث طرح طرح سے ہوتی رہی۔

صبح ہوئی یونین میں جلسہ ہوا۔ میں اور مرشد بھی ایک طرف بیٹھ رہے۔ مولانا محمد علی نے حسب معمول بڑی پر زور تقریر کی، لیکن حاضرین پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ ان کے بعد مولانا شوکت علی آئے۔ دوپہر ہونے والی تھی۔ دونوں بھائی ٹرین سے کہیں باہر جانے والے تھے۔ تقریر کی آخری اور کمزور موجیں کنارِ ساحل سے ہم آغوش ہونے والی ہی تھیں کہ مولانا شوکت علی نے آخری بار ایک مایوسانہ وارفتگی کے ساتھ یہ مشہور اور فرسودہ شعر ۔

سپردم بہ تو مایۂ خویش را

تو دانی حسابِ کم و بیش را

پڑھا اور کھلے ہوئے انداز سے جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ مڑ کر دیکھتا ہوں تو مرشد کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ دم بہ خود ہو گیا۔ مجمع قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ مرشد کو کھینچتا ہوا باہر لایا۔ پوچھا، یہ کیا ہوا؟

فرمایا، ''رشید صاحب الوداع، زندگی کا آغاز بخیر ہوا، انجام کے بھی بخیر ہونے کی دعا کیجیے گا۔ میرے پاس جو کچھ میرا ہے وہ یوسف[1] اور محمود[2] کے (دو چھوٹے بھائی) کے حوالے کر دیجیے گا۔ کالج کے کاغذات ہوں گے ان کو واپس بھیج دیجیے گا۔'' میں نے کہا، مرشد، اس تحریک سے متعلق اکثر گفتگو رہی۔ آپ اس طریقۂ کار کے کچھ ایسے موید بھی نہ تھے آخر یہ کیا ہوا؟

فرمایا، تحریک غلط ہو یا صحیح۔ اس کے بارے میں یقین اور صحت کے ساتھ کچھ کہنا ناممکن بھی ہے اور قبل از وقت بھی۔ مجھے جس بات نے بے دست و پا کر دیا وہ یہ خیال تھا کہ کہنے والے یہ نہ کہیں کہ علی گڑھ نے ایسی تحریک میں حصہ نہ لیا جس میں مصائب کا سامنا تھا۔ مجھے تو یہ

1 ڈاکٹر یوسف حسین خاں (1979-1902)

2 ڈاکٹر محمود حسین خاں ڈاکٹر صاحب کے برادران۔

بتلانا ہے کہ فرزندانِ علی گڑھ رزم اور بزم دونوں کی ذمہ داری اٹھا سکتے ہیں۔ آپ مزاحم نہ ہوں۔ پانسا پھینکا جا چکا ہے، انجام جو کچھ ہو۔ اچھا خدا حافظ۔

ریل پر سفر کرنے والوں کی ایک عجیب ذہنیت ہوتی ہے۔ ٹکٹ خرید لینے کے بعد اور کبھی اس کے بغیر بھی یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ہر ایسے فعل کے لیے آزاد ہیں جس سے کمپارٹمنٹ میں گندگی پھیلتی ہو یا مار پیٹ ہو جانے کا امکان ہو۔ ڈبے میں داخل ہوں گے یا ہونے دیے جائیں گے تو اس بدگمانی کے ساتھ کہ دوسرے تمام مسافروں نے ان کی آسائش کے حقوق غصب کر لیے ہیں، اور یہ نان کوآپریٹر قسم کے مظلوم ہیں۔ ان کو حق پہنچتا ہے کہ جتنا ظلم چاہے کر لیں، دوسرے کو شکایت یا تدارک کا حق نہیں۔ دوسری طرف بقیہ مسافر اس پر تلے ہوتے ہیں کہ نان کوآپریشن کا چاہے جو انجام ہو، نو وارد کی جان ورنہ ناموس کی خیر نہیں۔ دونوں اپنی جیسی کر ڈالتے ہیں، لیکن جلد ہی اس طرح گھل مل جاتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ بک بک کرنے، دہی بڑے کھانے اور جھوٹے پتے ادھر اُدھر بکھیرنے لگیں گے۔

عام طور پر دیکھنے میں یہ آیا ہے بچے، عورتیں، ریل کے مسافر، محنتی مزدور وغیرہ معمولی سی معمولی بات پر برہم ہو کر اس شدت سے لڑتے جھگڑتے ہیں جیسے اس کے بعد پھر کبھی ایک دوسرے کا منہ دیکھنا گوارا نہ کریں گے، اور نہ معلوم مدت تک درپے انتقام رہیں گے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد فریقین ایک دوسرے سے بے تکلف ہو جائیں گے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ حالاں کہ اس سے بدرجہا کم بے تکلفی کا کوئی واقعہ پڑھے لکھے مہذب لوگوں کو پیش آجائے تو عمر بھر کے لیے ایک دوسرے منحرف ہو جائیں گے۔ شاید ایک کا تعلق جبلت حیوانی سے، دوسرے کا تہذیب انسانی سے ہے۔

کمپارٹمنٹ اور غسل خانے کی سرحد پر بیٹھے ہوئے ایک شرعی مسلمان، وضو بنا رہے تھے۔ وضو کا لوٹا عموماً میلا اور ٹپکتا ہوتا ہے۔ میلا ہونا اور نہ ہونا ایک نکتہ سے بھی تعلق رکھتا ہے یعنی جب تک کوئی چیز ظاہر ہے اس کے میلے ہونے نہ ہونے کا سوال غیر متعلق ہے۔ اگر کسی کو اس سے اتفاق نہیں ہے تو اس کو اپنے گریبان یا تہبند میں منہ ڈال کر غور کرنا چاہیے تہبند شرع کی رُو سے یقیناً پاک ہوگا۔ لیکن حفظانِ صحت کے اصول سے میلا اور متعفن۔

چنانچہ وضو اس طور پر کیا جا رہا ہے کہ کچھ پانی کمپارٹمنٹ کے فرش پر گر رہا ہے اور کچھ غسل خانے میں، اور دونوں کا آمیزہ لباس اور جسم پر وضو بن گیا' تو اس فاتحانہ انداز سے کھڑے ہوئے گویا کوئی پرانے زمانے کا تھانے دار دفعہ 144 کے ملزم کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوا ہو۔ بھیگے ہوئے اعضا کو کپڑے سے خشک کرنے کے بجائے ہاتھوں سے پونچھ کر چھینٹے ہوا میں اُڑا رہے ہیں۔ کوئی بُرا مانے یا معترض ہو تو اس طور پر بپھریں گے جیسے اسلام خطرے میں ہو اور صرف یہی ایک مسلمان، دجال سے نپٹنے کے لیے بقید حیات ہوں۔ گاڑی کان پور پہنچی، نماز کا وقت تھا گاڑی سے اُتر پڑے اور پلیٹ فارم پر نماز پڑھنا شروع کر دیا۔ ان کو دیکھ کر کچھ اور مجاہد جھپٹے اور نماز با جماعت شروع ہوگئی۔ کوئی لیڈر نان کوآپریشن کے سلسلے میں گرفتار کیے گئے تھے اور اسی ٹرین سے کہیں بھیجے جا رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر ایسا ہجوم اور شور و غوغا تھا کہ کسی کو اپنی عزت و عافیت خطرے سے خالی نظر نہیں آتی تھی۔

سمجھ میں نہیں آتا اس وقت نماز با جماعت ادا نہ کرنے سے اسلام کو کوئی خطرہ لاحق تھا۔ میدان جنگ میں بھی نماز با جماعت ہوئی ہے اور ہونی چاہیے، لیکن یہ کیسے مان لیں کہ اس وقت پلیٹ فارم پر با جماعت نماز ادا کرنا ضروری تھا اور اس طرح کی نماز ایسے مقام پر کیوں ضروری تھی جہاں ہر طرح کے لوگوں کا ہجوم ہو، ہل چل مچی ہو اور عامتہ الناس کو جن میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ راحت اور آزادی کے ساتھ ضروری کاموں کے انجام دینے میں دشواری پیدا ہوتی ہو۔ اگر اس ہلڑ اور دھوپ میں با جماعت نماز ادا کی جا سکتی ہے تو مسجد کے سامنے باجا بجنے اور جلوس کے گزرنے پر مسلمان نماز ادا کرنے سے کیوں قاصر رہتے ہیں؟

اسی پیچ و تاب میں تھا اور ہر اناڑی ریفارمر ابتدا میں اس طرح کی منہ زوری سے کام لیتا اور بے ضرورت آمادۂ شہادت رہتا ہے کہ مرشد سے داد لینے کے لیے متوجہ ہوا۔ ''خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے'' آواز دی مرشد آ گیا عین پلیٹ فارم پر وقت نماز دیکھئے ایک ہی صف میں محمود و ایاز کھڑے ہیں۔ یہ وقت سونے کا ہے یا گورنمنٹ کو گالی دینے کا۔ مرشد نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے سے ایک خوانچہ والا گزر رہا تھا۔ اس سے دہی بڑے کی خیریت پوچھی۔ کون سا اسٹیشن ہے۔ بڑی چہل پہل ہے کوئی بڑا اسٹیشن ہوگا۔ اس نے کہا کان پور ہے۔

فرمایا، یہیں وہ کان پور والی مسجد ہے۔ میں نے پوچھا، یہ خطرہ آپ کو کیسے گزرا۔ فرمایا، پتہ نہیں پلیٹ فارم سے نمازیوں کو دیکھ کر خیال آیا۔ میں نے کہا، مرشد، کھانے اور سونے دونوں سے نفرت! ذرا یہ تو بتایئے اس وقت پلیٹ فارم پر نماز باجماعت ادا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

کہنے لگے، نمازی اور آپ دونوں نیک لوگ ہیں۔ نمازیوں کا تو یہ خیال ہے کہ جب تک نماز پڑھتے جائیں عقل کو کام میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو یہ مغالطہ ہے کہ جب تک عقل ہے نماز پڑھنا چہ ضرور۔ آخر امراس شخص کے پیچھے ڈنڈا لیے کیوں پھریں جو ہمارے آپ کے خیالات سے متفق نہ ہوں۔ ہر شخص جداگانہ طبیعت، جداگانہ مذاق اور جداگانہ مقاصد رکھتا ہے۔ آپ کا شمار نہ تو ائمۂ معصومین میں سے ہے اور نہ حکومت برطانیہ سے کہ غلطی کا ارتکاب ممکن نہیں۔ بھلا مانس وہ ہے جو حتی الوسع لوگوں سے ہم آہنگ رہ سکے، زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے بہرہ مند ہوں اور کم سے کم لوگوں سے وہ خود نفع اُٹھائے ہو، مسلمان ہونے کا مفہوم یہ بھی ہے۔ میں نے کہا، یہ باتیں تو غیر متعلق ہیں مجھے تو یہ بتایئے کہ اس وقت پلیٹ فارم پر نماز باجماعت کی کیا ضرورت تھی۔ آپ نے ایسے بزرگوں کو بھی دیکھا ہوگا جو اس تیور اور تجبر کے ساتھ آمادۂ نماز ہوتے ہیں جیسے وہ سارے مسلمان جوان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں گے دوزخی ہیں۔

خبط اور خطابت کا جو دورہ مجھ پر پڑا تھا اس کو جاری رکھتے ہوئے عرض کیا کہ مرشد، یہ کچھ نماز پر ہی موقوف نہیں ہے۔ بعض اصحاب روزہ بھی اسی ذہنیت کے ساتھ رکھتے ہیں ان کے روزہ رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ کسی شریف آدمی سے ملنے کے لائق نہیں رہ جانے اور دوسرا شریف آدمی ان سے ملنا گوارا نہ کرے گا۔ مثلاً آپ شکایت کریں کہ ملنے گیا معلوم ہوا کہ آپ آرام فرما رہے ہیں۔ فرمائیں گے کیا کروں روزہ ہے آپ کہیں گے فلاں کام کا وعدہ کیا تھا۔ اب تک پورا نہیں کیا۔ فرمائیں گے روزہ ہے۔ آپ نے خط کیوں نہیں بنوایا، جواب ملے گا روزہ ہے اور کپڑے کیوں میلے ہیں، روزہ ہے ہنستے کیوں نہیں روزہ ہے۔ انتقال فرمانے میں کیا قباحت ہے، تم جہنمی ہو!

مرشد نے فرمایا۔ روزے کا ذکر ہوتا رہے کا کچھ اس کا بھی خیال ہے کہ اس کے ذکر و شغل سے معدہ پر کیا اثر پڑتا ہے۔ کھانے پینے کا کچھ بندوبست کیجیے۔ اس کے بعد روزے پر زیادہ یکسوئی اور آسودگی سے گفتگو کی جائے گی۔ کھانا نکالا گیا۔ مرشد نے پہلا لقمہ فرو کیا اور پانی کا ایک پورا گلاس اس کے تعاقب میں روانہ کیا پھر فرمایا۔

آج کل فرائض مذہبیہ کا ادا کرنا لوگوں نے خدا پر احسان کرنے اور اس کے بندوں سے ناواجب نفع کمانے کا وسیلہ سمجھ لیا ہے۔ مثلاً روزے اس لیے نہیں رکھتے کہ شعائر اسلام میں سے ہے اور اس قسم کی پابندی نفس کو بے راہ روی سے روکتی ہے اور اس کا اثر انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر اچھا پڑتا ہے۔ بلکہ اس طرح نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے خدا کے وہ تمام اختیارات ان کے ہاتھ میں آجاتے ہیں۔ جن سے وہ اپنے بندوں کو جلاتا، مارتا یا عزّت و ذلت دیتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ خدا کی بخشنے کی طاقت اپنے لیے اور چھیننے کی دوسروں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے عبادت کو گناہ سے بچنے کا نہیں بلکہ گناہ کی باز پرس سے بچنے کا وسیلہ سمجھ رکھا ہے۔ مثلاً پانچ گناہ کیسے پانچ وقت کی نماز پڑھ دی حساب کتاب برابر ہو گیا۔

عرض کیا کیوں مرشد، سوراج مل گیا تو آپ ریل میں سفر کرنے والوں کی بدعنوانیوں کا کیا علاج کریں گے؟ فرمایا، سوراج کچھ آپ کی مسلم یونیورسٹی تو نہیں کہ قوم کی ساری ضرورتوں کا کفیل ہونے کا دعویٰ کرے۔ میں نے عرض کیا سوراج ملنے پر ہندوستانیوں کو سکنڈ کلاس میں سفر کرنا یا وہاں کے غسل خانے کے آداب برتنے نہ آئے تو حیف ہے آپ پر اور آپ کے سوراج پر۔ فرمایا، ہندوستان کو سکنڈ کلاس نہیں بلکہ تھرڈ کلاس میں ٹھکانے سے سفر کرنا یا وہاں کے غسل خانے کے طور طریقے ملحوظ رکھنا آجائیں تو سوراج کی ضرورت باقی نہ رہے۔ آخر میں یہ عرض کیا مرشد! بات دراصل یہ ہے کہ ان انگریزوں کی وجہ سے ہم ہندوستانیوں کے لیے قضائے حاجت کا مسئلہ اختیاری نہیں بلکہ اضطراری بن گیا ہے۔ کلکٹر صاحب کا سامنا ہوتے ہی ہم پر پہلا جو ردّ عمل ہوتا ہے وہ ہم کو غسل خانے کے آداب ہی نہیں غسل خانے کے موقع اور مصرف ہی سے یکسر بے نیاز کر دیتا ہے۔

پورب سے کاجل کا سا بادل اُٹھتا گھنتا جھومتا پھنکارتا بل کھاتا ہوا جیسے 'فیل مست بے زنجیر' یا جیسے انگریزوں کا کوئی ڈریڈ ناٹ کہیں پیغام صلح لے جا رہا ہے۔ شام ہونے لگی تھی پانی برسنے لگا۔ میں نے کہا، مرشد ہندوستان کی برسات سے بھی زیادہ پُر کیف منظر کہیں دیکھا ہے۔ کیسی گھٹا اُٹھی ہے کس چم خم سے بجلی چمکتی ہے، کیسی جاں فزا ہوا ہے کتنی اچھی بارش ہو رہی ہے۔ پر آپ تو بڑے جہانیانِ جہاں گشت ہیں۔ کچھ سنائیے، فرمایا۔

بن بادل بجلی کہاں چمکی........

مطبوعہ: 1۔ نگار، اکتوبر 1930

2۔ مشمولہ مضامین رشید، مکتبہ جامعہ دہلی 1941

3۔ ذاکر صاحب مکتبہ جامعہ، 1973، 1975

●●●

ذاکر صاحب

ذاکر صاحب کی آنکھ میں شدید تکلیف تھی۔ علاج کے لیے بمبئی جا رہے تھے۔ دہلی کے اسٹیشن پر خدا حافظ کہنے کے لیے میں بھی موجود تھا۔ گاڑی روانہ ہوئی تو دل بھر آیا۔ طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوئے، انسانی فطرت کو آڑے وقت میں تنکے کا سہارا ڈھونڈ لینے کا عجب ملکہ ہے۔ مجھے بھی آس پاس ہی سہارے مل گئے۔ میں نے خیال کیا بھوک لگی ہے، جوتا نیا بھی ہے اور تنگ بھی۔ دن بھر دلی کی خاک چھانتا پھرا ہوں۔ کسی نے خلاصۂ موجودات سمجھنا تو درکنار 'ہر مال چھے پیسے' سے بھی مخاطب نہ کیا۔ ممکن ہے یہی باتیں دل پر اثر انداز ہوئی ہوں۔ ساتھ ہی یہ خدشہ بھی پیدا ہوا کہ کہیں یہی تحت شعور میں پہنچ کر گل نہ کھلائیں۔ پاس کی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ پہلو میں ایک گنوار رنگروٹ اپنے پاؤں ہاتھوں کے حلقے میں لیے ہوئے اس طرح بے زار بیٹھا ہوا تھا جیسے سوچ رہا ہو کہ نہ لڑائی ختم ہوتی ہے نہ زمین داری۔ 'دلند یزی' قسم کے جوتے منہ کھولے ہوئے سامنے پڑے تھے۔ میں نے گنوار کی نظر بچا کر اس کے جوتوں پر توجہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ جوتے کو گنوار کے پاؤں سے جو صدمے پہنچے تھے وہ آسام اور برما کے روڑے، کانٹوں اور حشرات الارض سے نہ پہنچے تھے۔ ان کی ہمدردی میں، میں نے بھی اپنے پاؤں سے جوتے موزے علاحدہ کیے تو معلوم ہوا کہ ناخن گوشت سے جدا ہو گیا ہے، لیکن 'انگشت حنائی' کا دور دور

تک پتا نہیں۔ فیتے جوتے سے علاحدہ کرکے جیب میں رکھے، جوتے پھر سے پہنے اور علی گڑھ جانے والی گاڑی کی فکر میں روانہ ہوا۔ گاڑی تیار تھی، دو کیلے خریدے، چند دھکے کھائے، پلیٹ فارم پر داخل ہونے اور گاڑی پر سفر کرنے کے علاحدہ علاحدہ دو ٹکٹ تو پہلے سے تھے ہی، ان کے علاوہ لڑائی کے اعزاز میں داخل ہونے کے لیے لات مُکّے اور بہت سارے منترانہ قسم گالی گلوج مقرر کردیے گئے تھے۔ جن کے بغیر آپ نہ ڈبے میں داخل ہوسکتے ہیں، نہ اپنی نشست محفوظ رکھ سکتے تھے۔ گاڑی میں بیٹھ کر اونگھنے لگا اور ایسا معلوم ہوا جیسے محوری طاقتیں قیدیوں کو موت کے ڈبے میں نہیں بلکہ نزع کے ڈبے میں لیے جارہی ہیں۔ علی گڑھ کے اسٹیشن پر گاڑی دھچکے سے رُکی۔ سامنے یونیورسٹی پراکٹر کے نمائندے کھڑے تھے۔ فرمایا آج تانگے نہیں مل رہے ہیں۔ میں ان سے بغل گیر ہوگیا اور روندے جانے اور رو پڑنے سے بچ گیا۔

O

دوسرے دن ایک عزیز دوست کو ذاکر صاحب کی دلّی سے روانگی اور اپنے متاثر ہونے کا حال لکھا اور ضمناً یہ بھی لکھ گیا کہ یہ تو ذاکر صاحب کا بمبئی کا سفر تھا، جب دل کا یہ حال ہوا۔ خدانخواستہ آخری مفارقت پیش آئی اور میں موجود ہوا تو کیا عالم ہوگا۔ دوست نے اس خط کا جواب خلافِ معمول جلد دیا اور لکھا۔

''رشید صاحب آپ بالکل نہ گھبرائیں۔ ایک امید یہ بھی تو ہے جس پر کہا جاتا ہے دنیا قائم ہے، کہ آپ ذاکر صاحب سے پہلے رحلت فرمائیں اور اس طور پر آپ کو وہ دن دیکھنا نہ نصیب ہو جس کا آپ کو اندیشہ ہے۔''

میں دوست کی اس برجستہ گوئی پر جھوم گیا، لیکن دل میں ٹھان لی کہ آئندہ تاحیات ان دوست سے اس قسم کی ازغیبی مسائل پر بالکل گفتگو نہ کی جائے۔

O

گذشتہ اکتوبر میں حکومت ہند کی طرف سے کچھ ماہرین تعلیم ایک تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جانے والے تھے ان میں ذاکر صاحب تھے۔ روانگی سے کچھ پہلے علی گڑھ تشریف لائے۔ ایک دن کھا پی کر پاؤں پھیلا کر، نیم غنودگی کی حالت میں قوم کے بخت بیدار پر

گفتگو شروع ہونے والی تھی کہ مونگ پھلی والے نے آواز دی، مرشد نے خواب آلود لہجے میں جواب دیا۔

مزہ سردی کا۔

''میں نے کہا!'' یہ کیا؟'' فرمایا'' مونگ پھلی ہندوستان کا بادام ہے۔''

میں نے کہا'' پھر؟''

فرمایا'' پھر کیا میں نے تو 'جنرل نالج' (معلومات عامہ) کی بنا پر ایک بات بتا دی۔''

مونگ پھلی والا بلایا گیا تو بڈھا خوانچہ والا ہم دونوں کا قدیم مہربان نکلا۔ 21-1920 میں میں اور ذاکر صاحب، 'صاحب باغ' (ایم۔اے۔او کالج) میں رہتے تھے اور یہ کیلے، سیب، سنترے بیچنے لایا کرتا تھا۔ ذاکر صاحب شکوہ کرتے تو کہتا میاں گلے ہوئے نہیں ہیں مربّے کے سیب ہیں۔ صرف آپ کے لیے بچا لیا کرتا ہوں۔

مرشد نے کہا۔'' کیوں بھئی وہ مربّے والے سیب بھی بیچتے ہو یا نہیں۔''

بڈھا ہنس پڑا، پھر ایک آہ سرد کھینچ کر بولا۔'' میاں کیا پوچھتے ہو۔ کالج بدل گیا اب ویسے لڑکے نہ آئیں گے۔''

ذاکر صاحب نے پوچھا۔ کیا بات ہوئی؟''

بڈھے نے کہا۔'' میاں نفع نقصان کا ذکر کیا یہ تو روزگار کے ساتھ لگا ہی رہتا ہے، لیکن لڑکوں میں اب وہ بات نہ رہی۔''

میں نے پوچھا۔'' آخر وہ کون سی بات تھی''؟ بڈھا بڑا گھٹا ہوا تھا، کھلا نہیں، ٹال کر بولا۔'' بس میاں وہ بات نہیں رہی!'' میں نے اور چھیڑا تو جھنجھلا گیا۔ بولا'' پہلے کسی کی مجال تھی کہ کالج میں مونگ پھلی بیچنے لاتا۔''

میں اور ذاکر صاحب دونوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

بڈھا سمجھا ہم دونوں دام کی طرف سے فکر مند ہیں۔ بولا،'' میاں، دام کی فکر مت کیجیے۔ میں نے ذاکر صاحب سے بڑے پیسے کمائے ہیں اب ان سے دام نہ لوں گا۔ اللہ ان کو خوش رکھے'' اور چلا گیا!

اسی زمانۂ قیام میں مکان کے بیرونی احاطے میں ہم دونوں ٹہل رہے تھے ایک طرف آلوؤں کی کیاری تھی، سامنے بھینس بندھی ہوئی تھی، میں آلو کے مزے پر اور ذاکر صاحب بھینس کے اطوار پر گفتگو کر رہے تھے۔

میں نے کہا۔" ذاکر صاحب آپ لندن جا رہے ہیں ایک چیز میرے لیے لیتے آیئے گا۔" بولے،" وہ تو ضرور لاؤں گا۔"

میں نے کہا۔" کیا؟"

فرمایا۔" گلاب"

میں پھڑک گیا اور بولا۔" مرشد آپ کی ان ہی باتوں سے تو میں اب تک .....کامبر نہیں بن سکا ہوں۔"

فرمایا۔" اس میں کیا شک ہے۔ میں گلاب لایا اور آپ نے انڈین نیشنل آرمی میں بھرتی ہونے کی عرضی دی۔"

میں نے کہا۔" مرشد دیکھیے انڈین نیشنل آرمی کا مقدمہ زیر سماعت ہے دشمنوں کے کان بہرے، معلوم نہیں کیا افتاد پڑے پھر آپ ہی بھاگے بھاگے پھریں گے۔"

مرشد نے کہا۔" یہ کیوں؟"

میں نے کہا۔" بات یہ ہے کہ میں پکڑا جاؤں گا تو آپ اسے قومی حادثہ سے تعبیر کریں گے میری تصویر چھپے گی آپ کا پیغام شائع ہوگا۔"

بولے۔" یہ کچھ نہ ہوگا۔"

میں نے کہا۔" ہوگا، کیوں نہیں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ تصویر کے نیچے آپ کا نام ہو اور پیغام کے نیچے میرا۔ دیکھیے میرے گلاب نہ بھولیے گا۔"

o

ذاکر صاحب لندن سے واپس آئے اور گلاب بھی لائے جس نے سنا تعجب کیا لیکن کوئی طے نہ کر سکا کہ اس میں بے تکا کون تھا فرمائش کرنے والا یا فرمائش لانے والا۔ ذاکر صاحب سے ان کے سارے دوستوں نے بڑی تاکید کر دی تھی کہ وہ لندن کے مشہور ماہرین فن سے اپنی

صحت کے بارے میں ضرور مشورہ کرتے آئیں جس کی ان کو ضرورت تھی۔ مجھے خاص طور پر اس کی خوشی تھی کہ اس کام کے سلسلے میں ذاکر صاحب کو اپنی صحت درست کرنے کا موقع مل جائے گا، اور چند ہفتے کے لیے ان کو یہاں کی بے پایاں مناقشوں اور مصروفیتوں سے نجات مل جائے گی۔

لیکن ہوا یہ کہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہ کر سکے۔ صرف گلاب لائے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس کمیٹی میں ذاکر صاحب ہوتے ہیں اس کے سارے ممبروں سے زیادہ وہ کام خود کرتے ہیں اور بیش تر اراکین یا تو سفر خرچ وصول کرتے ہیں یا انٹرویو دیتے ہیں یا اسٹیشنری پر سابق ممبر فلاں کمیٹی چھپواتے ہیں۔ لندن کے واپسی کے بعد سے اب تک میں ذاکر صاحب سے مل نہ سکا۔ لیکن مجھے اندازہ ہے کہ وہ کمیٹی کانفرنس، دید و باز دید کے کاموں میں کیسے پھنسے رہے ہوں گے اور گلابوں کے حاصل کرنے اور لانے کی داستان کیا ہے۔ ان کے لانے میں کتنے اور کیسے کیسے مہمل یا دلچسپ مراحل پیش آئے ہوں گے اور ذاکر صاحب نے اپنی ذکاوت، معصومیت اور مستقل مزاجی سے کس کس کو کس طرح زیر یا رام کیا ہوگا۔

یہی فرمائش میں نے کسی اور سے کی ہوتی تو وہ مجھے خوش کرنے یا اپنے ذوق کی میرے ذوق پر فضیلت جتانے کے لیے مجھ سے مزاح فرماتے یا ایک لمحہ کے لیے چہرہ ایسا بنا لیتے جیسے اس پر 'خدا ملک معظم کو سلامت رکھے' کا ترانہ بج رہا ہے یا پھر فرماتے۔ ''دیکھیے اللہ تعالیٰ ہندوستان کی آبرو رکھ لے۔ اس مہم پر جانا پل صراط پر چلنے سے کم نہیں۔'' اس کے بعد وعدہ کر لیتے کہ ضرور ضرور پوری کریں گے۔ لیکن واپس آنے پر ملاقات ہوتی تو جھپٹ کر بغل گیر ہو جاتے گردن یا آس پاس کا بوسہ لے کر رونی صورت بنا کر فرماتے۔ ''رشید صاحب کیا بتاؤں لندن پہنچتے ہی بیمار ہو گیا۔ ہارلی اسٹریٹ کا فلاں مشہور ماہر امراض روح قبض کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ فلاں ارلی اور ڈیوک اور انجمن دشت قپچاق کے سکریٹری تجہیز و تکفین کے لیے آ گئے تھے، یا کاموں میں ایسا پھنسا کہ مرنے کی مہلت نہ ملی۔ آج اس وزیر کا مہمان، کل اس خواجہ سرا کا میزبان، فلاں نامہ نگار کو انٹرویو دیا، فلاں ایڈیٹر کے ٹیلی فون آئے لندن کی تمام لڑکیاں طرح طرح کے پھول میرے سینے پر نصب کرنے کے لیے کمرے کی کھڑکی کے نیچے قطار باندھے تمام رات، 'دست فشاں و پائے کوباں' ادھر میں ہندوستان کے غم میں ترساں و لرزاں، یہ احباب کی

دعاؤں کا اثر تھا کہ کامیاب وکامران واپس ہوا۔گلاب کے لیے میں نے وزیر ہند کو ٹیلی فون کیا۔ انھوں نے واشنگٹن کو، واشنگٹن نے ماسکو، رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ جب تک کامریڈ اسٹالن تعطیل سے فارغ ہوکر ماسکو نہ واپس آجائیں، ایٹم بمب اور گلاب کے مسئلہ پر گفتگو معرضِ التوا میں رہے گی۔'' پھر بڑے چاؤ سے فرماتے۔''رشید صاحب آپ کو آخر لندن سے گلاب منگانے کا کیا خبط سمایا، میرے باغ میں صدہا گلاب ہیں جن کا میری بیوی بہترین گلقند تیار کرتی ہیں آپ کو جتنے درختوں کی ضرورت ہو منگا لیجیے۔'' اب ان سے کون کہے کہ مجھے نہ گلقند کے گلاب چاہئیں نہ گلقندی بیوی۔

O

گلاب لانے کا واقعہ ذاکر صاحب کی سیرت وشخصیت کو پورے طور پر منقح ومنور کرتا ہے۔گلاب پانے کی جو خوشی مجھے ہوئی اس کا اظہار کچھ ایسا ضروری نہیں۔البتہ ذاکر صاحب کا ان گلابوں کا لانا، بجائے خود ایک مطالعہ ہے۔دل کش بھی اور اہم بھی۔اس کی دل کشی اور اہمیت صرف ایسے لوگوں کی سمجھ میں آسکتی ہے جو زندگی کے نعائم وفضائل کے قائل ہیں نہ کہ اس کے ذمائم ورذائل کے، میں دوست کے فضائل پر مرتا ہوں نہ کہ اس کے اقتدار واختیار پر۔اس لیے کہ اثر واقتدار حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع ہیں جن کو سخت مذموم طریقوں سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔یا جن کے حصول میں محض اتفاق کو دخل ہوسکتا ہے، لیکن فضائل نفس وہ نعمت ہے جو صرف خدا کے برگزیدہ بندوں کو ملتی ہے۔ذاکر صاحب نے کبھی اثر واقتدار کے حصول کی کوشش نہ کی۔اثر واقتدار البتہ برابر اس کی کوشش کرتے رہے (مجھے ایک ایک کا علم ہے) کہ ذاکر صاحب انھیں قبول کرلیں، لیکن انھوں نے کبھی ان کی طرف توجہ نہ کی۔میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس میں ذاکر صاحب کو اپنے نفس کو زیر کرنے میں کوئی زحمت نہ اُٹھانی پڑی ہوگی۔جس طرح ریڈیو سیٹ میں صرف مقررہ مخصوص لہریں بار پاتی ہیں اور دوسری تمام لہریں اس سیٹ کے لیے بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ٹھیک اسی طرح اچھے اور برگزیدہ انسان کے دل کے تاروں کو وہی خیالات وجذبات مرتعش کرسکتے ہیں جو خود اچھے اور برگزیدہ ہوں۔یہی مثال ان لوگوں پر صادق آتی ہے جن کی فطرت میں ازل سے ٹیڑھ چلی آتی ہے۔وہ صرف اس وقت اپنے زندہ ہونے کو

محسوس کرتے ہیں جب ان پر شیطانی پرتو پڑ رہا ہو۔ میں ایسے لوگوں سے واقف ہوں جو انسانیت اور انصاف سے متاثر ہو کر بھی کام کریں گے تو اس میں کہیں کہیں کوئی کھوٹ یا نجاست ضرور ملا دیں گے۔ یہاں میں قطعاً مبالغہ سے کام نہیں لے رہا ہوں۔

عرصہ ہوا ایک بار رنگون جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک دُکان پر کھجور خریدنے گیا، کھجوریں ناقص تھیں۔ دکان دار نے کہا کہ ٹھہریے اندر سے لاتا ہوں وہاں سے نہایت عمدہ قسم کی کھجوریں لا کر دیں۔ میں نے تعجب میں آ کر پوچھا۔ ''بہتر مال فروخت کرنے کے لیے کھلی دُکان میں کیوں نہیں رکھتے۔'' اس نے جواب دیا کہ یہاں کے بیش تر خریدار تازہ عمدہ کھجوریں نہیں خریدتے، یہ اس وقت خریدتے ہیں جب ان میں کیڑے پڑنے لگتے ہیں! اس سلسلے میں ضمناً ایک اور لطیفہ سن لیجیے۔ کلکتہ کی دکان پر ایک چیز کے دام پوچھے۔ دکان دار نے جو قیمت بتائی وہ ٹھیک ہو یا نہ ہو، میرے بوتے کی نہ تھی۔ میں نے مزید گفتگو کی تو اس نے ہنس کر کہا۔ ''تو پھر آپ اس کے منتظر ہیں کہ اسے اس وقت خریدیں جب اس کے دام بڑھ جائیں۔'' اس کے سوال سے میں خفیف تو ہوا لیکن یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس وقت میں خریدار کی حیثیت سے نہیں، چور کی حیثیت سے حاضر ہوں!''

ذاکر صاحب کے جاننے والے جانتے ہیں کہ کوئی بڑا آدمی ان سے یہ فرمائش کرتا کہ موقع اچھا ہے لندن میں میرے لیے کوئی اراضی خرید لینا یا ملکہ معظّم کی خدمت میں میرا یہ خط پہنچا دینا تو ذاکر صاحب اس خط کو گم نہ کرتے تو واپس لا کر ضرور دے دیتے اور لندن میں اس فلاکت اور تباہی کے زمانے میں کسی کا گھر خریدنے کے بجائے ایک آدھ دن اس کے گھر کی مرمّت کے سلسلے میں مزدوروں کے ساتھ کام کرتے۔ لیکن اگر ان کا کوئی معمولی دوست یہ فرمائش کر دیتا کہ میرے لیے ایک مرغی لیتے آیئے گا تو وہ یقیناً مرغی بغل میں دابے ہوئے قصر بکنگھم سے گزرتے۔ اکابر پارلیمنٹ اور 'والیانِ شوخ وشنگ' سے بے جھجک ہنستے بولتے خدا حافظ کہتے ہوئے ریل یا ہوائی جہاز کے اسٹیشن پر پہنچ جاتے۔

ذاکر صاحب ان لوگوں میں ہیں جو اس کے قائل ہیں کہ بڑائی ایٹم بمب کی اجارہ داری میں اتنی نہیں ہے جتنی مرغی سے شرمندہ نہ ہونے میں ہے۔

گلاب کالانا بظاہر ایک معمولی سی بات ہے لیکن اس کی تہہ میں ذاکر صاحب کی بے بہا سیرت کا موتی تارے کی طرح دمکتا نظر آتا ہے۔ ایک دوست کی معمولی سی فرمائش کر دینے کے لیے بڑی سے بڑی دشواریاں اُٹھانے کا ایک ایک مخصوص سرور ہوتا ہے جس سے آشنا ہونا ہر ایک کا مقدر نہیں۔ مجھے گلاب پانے کی بڑی خوشی ہوئی کہ یہ فرمائش کسی اور نے پوری کی ہوتی تو بھی خوشی ہوتی، لیکن ذاکر صاحب کا بیچ میں ہونا میری خوشی کا خاص طور پر موجب ہوا۔ اس کے وجوہ ہیں، اوّل تو یہ کہ میں زندگی کی اچھی اور بڑی قدروں کی تعبیر افسانے کے کرداروں سے نہیں اپنے احباب بالخصوص ذاکر صاحب کے اطوار سے کرتا ہوں اور جب اور جہاں کہیں اس کی تصدیق ہوتی ہے تو میں اپنے آپ کو داد دیتا ہوں کہ میں بڑی بات اور بڑے آدمی کو پہچانتا ہوں اور اس کی قدر کرتا ہوں۔ اس لیے مجھے طفیلیوں، چوروں یا غاصبوں کی طرح نہیں بلکہ ایک انسان کی حیثیت سے سوسائٹی میں جگہ پانے کا حق حاصل ہے۔ دوسرے یہ کہ میں اس پر عقیدہ رکھتا ہوں کہ دنیا میں کوئی بڑے سے بڑا واقعہ ایسا نہیں ہوا جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں ہر شخص کے لیے رونما نہ ہوتا ہو۔ یعنی ہر شخص ہر لحہ تاریخی ہیروں کی آزمائش سے گزرتا رہتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے میرے دل میں یہ بات بیٹھ سی گئی ہے کہ اگر خدا ویسا ہی ہے جیسا میں نے سمجھا ہے تو حشر کے دن ہم میں سے بہتوں کو یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوگی کہ ہم نے کس کو کہاں پایا اور بڑی سے بڑی منزلت والوں کی صف میں جن کے کارناموں سے دنیا کا چپہ چپہ گونج رہا ہے، ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن سے شاید ان کے محلّے والے بھی پورے طور پر واقف نہ تھے۔

o

ایک موقع پر مجھے ذاکر صاحب کے اعزاز میں تقریر کرنی پڑی۔ میں نے تھوڑی دیر تک یہ سوچا کہ اس پچیس تیس سال میں ذاکر صاحب کی کون سی بات مجھے سب سے زیادہ ممتاز نظر آئی۔ فی الفور میرے ذہن میں آیا کہ ذاکر صاحب نے طالب علمی کے زمانے سے لے کر آج تک کوئی ایسا کام نہ کیا جو دوسرے درجہ کا ہو۔ تیسرے درجہ کا تو سوال ہی نہیں!

ذاکر صاحب علی گڑھ کے طالب علم تھے، نان کوآپریشن میں وہاں سے علاحدہ ہوئے اور جرمنی چلے گئے۔ وہاں سے آکر جامعہ کا کام سنبھالا اور کس کس طرح اس کو سنوارا اس زمانے

میں ان پر اور ان کے ساتھیوں پر کیا گزری، اس کی داستان بڑی طویل ہے۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ کئی سال ہوئے دولت آصفیہ سے جامعہ کو گراں قدر مالی امداد ملی۔ ذاکر صاحب سے علی گڑھ میں ملاقات ہوئی، میں نے مبارک باد دی تو بڑے خوش ہوئے اور کہنے لگے۔ ''رشید صاحب آج گیارہ سال بعد جامعہ کے اسٹاف کو پوری تنخواہ دی جاسکی!'' میں متحیر ہوگیا، میں نے کہا۔ ''ذاکر صاحب یہ واقعہ جامعہ کی تاریخ میں نہیں ہماری تمام قومی تحریکوں میں یاد رکھا جائے گا۔ جہاں ایسے کام کرنے والے ہوں وہاں میرا گزر تو نہیں ہوسکتا۔ لیکن کسی دن ریڈیو پر تقریر کرنے دہلی آیا تو دو رکعت نفل پڑھنے جامعہ نگر ضرور جاؤں گا۔''

نان کوآپریشن کی زد میں علی گڑھ ہی کا ایک حصہ ٹوٹ کر جامعہ بنا۔ 'چشم زلیخا' کو 'نور دیدۂ یعقوب' ہی روشن کیے ہوئے ہے۔ اس زمانے کے بیش تر بہترین طالب علم بھی علی گڑھ سے نکل کر جامعہ میں شامل ہوگئے۔ لیکن جامعہ کو موجودہ شکل، حیثیت اور شہرت دینے کا سہرا تمام تر ذاکر صاحب اور ان کے بے لوث رفقا کے سر ہے۔ علی گڑھ کے بعض لوگوں کی نظر میں جامعہ کا قیام ایک حریف ادارہ کی حیثیت سے کچھ دنوں کھٹکا۔ یہ بدگمانی رفتہ رفتہ دور ہوگئی، لیکن جیسا کہ ہمارے ذہن واخلاق کا مذموم خاصہ ہے۔ ہم ہر تحریک کو اکثر اپنے ذاتی محدود مشتبہ اغراض و مقاصد کی روشنی میں دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ ذاکر صاحب اور ان کے رفقا کی طرف سے علی گڑھ کا ایک مخصوص طبقہ بدگمان رہا اور اب بھی ہے۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں اس بدگمانی کے باوجود جو عناد کی حد تک پہنچی، ذاکر صاحب علی گڑھ کے ہر انتظام میں شروع سے آخر تک شریک رہے۔ محض ضابطہ کی رُو سے نہیں، بلکہ انھوں نے انتہائی خلوص تن دہی، قابلیت اور ہمدردی کے ساتھ یونیورسٹی کے نازک سے نازک اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملہ میں حصہ لیا، اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ انھوں نے نادانستہ طور پر بھی کبھی کوئی ایسا کام نہ کیا جو علی گڑھ کے حقیقی مسائل کے ذرّہ برابر بھی منافی ہوتا ان کا بدترین دشمن بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ذاکر صاحب نے علی گڑھ کی انتظامی درو بست سے گہرا اور اہم تعلق رکھتے ہوئے بھی کسی معاملہ میں اپنے خیال، الفاظ یا عمل سے کوئی بات ایسی کی ہو جس سے علی گڑھ کے نام پر حرف آتا ہو۔ یہی نہیں بلکہ جماعتِ منتظمہ میں جب تک وہ شریک رہے

دوست اور دشمن دونوں کو اطمینان رہا کہ کوئی ایسی بات نہ ہوگی جو انصاف یا ہمدردی سے بعید ہو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ جس معاملہ میں ذاکر صاحب کو قومی پیمانہ پر سب سے زیادہ رُسوا کیا گیا اسی معاملے میں رسوا کرنے والے ذاتی اور خفیہ طور پر ذاکر صاحب کی رہنمائی اور ہمدردی کے متجی دیکھے اور پائے گئے!

جرمنی سے واپس آنے کے بعد سے آج سے چند سال پیش تر تک ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کورٹ، اکزی کیٹو کونسل، اکیڈمک کونسل اور شعبۂ اقتصادیات کے ممبر رہے۔ ان تمام اداروں میں جب کبھی کوئی کمیٹی کسی مسئلے سے متعلق بنائی گئی، ذاکر صاحب کا نام ممبری کے لیے سب سے پہلے پیش کیا جاتا اور بے چوں و چرا بڑی خوش دلی اور اعتماد کے ساتھ قبول کر لیا جاتا، سالہا سال وہ مسلم یونیورسٹی کے انتظامی معاملات میں شریک کار رہے۔ بیرونی اشخاص کے ممبر ہونے کی جہاں کہیں ضرورت ہوئی ذاکر صاحب ضرور شریک کیے گئے، اور ایک متنفس بھی ایسا نہیں ہے جس نے ذاکر صاحب کی معاملہ فہمی، خلوص اور قطعاً بے لوث ہونے کا اعتراف نہ کیا ہو۔

تمام واقعات دُہرانے کا یہ موقع نہیں ہے صرف دو ایک کا تذکرہ کر دینا کافی ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں ایک تحریک یہ پیش ہوئی کہ جماعت اساتذہ میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کے عقائد مذہبی قابل گرفت ہیں۔ اس تحریک میں جو پیچیدگی اور نزاکت تھی اس کا اثر اسٹاف کے طبائع پر بالعموم جو کچھ پڑ سکتا تھا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اکزی کیٹو کونسل میں یہ مسئلہ پیش ہوا۔ سر سلیمان مرحوم وائس چانسلر تھے۔ کونسل میں جو تقریریں ہوئیں، ان میں جوش، قابلیت، قانون دانی، بے زاری، مایوسی، غرض کہ ہر طرح کے جذبات کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ مسئلہ کی نوعیت یہ تھی کہ ہر مسلمان ممبر اسٹاف سے ایک تحریر لی جائے کہ وہ مذہبی عقائد اور اسلامی روایات کا احترام کرے گا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس تحریر کا مضمون کیا ہو جب بحث نے طوالت اختیار کی تو سر سلیمان نے ذاکر صاحب سے فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے تو ساری بحث سن لی اب کوئی فارمولا ایسا وضع کیجیے جس پر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اتفاق ہو جائے۔ ذاکر صاحب نے فی الفور ایک مختصر سا مسودہ تیار کر کے مرحوم کی خدمت میں پیش کر کے حاضرین کو سنا دیا۔ بغیر کسی مزید

گفتگو کے ہر شخص نے اسے قبول کرلیا اس میں وہ لوگ بھی تھے جو اس تحریک کی موافقت میں سر بکف تھے اور وہ بھی تھے جو اس کی مخالفت میں شمشیر برہنہ۔ یہ مسئلہ اس تحریر سے ایسا ہموار ہوا کہ پھر کبھی اس کی کوئی شق معرضِ بحث میں نہ آئی۔

اسٹاف اور جماعت منتظمہ میں سر سلیمان مرحوم ہی کے زمانے میں ایک مسئلہ یہ پیش ہوا کہ یونیورسٹی کی تعطیلیں متعین کرنے کا اختیار اکیڈمک کونسل کو تھا نہ کہ اگزی کیٹو کو۔ اس بحث نے بھی ناخوش گوار فضا پیدا کی اور فریقین میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو دونوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے پر آمادہ ہوتا یا اس کی آمادگی نتیجہ خیز ثابت ہوتی۔ سر سلیمان مرحوم نے ذاکر صاحب سے فرمائش کی کہ وہ اسٹاف سے گفتگو کر کے مفاہمت کی کوئی صورت نکالیں۔ چنانچہ ذاکر صاحب نے اراکین اسٹاف سے گفتگو کر کے اس گتھی کو سلجھایا۔ ایک صاحب جو ذاکر صاحب اور جامعہ دونوں کو ہمیشہ شبہ اور حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے، اور قومی تحریکوں اور قومی سرداروں کو اسی نظر سے دیکھتے تھے، جس نظر سے یہ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں دیکھے جاتے تھے۔ ذاکر صاحب کی گفتگوے مصالحت سن کر ذاکر صاحب کے قائل ہو گئے اور کہنے لگے، ''میں نہیں سمجھتا تھا کہ ذاکر صاحب کا دماغ اتنا سلجھا ہوا ہے اور ذہن اس درجہ رسا۔''

بنیادی تعلیمی اسکیم کی رپورٹ ذاکر صاحب نے علی گڑھ میں میرے ہی مکان پر ایک کمرے میں بیٹھ کر شاید ایک ہفتہ کے اندر مرتب کر ڈالی۔ کمرہ بھی جو بہ یک وقت سونے بیٹھنے، کھانے پینے، لکھنے پڑھنے اور دُند مچانے کا کام دیتا تھا۔ ہر طرح کے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، کچھ دیر تک تعلیمی مسائل پر بحث رہی اسی سلسلہ میں کچھ دوست ملنے آ گئے تو ان سے خوش گپی ہونے لگی، کتابوں، رپورٹوں، فائل وغیرہ کا انبار ہے کاغذات پھیلے ہوئے ہیں۔ ٹریننگ کالج کے لوگ آ گئے تو ان سے تعلیمی مسائل پر بحث چھڑ گئی۔ کوئی خوانچہ والا آ گیا تو جو کچھ اس کے پاس رہا اسی سے شغل شروع کر دیا گیا۔ ڈاکٹر آ گئے تو امراض و علاج کے لطائف چھڑ گئے، شعر و شاعری کا شائق آ گیا تو شعر خوانی کی مجلس گرم ہو گئی۔ کوئی اچھا طالب علم آ نکلا تو اس کے مضمون پر باتیں ہونے لگیں، غرض جو آیا اسی کے مذاق کے مطابق گپ ہونے لگی۔ اس تمام بحث و مباحثہ میں ذاکر صاحب اسی خلوص و خوبی سے حصہ لیتے جیسے تمام عمر اسی شغل میں زندگی بسر ہوئی ہے جو آتا

بہت کچھ سیکھ جاتا اور ایسا خوش ہو جاتا جیسے اس نے اس دن کوئی بڑا کام کیا تھا۔ ذرا مہلت ملتی تو پھر رپورٹ کی ترتیب شروع ہو جاتی۔ وہ ہر شخص کے سامنے اپنے خیالات اور نتائج پیش کرتے۔ اس کا مشورہ طلب کرتے، اپنی سمجھاتے اس کی سنتے اور پھر آخری رائے قائم کرتے۔

ایک دن میں نے تنگ آ کر کہا۔ ''مرشد یہ کہاں کا کھڑاگ پھیلایا جب دیکھیے بچوں کی عمر، بچوں کے مشاغل، گلی ڈنڈے اور سوت کپاس کی بحث چھڑی ہے۔ تمام دن خدائی خواروں یا حق بخشوائے ہوئے لوگوں کا مجمع رہتا ہے۔'' فرمایا، سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ آج اتفاق سے پنسل بنانے کے لیے کسی کے پاس چاقو نہ ملا ورنہ بقیہ مراحل بھی طے ہو جاتے۔ اب کل کوئی سبیل ایسی نکالیے کہ مجھے چند گھنٹے یکسوئی کے مل جائیں، سارا خاکہ ذہن میں ہے رپورٹ مکمل ہو جائے گی۔

دوسرے دن میں نے اپنے پرانے مکان کے بالا خانے پر ذاکر صاحب کو مقفل کر دیا۔ مقفل اس لیے نہیں کیا کہ کوئی ملاقاتی بار نہ پائے بلکہ اس کا خطرہ تھا کہ خود مرشد نہ نکل جائیں۔ ہوا وہی جس کا خطرہ تھا۔ صبح بالا خانے پر مقفل ہوئے دو گھنٹے گزرے ہوں گے ایک صاحب ملنے آئے۔

نوکر نے کہا۔

''ذاکر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔''

انھوں نے نقد و جرح شروع کی۔

مرشد کے کان تک آواز پہنچی۔ روشن دان کچھ اونچا نہ تھا۔ اسٹول رکھ کر غرفہ سے بولے۔ ''ارے میں یہاں مقفل ہوں۔ کنجی رشید صاحب کے پاس ہے، لیکن کوئی مضائقہ نہیں، آپ اس بات کا پتا لگا لائے۔''

انھوں نے کہا۔ ''ہاں، رپورٹ نقل کرلایا ہوں۔''

فرمایا۔ ''سنائیے۔''

انھوں نے سنانا شروع کیا۔ میں یونیورسٹی سے آیا تو رومیو جولیٹ کا یہ ڈراما نظر آیا۔

میں نے کہا۔ ''مرشد یہ کیا ہے؟''

فرمایا۔ ''ذرا ٹھہریے گا بس ایک منٹ۔''

افسانہ ختم ہوگیا۔

میں نے بالا خانہ پر پہنچ کر قفل کھولا تو مرشد سارا کام کیے ہوئے چاروں شانے چت کچھ گنگنا رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو لیٹے ہی لیٹے ایک زقند بھری اور سرو قد کھڑے ہوگئے فرمایا۔

''ذرا پانی پلوایئے، کام ختم ہوگیا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ آپ کیا سن رہے تھے۔''

کہنے لگے۔ ''فلاں رپورٹ کا حوالہ دینا تھا، ایک جگہ شبہ ہوتا تھا، اس لیے ان صاحب سے کہا تھا کہ اصل رپورٹ دیکھ آئیں۔ انھوں نے جو سنایا تو اطمینان ہوگیا کہ جو یاد تھا وہ ٹھیک تھا۔''

میں نے کہا۔ ''اب تو جب تک آپ کا قیام ہے کوئی زق زق نہ ہوگی؟''

فرمایا۔ ''ہرگز نہیں'' میں نے کہا ''اللہ کا شکر ہے، آج ڈاکٹر اصغر کے ہاں چائے پی جائے تو کیسی رہے گی؟'' کہا۔ ''ضرور، ان سے بلّی کا بچہ بھی لینا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بلّی نے تو بچہ نہیں دیا ہے، کتّے نے البتہ دیا ہے۔'' کہنے لگے، ''اسی کا سہی! سعیدہ (ذاکر صاحب کی بچی) کے لیے کچھ نہ کچھ لے جانا ضروری ہے گھر پہنچنے پر دو ہی تو سوال کیے جاتے ہیں۔ بیوی کہتی ہیں کیا کھویا اور سعیدہ پوچھتی ہے کیا لائے۔''

O

ڈاکٹر اصغر کے ہاں پہنچے تو میاں بیوی دونوں باغ باغ ہوگئے۔ ان کی اہلیہ ایک جرمن خاتون ہیں۔ ان کو نفیس کیک اور انگریزی مٹھائی بنانے، اس سے زیادہ کھلانے اور مکان کو سجانے اور ستھرا رکھنے کا شوق اور مریض کی تیمارداری کرنے میں کمال حاصل ہے۔ ذاکر صاحب کے پہنچتے ہی انھوں نے طرح طرح کی کھانے کی چیزیں لاکر رکھ دیں، ہم سب نے کھانا اور ذاکر صاحب نے پوچھنے اور سیکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کیک اور بسکٹ بنانے کا کیا طریقہ ہے۔ اس کے لیے مخصوص چولھے اور تنور کیسے بن سکتے ہیں۔ مرغیاں پالنے کی کیا تدابیر ہیں اور یہ تمام باتیں محض لطف سخن یا عوائد رسمیہ کے طور پر نہیں بلکہ یہ سب اس لیے کہ جامعہ میں ان کو کس طرح

نافذ کیا جائے۔ باورچی خانے میں جا کر چولھے کا نقشہ دیکھا اور سمجھا، مرغی اور بط کے ڈربے دیکھے۔ ایک بط پر ذرا زیادہ توجہ ڈال دی وہ بیگم اصغر نے دوسرے دن ذاکر صاحب کے اعزاز میں میز پر چُن دی۔

o

ایک دن ڈاکٹر اسلام الحق انصاری آ گئے۔ ان سے پتھالوجی پر بحث ہونے لگی۔ اس زمانے میں ذاکر صاحب کو جامعہ کے لیے ایک ڈاکٹر کی ضرورت تھی لیکن ڈھنگ کا کوئی نہ ملتا تھا۔ اس لیے طے یہ کیا کہ کچھ اور نہیں تو قارورہ وغیرہ جانچنے کا جو طریقہ ہے وہ خود ہی ڈاکٹر انصاری سے سیکھ لیں۔ چنانچہ دوسرے دن طبیّہ کالج پہنچے، اور وہاں سب سیکھ سا کھ کر واپس آ گئے۔ ذاکر صاحب نے انٹرمیڈیٹ سائنس میں کیا تھا اور میڈیکل کالج لکھنؤ میں قریب قریب داخل بھی ہو گئے تھے، لیکن پھر چلے آئے اور بی۔ اے میں فلسفہ اور اقتصادیات کے مضامین لے لیے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا کہ ڈاکٹر انصاری سے جو کچھ سیکھ کر گئے تھے اس کا کاروبار کیسا چل رہا ہے، کہنے لگے۔ ''خوب چل رہا ہے۔ معمولی جانچ کا کام بالکل آسان ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مرشد! تشخیص امراض اور معالجہ کے آپ نے بہت سے طریقے تو خود ایجاد کیے ہیں، کیا ہرج اگر آپ یونانی طب کا بھی مزاج دریافت فرمالیں۔''

فرمایا، ''وہاں فن کی اتنی ضرورت نہیں ہے، جتنی عقل اور تجربہ کی۔''

میں نے کہا۔ ''کیا بات ہوئی۔'' کہنے لگے، ''آج کل مشین اور کتابوں نے ہر کام کو اتنا آسان بنا دیا ہے کہ عقل اور تجربہ کو کوئی کام میں نہیں لاتا۔ صرف فیصلہ یا بشارت دے دیتا ہے۔''

اچھا ایک لطیفہ سنیے، جامعہ کے چھوٹے بچوں کے ایک بڑے میاں نگراں تھے۔ ایک بچے کی طبیعت خراب ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب بلائے گئے۔ نگراں نے مرض کی تاریخ سنانی شروع کی۔ کتنے دن ہو گئے یہ استعمال کیا وہ استعمال کیا حتیٰ کہ تھرمامیٹر بھی استعمال کیا، لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ڈاکٹر چُپ ہو گیا۔ اس نے معمولی دوا لکھ دی پرہیز پوچھا گیا تو اس نے بتایا۔ سوائے آپ سے پرہیز کرنے اور کسی پرہیز کی ضرورت نہیں ہے۔

مجھے ذاکر صاحب کو چھیڑنے میں زیادہ لطف آتا ہے، میں نے کہا۔ ''مرشد! چشمِ بددور آپ سراپا سے بھی جالینوس معلوم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر کہلاتے ہی ہیں اگر اس وقت کوئی آ جائے اور آپ کو نبض اور قارورہ دکھائے تو آپ کیا کریں گے؟''

کہنے لگے۔ ''نبض سے تو صرف مریض پر توجہ ڈالی جاتی ہے۔ قارورہ سے ہاضمہ کا اور نبض سے عادات کا نقص بتانا چاہیے۔ معمولی لرزہ بخار، کھانسی زکام، پیچش میں تو عقل صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے، صرف دوا بتا دینا کافی ہے۔ سفید پوش پیشہ ور مریضوں کو باتوں پر دھر لیجیے۔ وہ دوائیں پہلے سے کھاتے ہوں گے، اور آپ چاہے جو بتائیں استعمال وہ اپنی ہی دوا کریں گے۔ ہر شخص چاہے گا یہ کہ اسے وہی چیز پھر کھونے کو مل جائے جو وہ کھو چکا ہے۔ نوجوانوں کے امراض متعین ہیں لیکن ان کا اقرار وہ صفائی سے نہیں پھروٹ سے کریں گے اور اپنے امراض کو تاثرات کے پردے میں طرح طرح سے ملمّع و مرصّع کر کے بیان کریں گے۔ مثلاً وہ کسی طبیب کے ہاں جائیں گے تو شروع اس طور سے کریں گے کہ ان کے سر میں درد رہتا ہے، پھر حلق کی خرابی بتائیں گے۔ اس کے بعد نزلہ زکام اور تداحل مصلین پر اظہار خیال ہوگا۔ وہاں سے اُتر کر معدہ کی بے وفائی کا تذکرہ کرتے کرتے آخری تان یا ''خلاصۂ فریاد'' بقیہ اعضائے رئیسہ کی نارسائی پر توڑیں گے۔

O

ذاکر صاحب کی تقریر و تحریر دونوں میں ایک خاص چیز ملتی ہے جو کہیں اور کم دیکھی گئی ہے۔ ماہرین طبیعات کا مدتوں خیال رہا کہ روشنی کی رفتار بخط مستقیم ہوتی ہے۔ بعد کی تحقیقات یہ ہے کہ اس کی رفتار بخط مستقیم نہیں بلکہ جست و خیز کے ساتھ ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کی تقریر و تحریر دونوں میں یہ بات ملتی ہے۔ وہ مروجہ طریقوں سے کام نہیں لیتے، بلکہ شروع سے آخر تک سامع یا قاری کی توجہ کو اپنے الفاظ اور خیالات کی تازگی و توانائی سے تب و تاب دیتے ہیں اور اس کے تصورات کو نہ تھکنے دیتے ہیں نہ دم لینے دیتے ہیں۔ کم لوگوں کی تقریر و تحریر حشو و زوائد یا بندھے ٹکے الفاظ و عبارت سے اتنی پاک ہوتی ہے جتنی کہ ذاکر صاحب کی۔ ان کی تقریر میں نہ خطابت ہوتی ہے نہ موعظت لیکن خطابت کا زور اور گرمی اور موعظت کی رحمت و شائستگی بدرجہ اتم ملتی ہے۔

الفاظ وعبارت میں صفائی خیالات میں رفعت اور جذبات میں سچائی ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب تقریر کرتے ہیں تو مجھے پہاڑ کی فضا یاد آجاتی ہے۔ پہاڑ ہی کا اوج، وزن و وقار۔ ان کی تقریر اس چشمہ کی مانند ہوتی ہے جو اپنی سیل سفر کی ہر منزل میں شفاف، شادماں و شگرف کارر ہتا ہے، لیکن جہاں کہیں ذاکر صاحب نے ملک پر چھائی ہوئی تاریک کہر اور ساتھیوں کے تذبذب یا تھکن کی طرف اشارہ کیا ہے وہاں ان کا لہجہ دھیما اور حزیں ہوگیا ہے۔ الفاظ میں مرہم ہے لیکن پیغام میں وہی گرمی اور جگر تابی ہے جو ذاکر صاحب کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

O

ذاکر صاحب کی تقریر کا لطف اس وقت دوبالا ہوجاتا ہے جب حاضرین میں سے کوئی بڑا اور برخود غلط آدمی بے سمجھے بوجھے محض اپنی اہمیت جتانے کے لیے اعتراض کردے۔ طالب علمی کے زمانے میں یونین میں ذاکر صاحب کی جوابی تقریر سننے کے لیے ہم سب خاص طور پر جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک سال وائس پریسیڈنٹ کے لیے ذاکر صاحب بھی امیدوار تھے، سارے طلبا خواص وعوام کے نام سے دو گروہ میں تقسیم ہوگئے۔ ذاکر صاحب عوام کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے۔ ہر فریق کے امیدوار کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی قابلیت اور اہمیت جتانے کے لیے یونین میں تقریر کرے چنانچہ ذاکر صاحب کو بھی بحث کے لیے عنوان دینا پڑا۔ مخالف جماعت نے یہ مشہور کرنا شروع کردیا کہ ذاکر صاحب کے لیے فلاں پروفیسر نے تقریر لکھ دی ہے اور وہ اس کے رٹنے میں مصروف ہیں۔ مباحثہ کا وقت آیا یونین ہال میں تل رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ ذاکر صاحب کا نام لیا گیا اور ہال تالیوں اور سیٹیوں سے اس طور پر گونجا جیسے

''ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار۔''

ذاکر صاحب دائیں طرف کے اسٹینڈ پر آئے اور بولے۔ ''میں نہایت ادب کے ساتھ لیکن ضابطہ سے اپنے موضوع بحث کو اس مجلس کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ مجھے اس بارے میں جو کچھ عرض کرنا ہے وہ میں اپنی جوابی تقریر میں عرض کروں گا۔ فی الحال اتنا ہی عرض کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر اپنی جگہ پر لوٹ آئے، لیکن فوراً ہی اودھم مچ گیا۔ فریق مخالف نے خوب خوب پھبتیاں کسیں اور شور مچایا۔ یہ معلوم جیسے الیکشن کے نتیجے کا اعلان کردیا گیا ہے۔

ذاکر صاحب کے حمایتیوں کا یہ حال کہ کوئی غصہ میں کوئی مایوس ہوکر کوئی اپنے آپ پر نفریں کرتا ہوا اور کوئی ذاکر صاحب کو آنکھوں آنکھوں میں تناول کرتا مجمع سے باہر جانے لگا۔ کچھ اس طور پر جم کر بیٹھ گئے کہ یا تو مار ڈالیں گے یا مر کے اُٹھیں گے۔ مخالفین کی بن آئی تھی اس دن صرف مخالفین نے تقریریں کیں اور جس کے دل میں جو آیا اس نے ذاکر صاحب اور ان کے حمایتیوں کو سنا ڈالا۔

جواب کا وقت آیا تو ذاکر صاحب پھر اسٹینڈ پر آئے۔ ان کے موافقین بھی جو یونین کے باہر آس پاس چہ میگوئیوں میں مصروف اور کچھ پھرے ہوئے دروازے سے لگے کھڑے تھے۔ رفتہ رفتہ واپس آئے۔ ذاکر صاحب پر کچھ ایسا عالم طاری تھا کہ کسی نے تالی تک نہ بجائی۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ موضوعِ بحث پر اب بھی میں کوئی تقریر نہ کروں گا۔ صرف مخالف تقریروں کا جواب دوں گا۔ اس کے بعد انھوں نے ہر مخالف کے دلائل کے جواب دینے شروع کیے اور جہاں تہاں ان کے آداب محفل، انداز و لہجہ پر فقرے بھی چست کرتے گئے۔ مجمع سے صدائے تحسین بلند ہونا شروع ہوئی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت بڑا شاعر اپنی بہترین نظم سنا رہا ہے۔ جس کے ایک ایک شعر پر مجمع تلے اوپر ہو رہا ہے۔ تقریر ختم ہوئی رائے لی گئی تو سارا ہال موافقت میں کھڑا ہو گیا۔ صدر نے نتیجہ کا اعلان کیا۔ اب ذاکر صاحب کے موافقین کی بن آئی تھی۔ انھوں نے مخالفین کا پیچھا گھر تک نہ چھوڑا۔ پانی پت کی آخری لڑائی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو ایسی شکست دی کہ جنوبی ہند میں کوئی مرہٹہ خاندان ایسا نہ تھا جس کے ہاں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو، یہی حال ذاکر صاحب کی تقریر کا اور ان کے جچے تلے برجستہ فقروں نے مخالفین کا کیا۔

o

مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ایک جلسہ میں سر سلیمان مرحوم[1] صدر تھے اراکین میں سے ایک صاحب اپنے آپ کو بڑا طباع اور یگانۂ روزگار سمجھتے تھے، اور ہر لمحہ اپنی نشست سے بیٹھے بیٹھے لوگوں پر فقرے چست کیا کرتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ ان کی موجودگی میں کسی کی پیش

1۔ سر سلیمان مرحوم (1886-1941)

نہ آئے۔ ذاکر صاحب نے ایک مسئلہ پر تقریر کی، جس کو ہر شخص نے غور واحترام کے ساتھ سنا۔ بڑے سے بڑے مخالف مجمعوں میں ذاکر صاحب کی تقریر ہمیشہ خاموشی اور احترام سے سنی گئی یہ امتیاز میں نے کم لوگوں میں پایا۔ تقریر کے ختم ہوتے ہی وہ صاحب تلملا اُٹھے اور فوراً اپنی نشست پر سے ایک پوائنٹ آف آرڈر رسر کیا۔ جس میں تفاخر اور خودنمائی کی شان پورے طور سے جلوہ گر تھی۔ بولے، ''جناب والا نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ ذاکر صاحب نے ابھی جو تقریر کی ہے وہ بالکل میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' کچھ اور ارشاد فرمانے والے تھے کہ ذاکر صاحب نے اُٹھ کر فرمایا۔ ''جناب والا میں نے اپنی تقریر میں کہیں اس کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ میری تقریر محترم ممبر کی سمجھ میں آئے گی۔'' اس پر ایسا بے محابا قہقہہ پڑا کہ سر سلیمان جیسے ثقہ آدمی جو ایسے مواقع پر اپنی طرف سے کبھی بے تکلف نہیں ہوتے تھے بے اختیار ہنس پڑے اور معترض صاحب کچھ ایسے سٹ پٹائے کہ دورانِ مجلس میں صرف سکوت پر قانع رہے۔

کورٹ ہی کا ایک اور جلسہ بھی مجھے کبھی نہ بھولے گا اس میں جو مسئلہ زیر بحث تھا وہ اس درجہ اہم متنازعہ فیہ تھا کہ کورٹ کے بااقتدار اراکین ہر گوشۂ ملک سے بڑی کثرت سے شریک ہوئے تھے اور جو کچھ فیصلہ ہونے والا تھا اس میں کہیں شک وشبہ کی گنجائش نظر نہ آتی تھی۔ فضا ایسی دگرگوں تھی کہ بڑے سے بڑے شخص کی ہمت نہ ہوسکتی تھی کہ مخالفت میں تقریر کرنا تو درکنار مخالفت میں چپکے سے ہاتھ اُٹھانے کی بھی جرأت کر سکے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہر طرف سرنگیں بچھی ہوئی ہیں جس نے قدم اُٹھایا وہ جان سے مارا گیا۔ معمولی ابتدائی کارروائی شروع ہوکر ختم ہوئی۔ تحریک پیش کرنے والوں میں ایسے اصحاب تھے جو قانونی قابلیت، قومی خدمات، ذاتی جاہ وحشمت ہر اعتبار سے قوم اور ملک میں خاص درجہ رکھتے تھے۔ یہ مرحلہ بھی ختم ہوا اور وہ لمحہ آیا جب اس کی مخالفت میں کوئی کھڑا ہو۔ چند لمحے ایسا سناٹا رہا کہ ہر شخص اپنے قلب کی حرکت سن سکتا تھا۔ معرکہ میں پہلا قدم اٹھانے والا اور پھر پیچھے مڑکر نہ دیکھنے والا ہی مرد کہلاتا ہے۔ ذاکر صاحب سب سے پیچھے کی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُٹھے محض ایک جملہ کہہ کر بیٹھ گئے۔ ''یہ تحریک قانوناً پیش نہیں کی جاسکتی۔'' سارا مجمع پیچھے مڑکر دیکھنے لگا۔ قانون میں جن صاحب کا پایہ ہائی کورٹ تک مسلّم تھا اور جو اس تحریک کے قانونی پشتیبان تھے۔ کڑک کر بولے،

''قانونی سقم کوئی نہیں ہے میں چیلنج کرتا ہوں۔'' جلسہ میں جو لوگ بحث کرنے یا سمجھنے کے لیے نہیں بلکہ ہاتھ اُٹھانے اور اودھم مچانے کے لیے آتے ہیں یا بلائے جاتے ہیں ان کی بن آئی تھی۔ ذاکر صاحب نے ایک لفظ نہ کہا، بڑی مشکلوں کے بعد جب مجمع کو کسی قدر خاموش کیا گیا، اور فاضل معترض نے اپنا چیلنج دُہرایا تو ذاکر صاحب نے ان کو ایک اور موقع کی یاد دلائی جب انھوں نے ایسے ہی ایک مسئلہ میں ذاکر صاحب کو چیلنج دیا تھا اور بعد میں اپنی غلطی تسلیم کی تھی اور فرمایا، ایسے مواقع پر چیلنج نہیں دیتے سوچتے ہیں ذاکر صاحب نے اب ایک مختصر سی تقریر کی اور اپنے اعتراض کی بڑی سنجیدگی لیکن وثوق اور دبدبہ کے ساتھ وضاحت کی! جلسہ کے مدبّروں نے غور کیا تو ذاکر صاحب کا اعتراض صحیح نکلا، معترض نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ ہال کے اندر بڑی دیر تک دوڑ دھوپ اور خفیہ سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ بالآخر ذاکر صاحب ہی کی مشورت سے مطالبہ کی نوعیت بدل گئی اور کارروائی شروع ہوئی۔

o

علمی اور فنی مسائل پر تحقیقات کرنا اور ان سے طلبا کو آشنا کرانا یونیورسٹی کے معلمین کا فرض منصبی ہے۔ ذاکر صاحب کے آنے پر یہ چرچے دن رات کے ہو جاتے ہیں اور ذاکر صاحب سے ہر موضوع پر خواہ وہ عقلِ اوّل ہو خواہ ازواجِ مکرر بڑے لطف سے اور بڑے اونچے درجہ کی گفتگو کی جاسکتی ہے۔ اساتذہ، طلبا، اجنبی اور احباب کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ ذاکر صاحب کا مسائل کے منقح کرنے کا طریقہ دل نشیں لیکن نہایت مشکل ہے۔ وہ ہر مسئلہ پر روزمرہ کے پیش آنے والے حالات واقعات کی روشنی میں گفتگو کرتے ہیں۔ عام طور پر بحث کرنے میں لوگ صرف اپنے نقطۂ نظر کو پیش پیش رکھتے ہیں، اور بحث میں الجھاؤ اور بدمزگی بھی اکثر اسی طریقۂ کار سے پیدا ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب گفتگو کرنے میں اپنے مخاطب اور معترض ہی کے نقطۂ نظر کو اپنا لیتے ہیں اور مسئلہ کو منقح کر دیتے ہیں۔ اس طور سے معترض کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اس کی قابلیت یا اس کے عقیدہ کو ٹھیس پہنچائی گئی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ خود مخاطب کے نقطۂ نظر کی تنقیح و توضیح اس طور سے کر دی ہے کہ وہ اپنی بڑائی محسوس کرنے لگا اور غیر شعوری طور پر ہمیشہ کے لیے ذاکر صاحب کی ہمدردی، قابلیت اور شخصیت کا شیدائی ہو گیا۔

ذاکر صاحب کی بلند نظری، دردمندی اور وسعت قلب کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ان کے مخالف بھی جب کبھی ان کی مدد کے خواست گار ہوئے تو انھوں نے نہ صرف بغیر پس و پیش کے بلکہ بڑے خلوص سے ان کی مدد کی۔ واردھا تعلیمی کمیٹی رپورٹ کے سلسلے میں ان کو جس سفاہت اور سفا کی سے رُسوا کیا گیا وہ کوئی راز نہیں ہے، اور کوئی قابلِ فخر کارنامہ بھی نہیں۔ اس رپورٹ کے بعد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے کمال یار جنگ تعلیمی کمیٹی کی طرح ڈالی جس کا کام اب تک ختم نہیں ہوا ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ جس زمانہ میں اس کمیٹی پر ایک نازک دور گزر رہا تھا۔ نواب کمال یار جنگ مرحوم جب کبھی دہلی آتے تو ذاکر صاحب سے ضرور ملتے اور کمیٹی کے کام کو حسن خاتمہ پر پہنچانے کی سبیل ذاکر صاحب سے دریافت کرتے اور اعانت کے طلب گار ہوتے۔ واردھا رپورٹ جب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مختلف منازل سے گزر کر صوبہ متحدہ کی حکومت میں پہنچی تو کانفرنس کی حمایت میں اور کانفرنس ہی کے نقطۂ نظر کو ذاکر صاحب نے وہاں کے ماہرین کے سامنے واضح کیا اور منوایا!

میں نے کہا!

''مرشد! یہ کیا بات ہوئی؟''

تو فرمایا۔

''ہوئی کیا اغیار میں اپنوں کی رسوائی دیکھی نہیں جاتی۔''

واردھا رپورٹ سب سے پہلے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پٹنہ کے اجلاس میں پیش ہوئی۔ ذاکر صاحب آنکھوں کی سخت اذیت میں مبتلا ہو کر بمبئی گئے ہوئے تھے۔ جہاں ان کی آنکھوں کا آپریشن کیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں کی سخت ممانعت کے باوجود انھوں نے ایک صاحب کو خفیہ طور پر بلا کر اسی حالت میں کہ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور طبیعت نڈھال تھی۔ ایک خط نواب صدر یار جنگ بہادر، سکریٹری کانفرنس کو لکھوایا، جس میں انھوں نے کمیٹی کی بنیادی سفارشات کی اہمیت بڑی قابلیت اور بڑے ہی درد سے جتائی تھی۔ یہ خط ذاکر صاحب کے خلوص، قابلیت، دل سوزی اور خود انشا پردازی کا بڑا نادر نمونہ ہے۔ یہ خط عام نظروں کے سامنے آیا یا نہیں، مجھے نہیں معلوم، لیکن میں نے اسے دیکھا ہے۔ غور سے اور دیر تک پڑھا ہے۔ اس کا

آخری شعر یہ ہے۔

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

موقع کی اہمیت اور خود لکھنے والے کی حالت کا اندازہ کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال نے بھی کچھ ایسے ہی عالم میں پہنچ کر یہ شعر کہا ہوگا۔ شاعری اور انشاپردازی میں بھی ایک مرحلہ آتا ہے۔ جب:

ریحان دمد از مینا، رامش چکد از قُلقُل!

یہ بات صنعت گری کے بس کی نہیں ہے۔ یہ تو اسی وقت آتی ہے جب نظر میں وسعت، فکر میں گہرائی، دل میں سچائی اور اخلاق میں پاکی ہو!

O

ذاکر صاحب کے ساتھ سفر اور شاپنگ (چھوٹی موٹی چیزوں کی دُکانوں سے خریداری) کا جو لطف ہے وہ کم لوگوں کے حصے میں آیا ہوگا۔ سفر میں آپ کم ساتھی ایسے پائیں گے جو اچھی جگہ پر خود قبضہ پانے کی فکر نہ کریں۔ ہار جیت کا کوئی تفریحی کھیل آپ ہارنے یا جیتنے لگیں تو فوراً ظاہر ہو جائے گا کہ آپ شرافت اور انسانیت کی کس منزل میں ہیں۔ شاپنگ میں معمولی ساتھی بہت جلد اُکتا جاتا ہے، اور چاہے وہ کتنی ہی کوشش اس کے خلاف کیوں نہ کرے اس کی بے زاری ظاہر ہو جائے گی۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب وہ اپنا کام ختم کر چکا ہو اور سب سے کٹھن آزمائش تو وہ ہے جب آپ کی قسمت میں خواتین کے ساتھ شاپنگ کرنا لکھا ہو، بعضوں کا یہاں تک خیال ہے کہ آپ عورتوں کے ساتھ بغیر لنگڑائے یا روئے شاپنگ ختم کر لیں تو جہنم کے ستر گز معاف کر دیے جائیں گے۔

ذاکر صاحب کے ساتھ میں نے سفر بھی کیا ہے اور شاپنگ بھی، وہ ان دونوں کے آداب اس خوبی اور بے تکلفی سے برتتے ہیں کہ آپ کا دل یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ زندگی کے یہ دونوں مشاغل اچھے مشاغل ہیں۔ شاپنگ کا تو مجھے مرض ہے۔ جس طرح بعض خبطی علی الصباح بلا قید موسم و موقع بے ضرورت غسل کرنے یا ٹہلنے سے باز نہیں آتے اور شریفوں کے سامنے فخر

کرنے سے نہیں شرماتے اور اس روزمرہ میں خلل آجائے تو تمام دن سکرات میں مبتلا رہتے ہیں۔ ویسے ہی اگر نئی جگہ جاؤں اور وہاں محض قوم کے درد میں مبتلا رہوں اور شاپنگ کرنا نصیب نہ ہوتو میں بھی آپے میں نہیں رہتا اور سمجھتا ہوں کہ لوگ انسانیت پر فخر کیسے کرتے ہیں جب مجھے شاپنگ کرنے تک کی فرصت یا مقدرت نہیں!

شاپنگ کا میرا اصول یہ ہے کہ روپے کم خرچ کیے جائیں۔ اشیا زیادہ خریدی جائیں۔ دوڑ دھوپ زیادہ کی جائے۔ روپے زیادہ ہوں تو کم خرچ کرنا آسان ہے جب کم ہوں تو کم خرچ کرنا بڑا مشکل فن ہے اور بالکل نہ ہونے پر بھی خرچ کیے جانا تو خاصان خدا ہی کا خاصہ ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی نادر چیز نظر آجائے تو کسی صاحب مقدرت کی تلاش کروں گا اور اس سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے لیے اسے خرید لے، اور میرے ذوق خواری یا خریداری کو تسکین پہنچائے۔

دلّی میں جب ذاکر صاحب کا ہرجگہ اور جامعہ کا صرف قرول باغ میں قیام تھا اس وقت شاپنگ کا لطف تھا۔ ہماری شاپنگ پٹری پر بیٹھ کر بیچنے والوں کے ہاں ہوتی تھی۔ کہیں سے کوئی رنگین کلینڈر، کہیں سے مشین گزیدہ تولیے، موزے، بنیائن، کہیں سے ستم رسیدہ کیلے، کہیں سے پنتھلین کی گولیاں خریدیں۔ گھر سے نمونے کی بیل، چین، اون بٹن وغیرہ کے ایسے نمونے لے گئے جو کہیں نہ میسّر آئیں۔ جاپانی فاؤنٹن پن کا جائزہ لیا اور نب کے آزمانے، دیکھنے میں ایسے مصروف ہوئے کہ اس سے کچھ کم ہی دیر کسی مضمون کے لکھنے میں لگا دیتے تو چاندنی چوک میں بلوا اور قوم میں چندہ ہونے لگتا۔ فتح پوری سے چاندنی چوک ہوتے ہوئے جامع مسجد تک آئے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کباڑیوں کے سازوسامان پر شاطرانہ نظر ڈالتے ہوئے کباب والے کی دکان پر پہنچ گئے۔ کچھ کھایا کچھ خریدا بقیہ کو ''اللہ بس باقی ہوس'' کہا اور وہاں سے جامع مسجد کی ساخت اور جامعہ کی پرداخت پر مرشد سے بحث کرتے ہوئے قرول باغ واپس آگئے۔

اس تمام مدت میں مرشد اس دل و جان سے گھومنے پھرنے، کھانے پینے، لطف اُٹھانے اور لطف پہنچانے میں شریک رہے گویا ان کے نزدیک اس سے بہتر سلوک میں ان کے ساتھ نہ کرسکتا تھا۔

مئی میں لُو کی شدت تھی، علی گڑھ سے دو بجے دن کو گاڑی چلتی تھی۔ مرشد کا ساتھ تھا۔ میں نے کہا۔

''سفر کیسے ہوگا لُو لگی تو کہیں کے نہ رہے۔''

فرمایا۔ ''چلیے بھی آنکھ بچا کر نکل جائیں گے۔''

گاڑی آ چکی تھی اور چھوٹنے کے قریب تھی ایک صاحب کو ٹکٹ خریدنے کے لیے روپے دیے اور ہم دونوں بھاگ کر ایک ڈبّے میں بیٹھ گئے جو تنور کی طرح دہک رہا تھا۔

مرشد ایک لمبا تولیہ اوڑھ کر خالی سیٹ پر لیٹ گئے اس دن لو اس شدت کی تھی کہ رہ رہ کر یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ ڈِبا کہیں کہیں سے سلگنے نہ لگے۔ مرشد کی طرف دیکھا تو سر سے پاؤں تک تولیے میں ملفوف بڑے سکون کے ساتھ چت لیٹے ہوئے تھے۔ صرف دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''تھوڑی دیر کے لیے سو نہ جائیے۔''

اشارے سے کہا نہیں۔

میں نے کہا۔ ''کیوں؟''

فرمایا۔ ''آنکھ جھپکی نہیں اور اس نے مارا نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کس نے؟''

فرمایا۔ ''لُو نے۔''

میں نے کہا۔ ''ٹکٹ کلکٹر آیا تو؟''

مرشد نے آہستہ آہستہ آنکھ بند کر لی!

غازی آباد کے اسٹیشن پر گارڈ ٹکٹ دے گیا۔

مرشد نے کہا۔ ''لُو اور ٹکٹ کلکٹر دونوں سے بچ گئے۔ اب کیا ہو؟''

میں نے کہا۔ ''اس کا جشن منایا جائے۔''

مرشد نے فوراً سنترے خریدے اور اتنے خریدے کہ قرول باغ تک ختم نہ ہوئے۔

ذاکر صاحب کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے کہ اُردو کی تقریر و تحریر بہتر ہوتی ہے یا انگریزی کی۔ طالب علمی کے زمانے میں کالج میگزین میں رِپ RIP کے نام سے وہ کالج کی زندگی پر بڑے دل کش مضامین لکھا کرتے تھے جس کا لوگ بڑے شوق سے انتظار کیا کرتے تھے۔ انگریزی کے بارے میں ایک بار مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر مسٹر ریمز باتھم نے کہا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی انگریزی تحریر و تقریر بالخصوص ان کی حاضر جوابی کا مقابلہ برطانوی پارلیمنٹ کے بہترین اراکین سے کیا جا سکتا ہے۔ اُردو تحریر کے نمونے میں نے گذشتہ اوراق میں دیے ہیں۔ انگریزی کے نمونے پیش کرنے کا یہ موقع نہیں۔ علی گڑھ میں رہ کر اور اس سے باہر بھی میں نے انگریزی ہی کی اچھی تقریریں سنی ہیں۔ لیکن ہر طرح کے تکلفات سے قطعاً بری، رواں، جچی تلی، دل نشین، فکر انگیز، انگریزی تقریریں میں نے ذاکر صاحب ہی سے سنی، ان کی تقریر کا ایک جملہ بھی زائد از ضرورت نہیں ہوتا اور شروع سے آخر تک استوار، شریفانہ اور ہر فقرہ میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے آپ ان کے کسی فقرہ کے ابتدائی الفاظ سن کر یہ نہیں بتا سکیں گے کہ اس فقرہ کی یہ پرداخت ہوگی یا یوں ختم ہوگا۔ ہمیشہ وہ اس کو اس طرح ختم کریں گے کہ آپ متحیر بھی ہوں گے اور خوش بھی۔ عام تقریر کرنے والوں کی مانند وہ جسم کے کسی حصہ کو خاص طور پر جنبش یا جھٹکے نہ دیں گے لیکن بحیثیت مجموعی آپ کو یہی محسوس ہوگا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، اس میں ان کے سارے جسم و جان کی کارفرمائی ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ اپنی تقریر سے اپنے گرد ویسی ہی فضا پیدا کر لیتے ہیں یا وہ خود ایک فضا ہیں جس سے ویسی ہی تقریر برآمد ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کو خاموش دیکھ کر اکثر ذہن غالب کے اس مصرعے کی طرف منتقل ہوتا تھا۔

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے

ذاکر صاحب سے میرے تعلقات بڑے گہرے اور بڑے پرانے ہیں، لیکن قومی زندگی میں میرا ان کا کبھی ساتھ نہ ہوا۔ وہ قلندر، میں دنیادار، انھوں نے زندگی کے جو مصائب اُٹھائے میں ان کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ زندگی کے جن آستانوں پر میں نے سر جھکایا ان آستانوں نے ذاکر صاحب کے سامنے پیہم سجدے کیے اور ٹھکرائے گئے۔ ذاکر صاحب مجھ سے تھوڑی سی بھی قربانی کرنے کو کہیں تو شاید میں نہ کر سکوں، ممکن ہے یہی سبب ہو کہ انھوں نے مجھ سے اس قسم

کی فرمائش نہ کی۔ میں نے ان سے بڑی سے بڑی فرمائش کی اور انھوں نے ذرّہ برابر ہچکچائے بغیر اسے پورا کر دیا۔ ایک واقعہ سنیے 8-7 سال ہوئے ہوں گے ایک دن صبح کو میں اور ذاکر صاحب ناشتہ کر کے کمرے سے نکلے تھے کہ میرے دل میں اچانک ایک خیال آیا۔

میں نے کہا۔ ''ذاکر صاحب آپ فلاں صاحب سے صلح کیوں نہیں کر لیتے مجھے بڑی خوشی ہوگی۔''

ذاکر صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا۔ ''سبحان اللہ کیا مصرع موزوں فرمایا ہے۔ آخر آپ کو سوجھی کیا؟''

میں نے کہا۔ ''اس کو کیا کیجیے، مجھے تو ایسی ہی سوجھتی ہے۔''

کہنے لگے۔ ''تو یہ کون سی بڑی بات ہے آپ کہتے ہیں تو ہو جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی چلیے۔''

مرشد تیار ہو گئے۔

اور ہم دونوں وہاں پہنچے تو معلوم ہوا وہ صاحب موجود نہیں ہیں بات آئی گئی ہو گئی اور جہاں کی تہاں بھی رہ گئی۔

یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا جن صاحب سے میں صلح کرانے گیا تھا وہ ذاکر صاحب کے جب بھی بڑے دشمن تھے اور اب بھی ہیں۔

اب جب کبھی اس واقعہ کی یاد آتی ہے تو بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے، لیکن ذاکر صاحب کی شرافت، وسعت قلب اور دوست نوازی پر نظر کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

o

1857 کے بعد مسلمانوں کو جن دشواریوں کا سامنا ہوا ان سے عہدہ برآ ہونے کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی کوشش علی گڑھ تحریک کے ماتحت ہوئی۔ جس کے بانی سرسید اعظم علیہ الرحمہ اور ان کے رفقائے کرام تھے۔ اس تحریک نے ان دشواریوں کو بڑی حد تک دور کیا جن سے اس وقت مسلمان دوچار تھے۔ لیکن اس کے سامنے مسلمانوں کے مستقبل کی تشکیل و تعمیر کا کوئی نامی اور منظم پروگرام نہ تھا۔ اس تحریک کی خوبی اور خامی دونوں یہ تھی کہ اس کو حکومت

کی اعانت حاصل تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ اس راستے سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتا تھا جو حکومت نے اپنے مصالح و مقاصد کو مدِ نظر رکھ کر مقرر کر دیا تھا۔ اس سے جو فائدہ ہو سکتا تھا مسلمان اس سے بہرہ مند ہوئے، لیکن اس میں جو بنیادی خامیاں تھیں، ان سے مسلمانوں کو نقصان بھی پہنچا۔ حکومت کی سرپرستی سے منصبی اقتدار ضرور حاصل ہوتا ہے اور منصبی اقتدار سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ بھی مسلّم۔ لیکن اس کا نقص یہ ہے کہ شخصی عظمت کی نشو و نما کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ دنیا کے موجودہ ہیجان و بحران کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ شخصیت کی گراں مائیگی کو اداروں کی مصلحت پر قربان کر دیا گیا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم اپنے اداروں کے غلام ہیں اور ہم میں اس کی صلاحیت باقی نہ رہی کہ ادارے ہماری ضرورت تسلیم کریں۔

اس تحریک کا سب سے نمایاں اور اہم ردِّ عمل ترکِ موالات کا وہ حملہ تھا جو 1921 میں ایم اے او کالج پر ہوا۔ یہ حملہ کامیاب بھی ہوا اور ناکامیاب بھی، ناکامیاب ان معنوں میں کہ بنیادی طور پر علی گڑھ جہاں کا تہاں رہا اور کامیاب یوں کہ اس وقت کے بیش تر اچھے طلبا علی گڑھ سے نکل کر جامعہ میں شامل ہو گئے۔

جامعہ کی بنیاد علی گڑھ میں رکھی گئی۔ ابتدا میں اس کو جو دشواریاں پیش آئیں، وہ نئی نہ تھیں۔ جامعہ کا قیام بڑی ہلچل میں عمل میں آیا تھا۔ سیاست کے لیڈر بالعموم تعلیم کے لیڈر نہیں ہوتے لیکن طالب علم اور تعلیمی ادارے کو اپنا سب سے موثر اور آسان حربہ سمجھتے ہیں اور بنا لیتے ہیں۔ تعلیم کو سیاست کی باندی بنانا، ایسا ہی عبث اور خطرناک ہے جیسے سمندر کی لہریں سمندر کی وسعت اور گہرائی کو اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش کریں۔ سیاسی لیڈر ہمیشہ طالب علموں سے اپنا کام لیتے ہیں۔ ان کی زندگی کو سدھارنے کی پروا نہیں کرتے۔ ان ہی وجوہ سے جامعہ کا ابتدائی دور علی گڑھ میں کامیاب نہ رہا اور حکیم اجمل خاں صاحب اور ڈاکٹر انصاری صاحب اسے دہلی لے گئے۔ تھوڑے دن بعد جب ذاکر صاحب اور ان کے رفقا اپنی اپنی تعلیم ختم کر کے یورپ سے ہندوستان واپس آئے تو جامعہ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جامعہ اور اس کے کارکنوں نے سیاسی سرگرمیوں سے علاحدگی اختیار کر لی۔

o

ان پچیس سال میں جامعہ کو کن آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ کون مصیبتیں دور ہوئیں اور کن نئی آفتوں کا سامنا کرنا ہوا۔ یہ داستان تو جامعہ کا کوئی مستند مورخ لکھے گا۔ میں تو صرف یہ دیکھ سکا ہوں کہ جامعہ کس طرح ذاکر صاحب کی شخصیت کے سہارے اور اس سے سیراب ہوکر اپنے مخصوص بلند نصب العین سے قریب تر ہوتی رہی اور باوجود صدہا دشواریوں کے اس نے نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ تمام ہندوستان میں ایک نئی ذہنی بیداری پیدا کی اور اسے پروان چڑھایا۔ ترک موالات کی تحریک بڑی حد تک ناکامیاب اور نامقبول ہوچکی تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ جامعہ کا انجام بھی یہی ہوگا۔ مدتوں جامعہ کی مخالفت اس بنا پر ہوتی رہی کہ یا تو اس کے کارکنوں کی نیت میں فتور ہے یا ان میں عقل کی کمی ہے۔ یہ خیال اب اتنا عام نہیں ہے جتنا پہلے کبھی تھا تاہم ایسے لوگوں کی اب بھی کمی نہیں ہے جو جامعہ اور اس کے کارکنوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی نیتوں میں خود کھوٹ ہے اور کچھ ایسے مخلص بھی ہیں جو جامعہ کی رفتار ترقی میں سیاسی ہنگاموں کی گرمی اور ہنگامہ نہ پاکر اس درجہ مفید نہیں سمجھتے، جتنی کہ وہ ہے۔

ہندوستان میں مدتوں کسی تحریک کے مفید، مبارک یا مستند ہونے کا معیار یہ رہا کہ حکومت کو اس سے کس درجہ اُلفت ہے اور یہی سبب ہے کہ ان تعلیمی اداروں کو قوم اور ملک سے زیادہ اعانت ملی جو حکومت کی سرپرستی میں حکومت کے مقاصد پورے کرتے رہے اور ان تحریکوں کو فروغ نہ ہوا جو ملک وقوم کے حقیقی مقاصد کو مدّنظر رکھ کر حکومت کی مداخلت گوارا نہ کرتی تھیں۔ ''جامعہ'' پہلا ایسا ادارہ ہے جو حکومت کی اعانت سے مستغنی رہ کر اپنوں کی سردمہری کے باوجود، جو اکثر شدید اور غیر شریفانہ مخالفت کی حد تک پہنچی، اپنے لیے ایک اچھی اور اونچی جگہ پیدا کرسکا۔

اس درجہ تک پہنچنے میں جامعہ کے کارکنوں نے جس قابلیت، ایثار اور ہمت سے کام لیا اس کا اندازہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ خود حکومت جو اس طرح کی تحریکوں کو ہمیشہ شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے، جامعہ کی طرف جھکی اور اس نے جامعہ کی درخواست کے بغیر جامعہ کے نصاب اور امتحانات کو اپنالیا۔ ہندوستان کی قومی تعلیمی تحریکوں کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے اور جامعہ کے بہی خواہ اور کارکن اس پر جس درجہ مطمئن اور مسرور ہوں بجا ہے۔

میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ حکومت کتنی ہی ترقی پسند کیوں نہ ہو اس میں جامد اور غیر نامی ہونے کی استعداد مضمر ہوتی ہے۔ قانون، قواعد، ضوابط، روایات (جو بالعموم امتناعی ہوتی ہیں) کا اس پر اتنا بار پڑتا رہتا ہے کہ اس میں اُگنے بڑھنے کی صلاحیت کمزور ہوتے ہوتے مفقود ہو جاتی ہے۔ ریاست یا حکومت اپنے وجود کو قائم رکھنے کی جتنی درپے ہوتی ہے اتنا اپنے وجود کے جواز پر غور نہیں کرتی۔ ریاست کی یہ معذوری ایک طور پر مفید بھی ہے۔ اگر ریاست نت نئے تجربے کرتی رہے تو سوسائٹی میں نہ استواری پیدا ہو نہ اعتماد لیکن اس معذوری کی دیکھ بھال نہ ہوتی رہے تو بالآخر حکومت اس قابل نہیں رہتی کہ وہ نجی تحریکوں کو ہمدردی کی نظر سے دیکھ سکے اور رفتہ رفتہ اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ ہر نئی تحریک کو اپنا دشمن سمجھنے لگتی ہے۔ افراد یا جماعت میں نئی اور نجی تحریکوں کا پیدا ہوتے رہنا ان کی صحت و توانائی کی علامت ہے۔ دوسری طرف حکومت کی صحت و سلامتی کا معیار یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان تحریکوں سے کہاں تک ہم آہنگ رکھتی ہے اور ان کی روشنی میں اپنی صلاحیتوں و ذمہ داریوں کو پرکھتی رہتی ہے۔

جامعہ کا تعلیمی پروگرام حکومت کے مروجہ یک رُخی فرسودہ پروگرام سے مختلف تھا جس کو چند باہمت اور مخلص مسلمان نوجوان نے قومی ضروریات اور زمانے کے مطالبات کو مدنظر رکھ کر بڑی محنت و قابلیت سے قوم اور ملک کے سامنے پیش کیا۔ حسب دستور اس کی پذیرائی نہ ہوئی۔ لیکن نوجوان جو آگے دیکھنے اور جان کی بازی لگانے میں بوڑھوں سے فطرتاً زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں اپنی جگہ پر قائم رہے اور بالآخر وہ وقت آ گیا جب نظامِ کہنہ نے بساطِ نو کے لیے جگہ خالی کرنی شروع کردی۔ دیوانے نہ ہوں تو فرزانے کہیں کے نہ رہیں۔

ایک فاضل نے جامعہ پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ قدیم کے خلاف ردّعمل ضرور ہے لیکن یہ ردّعمل اتنا کافی نہیں ہے جتنا کہ ہونا چاہیے۔ اس نقطۂ نظر میں مغالطہ یہ ہے کہ مصنف نے اس پر غور نہیں کیا کہ جامعہ کا تعلیمی نظریہ انقلابی نہیں ہے، اصلاحی ہے۔ مسلمانوں کا ایک مستقل اور مستند نظام تعلیم پہلے سے موجود تھا۔ جس نے صدیوں ان ضروریات اور مطالبات کو بہ وجوہ احسن پورا کیا جن سے ہمارے پیش رو دوچار ہوتے رہے۔ گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں زمانہ غیر معمولی سرعت سے منقلب ہوا تو اس پروگرام میں بعض نئے اور اہم مطالبات سے عہدہ برآ

ہونے کے لیے چند باتوں میں اضافہ ضروری سمجھا گیا نہ کہ یہ اس نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ انقلاب بہت اچھی چیز سہی، لیکن ہمیشہ اچھی چیز نہیں۔ مسلمان اپنے ماضی کی طرف سے بھی کچھ ذمہ داری رکھتے ہیں۔ ذمہ داری کا ان کا یہ احساس محض جذباتی نہیں ہے بلکہ اس منصب کا تقاضا ہے جس پر مسلمان فائز رہے تھے، اور جس پر ان کا فائز رہنا خود انسانیت کے لیے ایک بشارت ہے۔

اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ جامعہ نے مسلمانوں کا جو تعلیمی پروگرام وضع کیا ہے وہ انقلابی ہو یا نہ ہو جامع ضرور ہے جس میں مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات، علمی روایات، تمدنی برکات اور اخلاقی برگزیدگیوں کو ایک دوسرے سے متوازن اور منور رکھنے کی ماہرانہ ومجاہدانہ کوشش کی گئی ہے۔ جامعہ کسی دوسرے ادارہ کا حریف نہیں ہے بلکہ ہر ایسے ادارہ کا حلیف ہے جہاں اچھا کام ہوتا ہو، جہاں اچھی باتیں بتائی جاتی ہوں اور جہاں اچھا بڑا ہو نہ کہ بڑا اچھا!

o

ذاکر صاحب کو کوئی بُرا کہتا ہے تو میں بھونچکا رہ جاتا ہوں۔ اس کے فوراً بعد جو بات میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ یا تو یہ شخص شیطان محض ہے یا ناواقف محض۔ ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو ذاکر صاحب سے واقف نہ ہوں۔ اس کے بعد ذاکر صاحب کے بارے میں غیر شریفانہ خیالات رکھنا یا پھیلانا شیطنت نہیں تو اور کیا ہے کیسے یہ لوگ ہیں جو ہر چیز کو ہر چیز پر قربان کردیتے ہیں۔

مجھے آج کم وبیش 31 سال علی گڑھ میں رہتے بستے گزرے ہیں میں نے علی گڑھ کی زندگی کا ہر پہلو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ اس دوران میں جتنے لوگ طالب علمی کے مراحل سے گزرے ہیں ان میں سے سب کو نہیں تو بیش تر کو جانتا ہوں، اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یہاں کا طالب علم اپنے عہد کے تقریباً ہر طالب علم سے کم وبیش واقف ہوتا ہے۔ میں نے آج تک یہ نہ دیکھا کہ یہاں کے جن لوگوں کی طالب علمی کی زندگی جیسی رہی ہے اس سے مختلف ان کی پبلک لائف ہو۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہر حال میں ہر جگہ ملیں گے۔ ان کا کردار بجنسہٖ وہی ہوگا جو یہاں تھا خواہ وہ بڑے سے بڑے منصب پر فائز ہوں خواہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ پر، یہ بات علی گڑھ کے سوا کہیں اور بہ مشکل ملے گی۔

علی گڑھ کی خصوصیت یہاں کی اقامتی زندگی ہے۔ یونیورسٹی کی حدود سے باہر طلبا کے لیے تفریح کی کوئی جگہ نہیں، کوئی دریا نہیں، پہاڑ نہیں، باغات نہیں، پُر رونق بازار نہیں، تاریخی آثار نہیں، سال میں ایک بار نمائش البتہ ضرور ہوتی ہے۔ جب طالب علم کباب پراٹھے کھاتے اور کبھی کبھار پولیس والوں کے 'سراپا ناز' ہونے یا نہ ہونے کا جشن منا لیتے ہیں۔ لیکن گھوم پھر کر ہر طالب علم کو فرداً فرداً مجموعی طور پر اپنی دلچسپی کا سامان یونیورسٹی کے احاطہ کے اندر مہیا کرنا پڑتا ہے۔ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، ٹینس، سوئمنگ باتھ، ڈرائنگ ہال، یونین کلب، الیکشن، مڈرائٹ، چار پائی اُلٹنا، سرسید کی فاتحہ ہی میں جوانی کی ترنگ دکھاتے نکلتے ہیں۔

علی گڑھ میں ہر طرح کے نوجوان طلبا ہر گوشۂ ملک سے آتے ہیں۔ دن رات کا ساتھ رہتا ہے۔ ہر شخص کو وہ خواہ کسی مذاق یا میلان کا ہو اپنا رفیق و ہمدم مل جاتا ہے۔ علی گڑھ کی اس خصوصیت کا یہ اثر ہے کہ یہاں کا ہر طالب علم رفتار و گفتار اور کردار میں بے نقاب ہو کر رہتا ہے خواہ وہ اس کے خلاف ہی کوشش کیوں نہ کرے۔ یہی سبب ہے کہ یہاں کے ہر طالب علم کا ایک ربط نہانی علی گڑھ سے مدت العمر قائم رہتا ہے، اور وہ علی گڑھ کی یاد کو اپنی زندگی کی سب سے اچھی یاد سمجھتا ہے۔ چنانچہ کسی علی گڑھ والے کو میں پبلک لائف میں پاتا ہوں تو اس کے طالب علمی کے اعمال نامہ پر نظر ڈال کر اندازہ لگا لیتا ہوں کہ وہ کیا ہے کیسا ہے۔ خواہ پبلک میں اس کے اعزاز میں نعرہ ہائے تحسین کیے جا رہے ہوں، خواہ نعرہ ہائے نفرین۔

o

ذاکر صاحب کے تین اور بھائیوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی، یہ خاندان تقریباً بارہ سال تک علی گڑھ کی رزم و بزم میں پورے طور سے بے نقاب رہا وہ بھی اس زمانے میں جب علی گڑھ اپنے طنطنہ و دبدبہ کے نصف النہار پر تھا! جب یہاں دوسرے درجے کی کوئی بات معاف نہیں کی جاتی تھی اور ہر شخص کی ہر حرکت ایسی میزان سے ملتی رہتی تھی جو بڑی ہی بے درد بے خطا تھی۔ ذاکر صاحب کے سب سے بڑے بھائی مظفر حسین خاں مرحوم اور منجھلے بھائی عابد حسین خاں مرحوم کی شرافت، قابلیت اور ذہانت کا اس عہد میں جواب نہ تھا۔ چھوٹے بھائی ؟ خان مرحوم نے فرسٹ ایئر میں وفات پائی اس زمانے کے لوگ اب بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ان سے

معلوم ہوگا کہ ان بھائیوں کا معاصر طلبا اور اساتذہ میں کیا درجہ اور رکھ رکھاؤ تھا۔ —— اور آج تک اس پایہ کے اور طالب علم علی گڑھ سے نکلے یا نہیں!

ذاکر صاحب کے سب سے چھوٹے دو بھائیوں نے ذاکر صاحب ہی کی سرپرستی میں جامعہ میں تعلیم پائی۔ ان میں ڈاکٹر محمود حسین خاں ڈھاکہ یونیورسٹی میں اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں پروفیسر ہیں ان دونوں کی زندگی بھی ہم سب کے سامنے ہے۔ میں ان سارے بھائیوں کو جب ذہن میں لاتا ہوں تو اقبال کا یہ مشہور شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
نگاہ جس کی ہو بے داغ، ضرب ہو کاری

بہ ذات خود میں سمجھتا ہوں کہ وہی شخص کھرا ہے جو علی گڑھ میں کھرا رہا اور وہ یقیناً کھوٹا ہے جو علی گڑھ میں کھوٹا تھا۔

ذاکر صاحب کے زمانے میں بھی طالب علم وہ سب کرتے تھے جو کم و بیش آج کرتے ہیں، لیکن فرق یہ تھا کہ اس زمانہ میں کوئی تحریک یا ہنگامہ خواہ کسی قسم کے طالب علم نے کسی بنا پر اُٹھایا ہو، اس کی سربراہی صرف وہ کرتا تھا جو معاصر طلبا میں اپنی قابلیت، سچائی اور وقار کے لیے مشہور ہوتا۔ اس زمانہ کی روایت یہ تھی کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ایف۔ اے تک کا کوئی لڑکا خواہ وہ کوئی ہو کسی معاملہ میں کوئی دم نہیں مار سکتا تھا۔ تھرڈ ایئر سے وہ کالج کی زندگی میں دخیل ہونا شروع ہوتا تھا۔ اگر وہ کہیں اور سے ایف۔ اے کر کے آیا ہے تو اس کی حیثیت صرف نو وارد یا Fresher کی ہوتی تھی اور اس کا رتبہ قریب قریب ایف۔ اے والوں کا ہوتا اور علی گڑھ میں جو شخص باہر سے بی۔ اے کر کے آیا وہ شاید ہی کبھی 'برادری' کا آدمی سمجھا گیا۔ ذاکر صاحب کسی ہنگامہ کے کبھی بانی نہ ہوئے لیکن ایسا کوئی موقع آجاتا تھا تو تمام طلبا متفق ہو کر انھیں اپنا پیشوا قرار دیتے۔ ذاکر صاحب کی جماعت اساتذہ میں بھی بڑی مان دان تھی۔ اس لیے جب کبھی وہ کسی تحریک کی سربراہی کرتے تو ان کی باتوں کو وقعت دی جاتی اور طالب علموں سے اُکتانے یا بیزار ہونے کے بجائے ارباب حل و عقد ان کے حقوق اور وقار کی اہمیت تسلیم کر لیتے تھے۔

o

1920 میں ہم سب 'صاحب باغ' میں ایم۔اے پریویس اور قانون کے طالب علم تھے۔ قانون کے امتحان مشکل سے 15 دن باقی تھے اور کورس سارے کا سارا کورا تھا۔ کئی دن سے ہم لوگوں کی توجہ اس مصیبت پر مرکوز تھی۔ ذاکر صاحب کہتے تھے پڑھنا تو ہے ہی، چاہے امتحان سے پہلے پڑھا جائے چاہے بعد میں۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ناشتہ اور کھانے کا مکمل پروگرام بنالیا جائے۔

نصیر مرحوم نے پوچھا۔''پروگرام سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

ذاکر صاحب نے کہا۔

''آپ نے دو باتیں ایک ہی سانس میں کیوں پوچھ لیں۔آپ پروگرام کے بارے میں میری ہدایت چاہتے ہیں یا صرف مطلب دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ممکن ہے دونوں ایک نہ ہوں۔''

نصیر صاحب نے ذرا چیں بجبیں ہو کر کہا۔''ذاکر تم پڑھائی میں کھنڈت ڈالتے آئے ہو اور اب بھی اسی کے درپے ہو، اچھا بتاؤ پروگرام اور مطلب میں کیا فرق ہے؟''

ذاکر صاحب نے کہا۔

''پروگرام تو عوام کے لیے بنایا جاتا ہے اور مطلب اپنا ہوتا ہے، پروگرام تو یہ بتائے گا کہ کون کون سی چیزیں کس کس وقت کھانے پر موجود ہوں گی اور مطلب یہ ہے کہ کس کو کیا اور کتنا ملے گا پر یہ بھی تو دیکھیے کھانا تو ہر حال میں ڈائننگ ہال ہی میں ہوگا۔لیکن پروگرام کے ساتھ سے ذرا کھانے والوں کی آبرو بڑھ جاتی ہے!''

بڑی ردّوقدح کے بعد پروگرام بھی بنا اور مطلب کی بھی رعایت رکھ دی گئی۔ پڑھائی شروع ہوئی۔ ہم تین چار آدمی ساتھ پڑھتے تھے۔ذاکر صاحب، میں، سید نصیر الدین علوی مرحوم اور خلیل الدین مرحوم۔ بحث اس پر چھڑی کہ بہ آواز بلند کون پڑھے۔اس پر کوئی نہیں تیار ہوتا تھا۔نصیر مرحوم ہکلاتے تھے ان کو پڑھنے سے معاف کر دیا گیا تھا اور بحث کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔خلیل مرحوم پڑھنے سے شرماتے تھے، ان کا کالج کا نام بھی گلفام ہے۔

میں نے کہا۔''میں پڑھنے کے لیے تیار ہوں، لیکن ذاکر صاحب نے قائم گنج سے جو گھی منگوایا ہے وہ دوپہر اور شام کو دال میں ڈالنے کے لیے دو چمچے زائد لوں گا۔''

نصیر صاحب طیش میں آ کر بولے۔'' ......ہر.........ہر......ہرگز.....نہیں......
میں......پ پ پ...... پڑھوں گا۔''

میں نے کہا۔'' تو پھر تین چمچے لوں گا۔''

ذاکر صاحب بولے۔'' وہ کیوں؟''

میں نے کہا۔'' نصیر صاحب پڑھیں گے تو مجھے ایک چمچہ سر میں بھی ڈالنا پڑے گا۔''

ذاکر صاحب نے کہا۔'' میں پڑھنے کو تیار ہوں لیکن صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ سب سے تین منٹ پہلے کھانا شروع کر دوں گا۔ اس کے بعد آپ لوگ شروع کریں۔'' اس پر ہر شخص بہ یک وقت چیخ پڑا۔

'' ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ ہم پڑھنے کے لیے آئے ہیں بھوکوں مرنا نہیں چاہتے۔''

غرض پڑھائی شروع ہوئی۔ علوی مرحوم اور ذاکر صاحب میں کبھی کبھی قانونی نکتوں پر بڑے لطف کی اور بڑے زور و شور کی بحث ہو جایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ بحث طوالت پکڑ گئی تو علوی مرحوم نے جھنجھلا کر کہا۔'' اس قانون کو بناتے وقت واضع نے غالباً آپ سے مشورہ کر لیا تھا۔''

ذاکر صاحب نے فرمایا۔'' اس نے تو مشورہ نہیں کیا لیکن آپ کو میرا مشورہ یہی ہے!'' اس جملے پر مرحوم کا فرطِ مسرّت سے ناچنا کودنا اور قہقہے لگانا اب بھی یاد آتا ہے۔ صاحب باغ ہی میں ایک صاحب اور تھے جو اپنے آپ کو بڑا قانون داں گردانتے تھے اور قانونی بحثوں میں ہمیشہ کسی نہ کسی ہائی کورٹ کی جدید ترین نظیر پیش کر دیا کرتے تھے۔ ان کے چہرے بشرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی نظیر آسمان سے نازل ہونے والی ہے یا اللہ تعالیٰ نے ان کا رتبہ خاطر میں لائے بغیر ان کو دنیا میں بھیج دیا۔ یہ رات بھر تو قانون پڑھتے تھے، اور دن بھر پڑھنے والوں کے ہاں باری باری پہنچ کر یا تو اونگھتے تھے یا ہر شخص کی قانونی سمجھ کو، ہیچ پوچ ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ہم لوگوں میں بھی آ بیٹھتے تھے، ان کے آ جانے سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ لیکن ذاکر صاحب سب چھوڑ چھاڑ ان کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ اس کا سبب کچھ تو یہ تھا کہ اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح پڑھنے کا سلسلہ ٹوٹے اور کچھ اس سبب سے کہ

ذاکر صاحب کو سر پھرے احمقوں سے یوں بھی بڑی اُلفت تھی اور ان کے ہاں میں ہاں ایسی ملاتے تھے اور اپنی طرف سے ایسی ایسی گڑھتے تھے کہ کوئی ناواقف دیکھے تو ذاکر صاحب کو معلوم نہیں کیا کہے۔

میں نے ایک دن کہا۔ ''ذاکر صاحب اس غریب پر رحم کیجیے اس پر نہیں تو اس کے والدین یا اس کی آئندہ ہونے والی بیوی بچوں پر ترس کھائیے۔ ساری منزلیں تو یہ خود طے کر چکا ہے یہ آپ سہارے دے دے کر اس کو تباہی کے گڑھے میں ہمیشہ کے لیے کیوں گراتے ہیں۔''
ایک روز ہم سب انہماک اور لطف سے پڑھائی میں مصروف تھے کہ یہ آن پہنچے۔ اس دفعہ ذاکر صاحب بھی کسی قدر منغض ہوئے، حسبِ معمول نو وارد نے ایک موقع ڈھونڈ نکالا اور نکتہ چینی شروع کر دی۔ گفتگو ہوتے ہوتے یہاں تک پہنچی کہ نو وارد نے کہا۔

''ذاکر صاحب معاف کیجیے گا آپ اچھی وکالت تو کر سکتے ہیں، لیکن جج یا واضع قانون ہونا بالکل دوسری بات ہے۔''

ذاکر صاحب نے کہا۔ ''یہ آپ واقعہ بیان کر رہے ہیں یا بشارت دے رہے ہیں۔''

انھوں نے ایک ہلکے سے زہر خند کے ساتھ فرمایا۔ ''دونوں'' ذاکر صاحب نے جواب دیا۔ ''میں واضع قانون ہوتا تو آپ یقین فرمائیں آپ دنیا میں سب کچھ کرنے پاتے قانون پڑھنے نہ پاتے اور جج ہوں گا تو آپ کو معذور قرار دے کر آپ کے لیے ہمیشہ عدالت یا حکومت کے خرچ پر کوئی معقول وکیل مقرر کرا دیا کروں گا۔'' علوی مرحوم نے اچھل کر نو وارد کو گود میں لے لیا، اور ان کی ناک کان آنکھ اور گردن کے ہکلا ہکلا کر اتنے بوسے لیے اور ان کو گود میں لے کر اس طرح ناچے کہ سارا صاحب باغ اکٹھا ہو گیا۔ نو وارد نے دوسرے دن بورڈنگ ہاؤس بدل دیا۔

ہمارے کمرے صاحب باغ کی دوسری منزل پر مشرقی سمت واقع تھے۔ سامنے برآمدہ تھا، برآمدے سے اُتر کر لمبا پتلا صحن جہاں ہم سب بیٹھے پڑھنے میں مصروف تھے۔ رات زیادہ آ چکی تھی۔ سامنے درختوں کے تاریک گڈمڈ ہجوم کے ٹھیک اوپر چاند برآمد ہو رہا تھا۔ سب کی نظر بہ یک وقت چاند پر پڑی جو اس درجہ خاموش خوب صورت الگ تھلک اور حزیں نظر آیا کہ

سب کے سب تھوڑی دیر کے لیے دم بخود رہ گئے۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نامعلوم قوت نے یک بہ یک ہمارے حواس سلب کر لیے ہوں اور ہم کو ہمارے گرد و پیش سے اُٹھا کر ایسے عالم میں پہنچا دیا ہو جہاں جسم و جان صرف احساس حسن و سیرت میں جذب ہو کر رہ گئے ہوں۔

ذاکر صاحب کتاب پر جھکے ہوئے تھے۔ دونوں کہنیاں میز پر تھیں اور ہاتھوں کی دو دو اُنگلیوں سے آنکھوں کے پپوٹے یوں کھولے ہوئے تھے جیسے 'بادام' کے عوض آنکھیں نکال کے بھیجنے والے تھے۔

میں نے کہا۔ ''ذاکر صاحب یہ کیا۔ ذرا چاند کی طرف دیکھیے گا۔''

کہیں سے جنبش کھائے بغیر بولے۔

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں

ثاقب لکھنوی کی ایک غزل علی گڑھ کے مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی جس کا یہ شعر بہت مقبول ہوا اور ہر شخص کی زبان پر تھا ملاحظہ فرمایئے۔

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں
ابر بہار جانب کہسار دیکھ کر

سب ہنس پڑے اور منظر کا سحر کافور ہو گیا۔

علوی صاحب نے پوچھا۔ ''ذاکر آخر یہ ہے کیا؟''

کہنے لگے۔ ''نہ نیند مانتی ہے، نہ آپ مانتے ہیں، کروں کیا، نیند آتی ہے پر نہیں جاتی۔''

دوسرے دن ہی طالب علموں کا ایک ہجوم صاحب باغ پہنچا معلوم ہوا کسی مسئلہ پر طلبا نے اجتماعی طور پر احتجاج کیا ہے، اور ذاکر صاحب سے درخواست کرنے آئے ہیں کہ وہ ان کی سربراہی کریں۔ ذاکر صاحب فی الفوران کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ تین چار دن تک ان کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ایک دن یونین کے دارالمطالعہ میں مل گئے۔

میں نے پوچھا۔ ''کیسی رہی؟''

بولے۔ ''بخیریت گذشت۔''

میں نے کہا۔ ''اور جناب پڑھائی؟''

فرمایا۔ ''اس ہنگامے میں جو دل و جان سے منہمک رہا۔ اس کا کچھ تو اجر ملنا چاہیے تھا۔ اللہ نے آپ سے نجات دلائی۔''

''اور کھانا پینا۔'' میں نے پوچھا۔

بولے۔ ''قوم کا کام کرنے والا کبھی بھوکا نہیں مرتا۔''

میں نے کہا۔ ''ذرا احتیاط رکھیے گا۔ قومی کام کرنے والے بھوک سے تو نہیں مرے لیکن ہیضہ میں اکثر مرے پائے گئے ہیں۔''

میں بدحظ ہو کر چلنے لگا تو لپک کر سامنے آ گئے، کہنے لگے۔ ''للہ میرا کہا مان لیجیے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ کیا؟''

فرمایا۔ ''چلیے دلّی چلیں۔''

میں اُکتا گیا، اور بولا۔ ''ذاکر صاحب ہوش میں آیئے۔ امتحان کے گنے دن رہ گئے ہیں۔''

اس بات کو اس طور سے ٹال گئے جیسے اس کی ذرّہ برابر بھی اہمیت نہ تھی، کہنے لگے۔

''پڑھ کے کیا کیجیے گا۔ کھانے کمانے بھر کا پڑھ لیا ہے۔ احمقوں کو مرعوب کرنے کے لیے بی۔ اے کافی ہے۔ بھلے مانسوں میں بیٹھنے کے لیے ہنسنے بولنے کی عادت ڈالنی ہے اس کے لیے دہلی کا سفر ضروری ہے۔''

میں نے کہا، اور سفر خرچ کہاں سے آئے گا؟

بولے۔ ''اس کی پروا نہ کیجیے۔ خالو صاحب کو لکھ دیا تھا کہ کالج میں دق کی شکایت پھیل گئی ہے۔ کچھ روپے اور دیسی گھی بھیج دیجیے۔ گھی تو پہلے آ گیا، روپیہ آج آیا ہے۔ بس دلّی چلے چلیے، شاہ جہاں پوری والے کے ہاں ڈٹ کر کھانا کھایا جائے گا۔ ہندوستانی دواخانہ سے دوائیں خریدی جا سکتی ہیں۔ رات کو واپس آ جائیں گے۔''

میں نہ مانا، ذاکر صاحب بھی دلّی نہ گئے صرف کالج میں جہاں تہاں کھاتے یا گپ کرتے پائے گئے۔ امتحان سے تین چار دن پہلے صاحب باغ کی اُفق پر پھر سے نمودار ہوئے۔ ہم نے ان کی پذیرائی اس طور پر کی جیسے وہ سب کچھ کھو آئے تھے اور ہماری ہمدردی کے مستحق

تھے، اور وہ اس طور سے ملے جیسے انھوں نے ہمارے گناہوں کو معاف کر دیا ہو۔ امتحان ہوا۔ نتیجہ نکلا۔ ہم سب فیل۔ صرف ذاکر صاحب پاس!

O

زندگی میں مجھ پر اکثر ایسا وقت آیا ہے جب دل میں یہ بات آئی کہ قابلیت اور قربانی کا نتیجہ کیا۔ جب ان کو نظر انداز کر کے دنیوی منفعت سے بہرہ وافر مل سکتا ہے دنیا میں کیسے کیسے گھٹیا لوگ کیسے کیسے اعلیٰ مناصب پر فائز ہیں کوئی ان کو بُرا کہہ کر ان کا کیا بگاڑ لیتا ہے۔ محتاط اور ایمان دار رہنا اچھا سہی لیکن آخر ان لوگوں کا بھی تو خیال رکھنا چاہیے جو میری ذات سے وابستہ ہیں اور میرے بعد ان کا کیا حشر ہوگا۔ تھوڑا سا گھٹیا پن کر لینے میں کوئی ہرج نہیں فراغت نصیب ہوگی تو اس کی تلافی تھوڑا بہت دے دلا کر کر دیں گے پھر بھی بہت کچھ بچ رہے گا۔ دیکھتے نہیں نامعقول اہل مناصب بھولے سے بھی کوئی بھلائی کر دیتے ہیں تو کوئی نہیں بھولتا اور ایمان دار و مخلص جسے دولت وشہرت نصیب نہیں تمام عمر دوسروں کے لیے مصائب جھیلتا ہے لیکن اس کی خوبیوں پر اکا دُکا کبھی کبھار صرف ہوں ہاں کر کے رہ جاتے ہیں اور اُکتا کر اس کی یاد سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ اس دنیا میں لوٹ کر آنا نہیں ہے پھر اس کی لذتوں سے محروم رہنا کون سی عقل مندی ہے۔ وہ بھی لذتیں جب کچھ دور نہ ہوں آسانی سے ملتی ہوں اور رسوائی کا کچھ ایسا امکان بھی نہ ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں بزدل ہوں۔ اس لیے بُرائی سے ڈرتا بھاگتا ہوں!

اس کیفیت کا ردّعمل ہوتا ہے اور میرے سامنے ذاکر صاحب آجاتے ہیں۔ میں ان بڑی ہستیوں سے بہتوں سے زیادہ واقف ہوں جن کی خوبی، نیکی اور بہادری سے مذہب تاریخ یا افسانوں کے اوراق لبریز ہیں ان کی شہرت یا برگزیدگی کو میں مانتا ہوں۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان کا اصلی یا فرضی وجود کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں ملتا ہے بلکہ اس کی ایک جھلک مجھے اپنے دوستوں میں ملتی ہے ان دوستوں میں جن کی زندگی کے ہر پہلو سے میں پورے طور پر آشنا ہوں جن کو میں دنیا کے ہر کاروبار میں اسی طرح منہمک پاتا ہوں جس طرح میں خود ہوں جن کے سامنے وہی کمزوریاں یا لذتیں آتی ہیں جو میرے سامنے آتی ہیں وہ ان کو مسکرا کر (ڈر کر نہیں) نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کمزوریوں سے میرا سابقہ ہوتا ہے تو میں اعلانیہ یا چھپ کر ان میں مبتلا ہو جاتا

ہوں اور طرح طرح کے جتن کرتا ہوں اور نظر انداز کر دیتا ہوں تو تمام عمر ان کو حسرت سے یاد کرتا رہتا ہوں۔ لیکن وہ دنیا کو نہ دارالمحن سمجھتے ہیں نہ دار فانی۔ اس کو صرف دنیا سمجھتے ہیں۔ ایسی دنیا جس کو وہ آخرت سے بھی اعلیٰ وارفع بنانے کے لیے حوصلہ رکھتے ہیں۔

مجھے اطمینان ہونے لگتا ہے کہ میں نے اپنے لیے جس زندگی کا انتخاب کیا ہے اس میں خسارہ نہیں ہے۔ میرا جن لوگوں کا ساتھ ہے وہ بُرے نہیں ہیں۔ زندگی کا ماحصل یا انسانیت کا مقصد یہی نہیں ہے کہ آدمی نے جو زندگی یا زمانہ پایا اس کو اپنے حسن خیال یا حسن عمل سے خواہ وہ اتنا کم ہو کہ حساب میں نہ آئے بہتر و برتر بنائے۔ دنیا کو بہتر و برتر بنانے کے لیے لازم ہے کہ انسان خدمت لینے سے زیادہ خدمت کرے۔ یہ وہ عبادت ہے جو اس کو نفس کے تمام ناروا مطالبات سے باز رکھتی ہے اور مسرور مطمئن بناتی ہے۔ ہر وہ بات اور ہر وہ فعل جو انسان کو اس عبادت سے باز یا محروم رکھے ظلم یا گناہ ہے! انسان مال یا کھال ہی میں مست نہیں رہتا کردار میں بھی مست رہ سکتا ہے!

ذاکر صاحب وہ سب کر سکتے تھے اور پا سکتے تھے جو آج کل کے ہمارے بڑے آدمیوں کو نصیب ہے۔ ان کو بڑی سے بڑی نوکری مل سکتی تھی، وہ عوام کو بہکا کر یا بھڑکا کر شریفوں پر دنیا تنگ کر سکتے تھے، اور رشوت لے یا دے کر دولت واقتدار حاصل کر سکتے تھے۔ خدا ورسول کے نام پر خانقاہیں یا یتیم خانے قائم کر کے غریبوں کی کمائی اور ناموس لوٹ سکتے تھے۔ وہ ہر طرح کے فسق و فجور میں مبتلا رہ کر بھی اپنی قوم کے آخری نجات دہندہ قرار دیے جاتے۔

ذاکر صاحب کی ذہنی استعداد جس پایہ کی ہے۔ اس سے ان کے بدترین دشمن بھی انکار نہیں کر سکتے۔ وہ اس استعداد کو اپنے نفس کی خاطر بے لگام کر کے وہ تمام باتیں حاصل کر سکتے تھے جن کو ہم رشک وحسرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک دن وفات پا جاتے ہیں! نفس کے اس بے پناہ عفریت کو جس کے ادنیٰ اشارے پر ہم اپنی ہی نہیں دوسروں کی بھی قیمتی سے قیمتی متاع تلف کر دینے پر آمادہ رہتے ہیں اور اسے نصیبے کی یاوری یا قوم کی بیداری سمجھتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے کس طرح زیر کیا اور کیوں کیا اسے کون سمجھے گا اور کیوں سمجھے گا، جب اس کے سمجھنے سے نجس مقاصد اور ملعون نیتیں بے نقاب ہوتی ہیں!

ذاکر صاحب نے سب سے الگ ہو کر لیکن سب کے لیے جامعہ کی بنیاد ڈالی۔ محنت سہی، بے کسی دیکھی، گالیاں سنیں، رسوائی اُٹھائی، انتظار جھیلا، لیکن منہ نہ موڑا۔ مسکرانے سے باز نہ آئے۔ دشمن سے نہ ڈرے نہ اسے دھتکارا، اس نے مانگا تو دے دیا، اس نے چُرا لیا تو جانے دیا۔ خود سہتے رہے جامعہ کو سپر نہ بنایا، اس کو صرف سنوارا، وہ انتظار کرنے سے گھبرائے نہیں۔ اس لیے کہ اچھے اور بڑے کام کرنے میں انتظار کی منزل سرے سے مفقود ہوتی ہے، انجام کا ڈر نہیں ہوتا۔ کام و انجام ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ انجام یا انعام کا جویا وہ ہوتا ہے جس کو اپنے کام پر نہ ایمان ہو نہ اطمینان سب سے بڑا اور سب سے اچھا انعام وہ ہے جو ہم خود اپنے آپ کو دے سکیں نہ وہ جو دوسرے سے ملے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جامعہ کا پروگرام لمبا ہے۔ اس کے نتائج دیر میں برآمد ہوں گے۔ ملک کے حالات اس کے مقتضی ہیں کہ سیاسی سرگرمیوں میں جلد سے جلد حصہ لیا جائے۔ اس سے یہاں اور فوائد ہیں، وہاں جامعہ کے کاموں کو بھی تقویت پہنچے گی۔ ملک و قوم کی حالت روز بروز دگرگوں ہو تو لمبے پروگرام کو اپنی توجہ و محنت کا تنہا مرکز بنانا مناسب نہیں۔

لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ سیاسی سرگرمیاں بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتیں ان میں صحت اور استواری اس وقت آتی ہے جب ان کی آبیاری کے لیے ہمارے ذہنوں میں صاف اور شفاف پانی کے گہرے اور نہ سوکھنے والے سوتے ہوں۔ یہ سوتے تعلیم ہی سے منکشف ہوتے ہیں اور پیدا بھی۔ بازاروں اور اخباروں میں قومیں بنتی نہیں بدنام ہوتی ہیں۔ تعلیم کو سیاست پر قربان کرنا تنگ نظری اور خود غرضی ہے۔ سیاست کو تعلیم کی باندی ہونا چاہیے۔ تعلیم میں نتائج کی دیر سویر بے معنی کی بات ہے۔

O

اونچے درجے کی تعلیم گاہوں میں معلم اعلیٰ کی حیثیت جس کے سپرد ادارہ کا نظم و نسق بھی ہو دوسرے اداروں کے افسروں کی حیثیت سے بالکل علاحدہ اور مختلف ہوتی ہے۔ تعلیم گاہوں میں ایسے عہدہ کی حیثیت، منصبی نہیں ہوتی، ذہنی اور اخلاقی ہوتی ہے۔ یونیورسٹیوں میں اونچے درجے کا علمی و تعلیمی کام ہوتا ہے۔ یہاں کا ہر معلم اپنے فن کا امام ہوتا ہے۔ خواہ اس کا عہدہ یا اس

کی تنخواہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ ایسی صورت میں لازم آتا ہے کہ افسر اعلیٰ کا ذہنی اور آخری درجہ اپنے ماتحتوں یا ساتھ کام کرنے والوں کے علمی و اخلاقی درجہ سے واضح طور پر بلند نہ ہو تو کم درجہ کا کسی طرح نہ ہو۔ ایسی تعلیم گاہوں میں منصب، دولت، امارت، رسوخ کی کوئی اہمیت نہیں۔ برخلاف سرکاری اداروں کے جہاں منصب ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ کلکٹر ہزار نااہل ہو اور تحصیل دار کیسا ہی قابل کیوں نہ ہو، ہر حال میں اوّل الذکر ہی کو بول بالا رہے گا۔ یونیورسٹیوں میں علمی اور ذہنی صلاحیتوں کا مقابلہ صرف علمی و ذہنی صلاحیتوں سے ہوتا ہے۔ زور بازو سے کام نہیں چلتا۔ یہاں زور بازو یا دخل فضل، سے کام لینا نری حماقت ہے جس کو بڑے سے بڑا معاف کرنے والا بھی معاف کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔

ذاکر صاحب جامعہ کو پچیس سال سے چلا رہے ہیں۔ اس دوران میں جامعہ اور جامعہ میں کام کرنے والوں کو طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں دونوں پر مسلسل اور بے پناہ غیر شریفانہ حملے ہوئے۔ لیکن یہاں نہ کوئی اسٹرائک ہوئی نہ کوئی بددل ہوا نہ جامعہ کو چھوڑ کر شہرت یا روزی کمانے کہیں اور گیا۔ یہاں ایسے لوگ بھی نہ تھے جن پر رزق اور موت کے دروازے بند رہے ہوں اور جامعہ کے علاوہ کہیں اور ٹھکانہ نہ ہو بلکہ ان میں سے اکثر اپنے علم و فضل کے اعتبار سے ایسی شہرت رکھتے تھے کہ ہندوستان کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں ان کی پذیرائی احترام کے ساتھ ہو سکتی تھی۔ یہ صرف ذاکر صاحب کی بلند و برگزیدہ شخصیت تھی جس نے جامعہ کے تار و پود کو نہ صرف بکھرنے سے بچایا بلکہ اس کو مربوط و مستحکم کر دیا۔

جامعہ کا ہر چھوٹا بڑا ہمہ وقت یہ دیکھتا تھا کہ وہ خود کیا ہے اور کیا کر رہا ہے اور ذاکر صاحب کیا ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ سارا قضیہ اسی ترازو میں تل کر ختم ہو جاتا۔ ذہنی قابلیت میں جو شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا۔ ذاکر صاحب کی ذہنی قابلیت کے سامنے سر جھکا دیتا اپنے ایثار، قربانی اور اخلاقی فضائل کا کسی کو خیال آتا تو وہ یہ پاتا کہ ان فضیلتوں میں بھی ترازو کا پلڑا ذاکر صاحب کی طرف جھکتا ہے۔ خاندانی شرافت و نجابت یا سوشل یا سرکاری تعلقات یا رسوخ پر کسی کو ناز ہوتا تو وہ یہ پاتا کہ ان کا سردار خاندانی اعتبار سے بھی زر خالص ہے اور اس کے تعلقات بھی زیادہ وقیع زیادہ مستحکم اور زیادہ وسیع ہیں، محنت کرنے اور فرائض سے عہدہ برآ

ہونے کو دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ ذاکر صاحب جیسا محنت شاقہ کرنے والا اور اپنے فرائض پر آرام و تفریح کو قربان کر دینے والا حلقہ میں ان جیسا کوئی اور نہ تھا کسی کو اپنے ذوق، ذہانت و فطانت کا دھیان ستاتا تو وہ دیکھتا کہ اس وادی میں بھی امام ذاکر صاحب ہی ہیں۔ کلرک یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ کلرکی کرتے ہیں۔ چپراسی یہ پاتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ دوڑ دھوپ اُٹھاتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ بچہ یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب جیسا بچہ کوئی نہیں، جوان یہ محسوس کرتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ جوان ہیں اور بوڑھا یہ دیکھتا کہ جب بڑھاپا ذاکر صاحب کے قریب جانے سے ڈرتا ہے تو پھر وہ بڑھاپے کو کیوں خاطر میں لائے۔

ان کے علاوہ ہر شخص کا عقیدہ تھا کہ ذاکر صاحب دوسروں کے فائدے کے لیے جان کھپاتے ہیں، اس کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد اور اس کی عزّت و فراغت کو اپنی عزّت و فراغت سمجھتے ہیں تو پھر کون ایسا ہو سکتا تھا جو ذاکر صاحب کو چھوڑ کر اپنے ضمیر کی سرزنش گوارا کرتا۔

O

یونیورسٹی میں اچھے اور ذہین طلبا سے ملنے، اور ان کے ساتھ طبع آزمائی کرنے میں جو لذت ہے وہ مجھے کسی اور چیز میں نہیں ملتی۔ اس سے خود طالب علم کو کوئی فائدہ پہنچتا ہو یا نہیں، میں نے ہمیشہ فائدہ اُٹھایا، زندگی کی بعض قباحتوں یا روز روز کی یکسانیت سے جب طبیعت منغّص یا پست ہونے لگتی یا یہ دیکھتا کہ کہنگی اور تھکن میری طرف رینگتی بڑھتی آ رہی ہے تو مجھے یہ ضرورت محسوس ہوتی کہ کسی اچھے اور ذہین طالب علم سے گفتگو کی جائے اس وقت صحیح اندازہ ہو سکے گا کہ میں واقعی حق بخشوا چکا ہوں یا

اب بھی گر پڑ کے ضعف کے نالے
ساتواں آسمان لیتے ہیں

گفتگو کے دوران ہی میں مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ ''غریب نیستم بیمار ہستم''۔[1]

---

1. کابل کے ایک افغان سوداگری کے سلسلے میں ہندوستان کی ایک سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اتفاق سے بیماری نے صاحب فراش کر دیا۔ تمام دن چارپائی پر پڑے رہتے تھے اور بھٹیاری (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اچھی کتاب پڑھنے اور اچھے طالب علم سے گفتگو کرنے کے بعد میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ ذہن میں بالیدہ ہونے، پرواز کرنے اور نئی سے نئی وادیوں سے گزرنے کی استعداد باقی ہے اور دل و دماغ پر تاریکی کے جو بادل چھا گئے ہیں وہ عارضی ہیں دائمی نہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مجھ میں ایک صفت یہ بھی ہے کہ بالعموم ایسے طالب علم کی تلاش میں نہیں رہتا اور خود ایسے طالب علم کے ہاتھ نہیں آتا۔ اس لیے کہ اقبال کے زمانے تک تو نوجوانوں کے اعصاب پر عورت سوار تھی۔ میرے زمانے میں سواری یا کرایہ سستا یا کران پر تسمہ پا لیڈر بھی سوار ہو گئے۔ مجھ میں نہ اتنی سکت کہ میں اس تگڈم کو اپنے اوپر سوار کرلوں دوسری طرف انسانیت گوارا نہیں کرتی کہ میں خود ان پر سوار ہو جاؤں۔

میں اپنے اچھے اور صاحب توفیق طالب علم کو اکثر یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ کبھی کبھی ذاکر صاحب سے ضرور مل آئے اور یہ اس لیے کہ میں جس متاع کو اپنے لیے گراں مایہ سمجھتا ہوں اس میں اپنے ان عزیز طلبا کو بھی شریک کر لینا چاہتا ہوں جن کو عزیز سمجھتا اور محترم گردانتا ہوں۔ بحیثیت ایک معلم کے میرا عقیدہ ہے کہ نوجوانوں کو جتنی صحیح و صالح تربیت بلند و برگزیدہ شخصیتوں سے ملتی ہے اتنی کتابوں اور لکچر سے نہیں ملتی۔ مطالعہ سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے جو بیکار بھی ہو سکتی ہیں اور خطرناک بھی اگر کوئی بڑی شخصیت ان معلومات کو اس طالب علم کے لیے مفید مطلب نہ بنا دے۔

معلومات کی مثال ریگ صحرا سے بھی دی جا سکتی ہے اور بھک سے اُڑ جانے والے مادّے سے بھی، یہ کام صرف اچھے معلم یا رہبر کا ہے کہ وہ ذرّہ سے الماس نکال دینے کی اور بارود سے تباہی کا امکان دور کر کے مفید طاقت حاصل کرنے کی سبیل بتائے۔ کچھ دنوں سے نوجوانوں

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) کچا پکا جو کچھ سامنے رکھ دیتی تھی اسے فرو کر لیا کرتے تھے۔ بھٹیاری دوسرے مسافروں کا بھی کھانا پکاتی تھی اور حسب دستور قدیم کسی کا آٹا کم کر دیا کسی کی روٹی اُڑا دی، کسی کی بوٹی غائب کر دی۔ اس پر مسافروں سے بھٹیاری کی چخ چخ ہوتی، ایک دن بھٹیاری نے ان کو مخاطب کر کے کہا تم لوگ کیسے بڑے ہو کہ جینے نہیں دیتے۔ ایک ان غریب کو دیکھو کہ دن بھر چپ چاپ پڑے رہتے ہیں جو سامنے رکھ دیا شکر کر کے کھا لیا۔ خان سے نہ رہا گیا اُلٹے ہی لیٹے للکارا ''قطامہ ما غریب نیستم بیمار ہستم۔''

میں جو بے راہ روی نظر آ رہی ہے اس کے اسباب بہت کچھ ہو سکتے ہیں، لیکن ایک بات جو مجھے نہایت واضح طور پر نظر آئی وہ یہ ہے کہ طلبا کو زیادہ سے زیادہ اور انواع واقسام کی معلومات فراہم کرنے کی خطرناک حد تک سہولتیں میسّر ہیں۔ لیکن ان معلومات کو ان کے لیے مفید بنانے یا ان کی گزند سے بچانے والے اچھے معلم یا رہبر نہیں ہیں۔ صاحب نظر کے ادنیٰ اشارے سے وہ منزلیں چشم زدن میں طے ہوگئی ہیں جو نظروں سے پوشیدہ رہی ہیں یا جن تک پہنچنے میں صدہا دشواریاں خطرے اور مایوسیاں تھیں۔

طالب علم ذاکر صاحب سے مل کر آتا ہے تو ان کے اور جامعہ کے بارے میں ایسے خیالات تاثرات کا اظہار کرتا ہے جیسے زندگی میں اسے کوئی اچھی اور غیر متوقع چیز مل گئی ہے۔ ذاکر صاحب نے ان طلبا سے مذہب اور سیاست پر کبھی گفتگو نہ کی۔ وہ کہتے تھے کہ ان مباحث پر مولوی اور لیڈر بحث کرنے کے لیے کیا کم ہیں۔ میں تو صرف یہ دیکھتا ہوں کہ طالب علم کے قویٰ ذہنی کس نوعیت کے ہیں۔ اس کے ذہن و اخلاق میں کس نوعیت کا ربط ہے۔ اس نے کیا پڑھا ہے، کن چیزوں سے متاثر ہے، اس میں کیا صلاحیتیں پوشیدہ ہیں وہ اپنی صلاحیتوں کے بس میں ہے یا ان صلاحیتوں کو اپنے بس میں رکھ سکتا ہے۔ اس پر میں اپنا ٹھپّا نہیں لگاتا بلکہ اس کو اپنا ٹھپّا متعین کرنے میں اس کی مدد کرتا ہوں، اور میں جانتا ہوں مرشد کا 'کھل سم سم' یہی ہے!

جامعہ کو دیکھنے کے لیے بڑے سے بڑے ماہرینِ تعلیم اور مبصرین فن وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اس کے بارے میں اچھے سے اچھے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ ایک دن میں نے ذاکر صاحب سے پوچھا۔

''کیوں مرشد! یہ جتنے غریب جامعہ کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں ان کو ساری چیزیں دکھاتا بتاتا کون ہے؟''

فرمایا۔ ''بالعموم میں ہی ہوتا ہوں۔''

میں چپ ہوگیا۔ ذاکر صاحب چونکے اور پوچھنے لگے۔ ''اس سوال کا مقصد کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''کوئی مقصد نہیں، بقول آپ کے میں نے یہ بات محض معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے پوچھ لی۔''

ذاکر صاحب نہ مانے اور بولے۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔ آپ کے ذہن میں حسبِ معمول کوئی فتنہ بیدار ہوا ہے۔ آپ کو بتانا پڑے گا۔''

میں نے کہا۔ ''مرشد! بات کوئی نہیں ہے۔ آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کبھی بہرائچ گئے ہیں!''

بولے۔ ''نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''خیر آپ نے غازی میاں کا میلا تو دیکھا ہوگا۔''

بولے۔ ''جی میں نے دیکھا ہو یا نہیں آپ اپنا مطلب سنائیے۔''

میں نے کہا۔ ''ارے وہی جہاں ڈفالی لہک لہک کر گاتے پکارتے ہیں۔''

اندھے پائیں گے چسم (چشم) کوڑھی پائیں گے سریر (جسم)

میاں سے مرادی مانگ لے

ذاکر صاحب فرطِ انبساط سے اُچھل پڑے اور بولے۔ ''کیا غزل سنائی ہے جھک ماریں تمام دنیا کے شاعر مصلح اور لیڈر اس کے آگے۔ تھوڑی دیر تک اس پر گفتگو رہی اس کے بعد بولے۔

''لیکن اس مبتدا کی خبر تو سنائیے۔''

میں نے کہا۔ ''مرشد! میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر آپ کے ساتھ غازی میاں کے میلے میں دنیا کا بڑے سے بڑا مفکر ہو اور آپ ذرا جی لگا کر اسے یہ بتا دیں کہ یہ میلا نہیں ہے بلکہ اقوام عالم کی پارلیمنٹ ہے جہاں مفکرین و مصلحین اعظم متفق و متحد پا کر انسانیت کو اوج سعادت و کامرانی پر فائز کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں تو وہ بے چون و چرا تسلیم کر لے گا اور تمام عمر اپنی قسمت پر ناز کرے گا کہ آپ کے توسل سے وہ دنیا کے سب سے نئے اور سب سے بڑے اور سب سے مبارک تجربہ سے آشنا ہوا۔''

مرشد نے اس کے بعد کیا کہا اور مجھے کیا سننا پڑا۔ کاش ہم میں سے ہر ایک سنتا۔ لیکن وہ باتیں ایسی نہیں ہیں جو ہر کس و ناکس کو بتائی سنائی جائیں میں البتہ بہت خوش ہوا کہ میرا مقصد پورا ہوا۔ یعنی مرشد پر جلال طاری ہوتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ o

اس تمام داستان کے لکھنے کے بعد مجھے اپنے عزیز و محترم دوست کی ایک تنبیہ یاد آئی۔ ذاکر صاحب پر میں نے وقتاً فوقتاً جو کچھ کہا۔ اس پر میرے ان دوست نے ایک بار مجھ سے کہا۔ ''آپ ذاکر صاحب کے بارے میں یہ کیا اناپ شناپ لکھ ڈالتے ہیں۔ ان کے وقار کا تو لحاظ رکھا کیجیے۔ لوگ ان کے بارے میں کیا خیال کریں گے آپ کو تفریح کی سوجھتی ہے لیکن ذاکر صاحب کی رسوائی ہوتی ہے۔''

میں نے عرض کیا۔ ''آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ نے ذاکر صاحب کے وقار کا تو لحاظ رکھا اور میرے وقار کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ آپ کے بارے میں تو مجھے معلوم نہیں کہ آپ ذاکر صاحب کے وقار کو کن باتوں پر مبنی سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک تو ان کا وقار ان ہی باتوں پر مبنی ہے جو میرے ذہن و دماغ میں میرے ارادے سے بے نیاز باہزاراں شیوۂ دلبری بے محابا و بے حجاب آتی ہیں اور نوک قلم سے ٹپک پڑتی ہیں۔

''یہ باتیں نہ میری ہیں نہ ذاکر صاحب کے لیے ہیں۔ معلوم نہیں کس کی ہیں اور کس کے لیے ہیں۔ لیکن ہیں سب کچھ!''

الٰہ آباد کا سفر تھا، ہندوستانی اکیڈمی یو پی سے ذاکر صاحب نے معاہدہ کر لیا تھا کہ معاشیات پر وہ ایک مقالہ پڑھیں گے۔ ذاکر صاحب دلّی سے روانہ ہوئے۔ میں علی گڑھ سے ساتھ ہو لیا۔ انٹر کلاس میں ذاکر صاحب ملے میں بھی جا بیٹھا، بڑی بھیڑ تھی۔

بولے۔ ''رشید صاحب معاملہ دگرگوں معلوم ہوتا ہے۔ مقالہ لکھا نہیں ہے خیال تھا رات بھر کا سفر ہے۔ ریل میں بیٹھ کر لکھ ڈالوں گا اب تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبح تک زندہ ہی نہ رہیں گے۔ پھر کیا ہوگا؟''

میں نے کہا۔ ''مرشد! فکر کی بات نہیں ہے چلیے سکنڈ کلاس میں چلیں۔''

بولے۔ ''اور کرایہ؟''

میں نے کہا۔ ''روپے تو میرے پاس بھی نہیں ہیں۔ لیکن یہ علی گڑھ ہے۔ آپ اُتریں تو روپے کا کوئی انتظام کر لیا جائے گا۔

ہم دونوں اسباب اتروا کر سکنڈ کلاس کی طرف چل نکلے، پلیٹ فارم پر پہلے شناسا کو میں نے دونوں ٹکٹ دیے اور یہ کہہ کر کہ اسے بدل کر سکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ لایئے اور روپے میرے گھر جا کر لے لیجیے گا۔ ہم دونوں سکنڈ کلاس میں جا بیٹھے۔ ٹکٹ مل گئے تو مرشد نے کہا۔

''اس سے کیا ہوتا ہے کچھ زائد روپے بھی تو درکار رہوں گے۔ سفر میں ٹکٹ کلکٹر ہی نہیں ہوتے خوانچے والے بھی ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کھانا میرے ساتھ ہے۔''

اُکتا کر بولے۔ ''وہ میں جانتا ہوں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ خوانچہ والے کی بھی تو دل داری کرنی پڑے گی۔''

میں نے کہا۔ ''اس کی ذمہ داری بھی میں لیتا ہوں لیکن ایک شرط ہے۔''

بولے۔ ''وہ کیا؟''

میں نے کہا۔ ''دہی بڑے نہیں خریدے جائیں گے۔ کابلی چنے والا پاس نہ آئے گا۔ کتاب اور اخبار والے کی طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھئے گا اور سب سے بڑی اور پہلی شرط تو یہ ہے کہ آپ کمپارٹمنٹ میں نہ چھوٹے بچوں سے یارانہ کریں گے اور نہ کسی احمق سے اس طور پر گفتگو کریں گے کہ عمر بھر وہ اپنے آپ کو افلاطون سمجھتا رہے۔''

بولے۔ ''سب منظور۔''

تھوڑی دیر بعد بولے۔ ''رشید صاحب کھانا تو کھا ہی لیا جائے۔ ورنہ دھیان بٹا رہے گا۔ ایسی حالت میں سنجیدگی اور خلوص سے گفتگو نہیں کی جا سکتی۔'' کھانا نکالا گیا۔ اتنے میں ہاتھرس کا اسٹیشن آ گیا۔ چاقو بیچنے والا گزرا تو بولے۔ ''ایک چاقو کیوں نہ خرید لیا جائے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ کیوں؟''

بولے۔ ''ہاتھرس کے چاقو ہاتھرس سے باہر تو اکثر خریدنے کا اتفاق ہوا خود ہاتھرس میں خریدنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔''

کھانے سے فارغ ہو کر اطمینان سے بیٹھے تھے کہ ٹونڈلہ آ گیا۔

میں اوپر کی برتھ پر بستر درست کر کے نیچے آیا۔ کیا دیکھا کہ مرشد دال موٹھ اور پیٹھے والے سے سودا چکار ہے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''یہ کیا؟''

بولے۔ ''کچھ نہیں۔ معلومات میں اضافہ کرر ہا ہوں۔ آپ بھی آجایئے۔''

یہ سماں دیکھ کر میرا دل بھی پسیجنے لگا۔

مرشد بھانپ گئے۔ بولے۔ ''سفر طویل ہے۔ معلوم نہیں کیسے کیسے نامعقول لوگوں سے راستہ میں سابقہ پڑے۔ ایسی حالت میں اعتماد و تقویت کا کچھ نہ کچھ سامان کر لینا چاہیے، میں کب کہتا ہوں کہ ہر چیز کھا لینے ہی کے لیے خریدی جاتی ہے۔ لطف ہم رہی کے لیے بھی تو خریدی جاسکتی ہے۔''

دال موٹھ اور مٹھائی خرید لی گئی۔

پھر بولے۔ ''آیئے تھوڑا سا ان کو جھوٹا بھی کر دیں۔ ورنہ ارواح خبیثہ کا ان پر سایہ ہو جائے گا۔'' یہ مرحلہ بھی طے ہوا تو میں نے کہا۔ ''مرشد! مزید خرافات ختم اب مقالہ لکھنا شروع کیجیے۔

بولے۔ ''بیٹھیے بھی، آرام کی جگہ ملی ہے۔ خوب کھا پی لیا ہے۔ موسم کتنا معتدل اور سماں کتنا متوازن ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تو پھر۔''

بولے۔ ''جی میں آتا ہے کہ کنجشک ہوں!''[1]

اس پر ہم دونوں ہنس پڑے، دیر تک اس زمانے کی یاد کرتے رہے۔ جب یہ اشعار خاص خاص موقعوں پر پڑھے جاتے تھے اور لطف اُٹھایا جاتا تھا۔ بالآخر میں نے کہا۔

---

1 زمانہ طالب علمی میں علی گڑھ میں ذاکر صاحب نے ایک بار ہندوستان میں ایک کابلی کے (اللہ بہتر جانتا ہے) تصنیف کردہ کچھ اشعار سنائے تھے جو بہت مقبول ہوئے اور زبان زد ہو گئے تھے وہ اشعار یہ ہیں:

خوشے انگر (انگور) کے لگے ہوں گے	پانی نہروں میں بھرے ہوں گے
جی میں آتا ہے کہ کنجشک بنوں	اُڑ کے پچھو (پہنچو) اپنی ولایت

''مرشد! اب تفریح ہو چکی بس مقالہ لکھنا شروع کر دیجیے، اور میں جا کر سوتا ہوں۔''

مرشد نے کہا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ سوئیں اور میں جان کھپاؤں اچھا میں لکھتا جاؤں اور آپ پڑھتے جائیں۔''

میں نے کہا۔ ''اس سے کیا فائدہ؟''

بولے۔ ''اس سے میرا لکھنے کا مومینٹم (Momentom) قائم رہے گا۔ موقع موقع سے جہاں تہاں آپ 'اندوہ گیںیاں'[1] وغیرہ بڑھا دیجیے گا۔

---

1 طالب علمی کے زمانے کی بات ہے۔ میں ذاکر صاحب اور مولانا سہیل ساتھ تھے مولانا شاعری کرتے تھے اور میں گل منزل پر مضامین لکھتا تھا۔ ایک دن ذاکر صاحب نے کہا کہ وہ بھی کچھ لکھنا شروع کریں گے بشرطے کہ ان کو مضمون کے دو چار عنوان بتا دیے جائیں۔ کئی دن تک عنوان کے چکر میں رہے۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ لائبریری سے افلاطون کی (Plato's Republic) (ریاست) لیے آ رہے ہیں۔ فرمایا عنوان نہ بتائیے۔ آپ لوگوں کی ضد میں ترجمہ کروں گا۔ چند ہی دنوں میں کافی ترجمہ کر ڈالا۔ ترجمہ بے نظیر تھا اس کی ایک مختصر سی داستان ہے۔ مولانا سہیل اس زمانہ میں کالج میں جو ذہانت، شاعری، تقریر، قابلیت میں سے اونچے سمجھے جاتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ کالج میں فتنہ نمبر 1 بھی خیال کیے جاتے تھے۔ اس زمانے کا بڑے سے بڑا فرعون بھی خواہ وہ کسی فن کا فرعون، ہامان یا شداد نہ ہوتا تو مولانا کے سامنے کان پکڑ کر کہتا ''یا اُستاذ'' ایک دن ذاکر صاحب نے مولانا کو یا مولانا نے ذاکر صاحب کو دھر لیا۔ ترجمہ سنانے کا اہتمام ہوا۔ مولانا ایک کرسی پر اُکڑوں پاؤں بیٹھے اور اس پر بھی مطمئن نہ ہو کر اپنی کہنیوں کو رانوں کے درمیان کر کے ہتھیلی اور انگلیوں پر رخساروں سے یوں چپکا دیا جیسے کسی شلف میں کتابیں جما دی گئی ہوں۔ صرف ناک آنکھیں اور پیشانی گرفت سے آزاد تھیں۔ منہ میں پان بھرا ہوا تھا۔ اس دھج اور اہتمام سے مولانا صرف کسی بڑے ہی مسئلے پر سوچنے کے لیے رونق افروز ہوا کرتے تھے۔

میں انگریزی پڑھتا جاتا۔ ذاکر صاحب اس کا اُردو ترجمہ سناتے جاتے، مولانا کے چہرے پر شوخی پھیلتی نکھرتی جاتی تھی کچھ دیر بعد ذاکر صاحب اُکتا گئے۔ اور بولے ''پانی'' میں نے کتاب بند کر دی۔ مولانا کرسی پر سے اُترے اور کمرے سے نکل کر باہر پیک ڈالی۔ واپس آئے تو اعصاب کا سارا تناؤ ختم ہو چکا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے جھکے ہوئے، لیکن ایک لرزش خفی کے ساتھ شاداں وفرحاں کمرے میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس پروگرام پر تھوڑی دیر تک عمل رہا پھر میں سو گیا۔ صبح اُٹھا تو مرشد غالباً دس صفحے فل اسکیپ کے لکھ چکے تھے۔ میں اسے پڑھ گیا۔

کہنے لگے۔ ''آج کے لیے کافی ہو گیا۔ کل کے لیے پھر لکھوں گا۔''

پھر بولے۔ ''آپ نے دیکھ لیا، کیا پایا؟''

میں نے کہا۔ ''مرشد! کیا کہنے، کمال کیا ہے۔''

بولے۔ ''نہیں سچ بتائیے۔ کیسا رہا، کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کیجیے۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں مرشد! ایمان سے کہتا ہوں خوب لکھا ہے دوران مطالعہ میں اکثر مقامات ایسے آئے جہاں میں نے بڑی حسرت سے یہ محسوس کیا کہ بس میرے میں ذرا سی عقل اور ہوتی تو میں یہ بھی سمجھ جاتا۔''

الٰہ آباد میں اس مقالہ کی دھوم مچ گئی۔ بڑے سے بڑا افلاطون جمع تھا ہر ایک یہ کہتا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو جیسا سنا تھا اس سے بھی اونچا پایا۔

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) داخل ہوئے اور فرمایا۔ ''ذاکر شاد باش و شاد زی'' ظالم غضب کرتا ہے افلاطون کو اُردو آتی تو وہ بھی یہی زبان اختیار کرتا۔ کم بخت بیماری نے کہیں کا نہ رکھا ورنہ میں بھی ایسا ہی ترجمہ کرتا۔ میں نے کہا۔ ''مولانا پھر تو افلاطون کا بھی بیچ نہ ہوتا۔'' مولانا ہنسے اور جھولنے لگے۔ لیکن اس طور پر کہ افلاطون کی توہین کا مطلق خیال نہ تھا صرف اپنی دل دہی مقصود تھی۔

ذاکر صاحب نے میری طرف ''رقیبانہ دیدۂ ہیچ نگفتہ'' میں نے کہا۔ ہاں ذاکر صاحب، گلا کن نے کہا۔ ''پھر''؟ ذاکر صاحب جھنجھلا سے گئے بولے۔ ''مولانا یہ سب تو ہوا لیکن یہ رشید صاحب اندوہ گیپیاں، شہنائیاں وغیرہ کیسے لکھ ڈالتے ہیں، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔'' مولانا میری طرف دیکھ کر ہنس پڑے اور بولے۔ ''خوب کہا یہ لکھنے والے کی نارسائی کی دلیل ہے۔'' میں نے کہا۔ مولانا آپ ذاکر صاحب سے ڈر گئے ورنہ یقیناً صرف اتنا ہی کہتے ''نارسائیاں ہیں۔'' غرض بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن یہ لفظ ''اندوہ گیپیاں'' اس دن سے چل پڑا اور جہاں کسی کی شاعری عشق یا حلیہ پر جلد سے جلد اور مختصر سے مختصر الفاظ میں تبصرہ کرنا ہوتا اس لفظ کو قولِ فیصل سمجھا جاتا۔ ''یعنی کچھ دخل اندوہ گیپیاں رہے۔''

●●●

یادِ یارِ مہرباں آید ہمی!

کسی شخص کو مشکل سے یقین آئے گا کہ ذاکر صاحب اکثر تندرستی سے زیادہ علالت کے زمانے میں لکھنے پڑھنے کا کام اور کھانے پینے کا انصرام کرتے ہیں، ملنے جائیے تو آپ کا سابقہ دونوں سے ہوگا یعنی موصوف نے کیا پڑھا ہے اور آپ کو کیا کھانا ہے۔ یہاں تک غنیمت ہے۔ مشکل اس وقت آن پڑتی ہے جب وہ کھانے کے دوران میں یہ بھی پوچھ لیتے ہیں کہ آپ نے کیا پڑھا ہے۔ ذاکر صاحب کو دھوکا دینا مشکل ہے اس لیے کہ اوّل تو جی نہیں چاہتا کہ ان کو دھوکا دیا جائے۔ ایسا کرنے میں قباحت یہ ہے کہ وہ دھوکے میں آئے نہیں لیکن آپ اس دھوکے میں رہتے ہیں کہ وہ آ گئے! آپ ان سے جو کام لینا چاہیں وہ دھوکا دیے بغیر زیادہ آسانی سے لے سکتے ہیں۔ چنانچہ کوئی شخص کج نہاد نہیں تو احمق ضرور ہے اگر وہ ذاکر صاحب کو دھوکا دینے کے دردسر میں مبتلا ہونا چاہتا ہے!

کھانے اور بات چیت سے فارغ ہو کر آپ رخصت ہوتے ہیں تو کبھی کبھی کچھ اس طرح کا احساس ساتھ لے جاتے ہیں کہ کھانا پینا تو ٹھیک رہا گفتگو ذرا ٹھیک نہ رہی! چنانچہ ایسے لوگ جو اپنے کام میں کم بصیرت رکھتے ہیں یا دل نہیں لگاتے ذاکر صاحب سے ملنے کا ارادہ بھی کم ہی کرتے ہیں؟

ایک بار معالج نے مرض کی طرف سے بہت کچھ ''ذرا دھتکار کر'' کئی ہفتے مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ اس مشورے پر عمل اس طرح کیا گیا کہ موصوف نے تصوف پر فارسی اُردو کی کوئی درجن بھر ضخیم کرم خوردہ کتابیں جو بادامی سے زیادہ بادامی اور بودے کاغذ پر نول کشور پریس کے شاید ابتدائی دور میں شائع ہوئی تھیں اور کسی بڑے ہی اناڑی دفتری نے ان کی جلد باندھی تھی یونیورسٹی لائبریری سے منگا کر رات کے تین تین بجے تک پڑھ کر ختم کر دیں۔ ساتھ ہی ساتھ فرصت کے اوقات میں کافی تیار کرنے کی جتنی ترکیبیں ادھر اُدھر سنی یا کتابوں میں پڑھی تھیں ان کو اپنے سامنے تیار کراتے رہے اور ان پر عبور پانے کے بعد اس مہم میں جتنے تیماردار شریک تھے ان کو بڑے اہتمام سے کافی ''بہ نسخہ ہائے نو بہ نو'' اور اس سے متعلق اور غیر متعلق جو ''مقویات'' ہوتی ہیں وہ سب پلاتے کھلاتے رہے۔ بیچ بیچ میں شرکاءِ مجلس کے ذہن و ظرف اور موقع و محل کے اعتبار سے تصوف اور صوفیوں کے اسرار و رموز بھی واضح کرتے ہیں!

O

ذاکر صاحب کو کن باتوں سے دلچسپی ہے اس کا پتہ لگانا آسان ہے اس لیے کہ ان کو ہر چیز سے دلچسپی ہے۔ کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جو اپنے گرد و پیش اور نزدیک و دور کی ہر طرح کی معمولی و غیر معمولی چیزوں اور باتوں سے اتنی بھرپور دلچسپی رکھتے ہوں جتنی کہ وہ، ان کی یہ صلاحیت ان کی سیرت و شخصیت کے بہت سے اہم دل کش پہلوؤں کو برافگندہ نقاب کرتی ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ کسی حال میں امید و اخلاق کا دامن نہ خود چھوڑتے ہیں نہ دوسرے کو چھوڑنے دیتے ہیں!

اشیاء اور واقعات سے بچوں کا سا شوق اور تجسس ذہین اور عالی ظرف افراد میں بڑے دوررس نتائج کا باعث بن جاتا ہے۔ یہ بات یا اس طرح کی باتیں کسی معمولی آدمی کے حصے میں آجائیں تو وہ کہیں کا نہ رہے۔ لیکن ذاکر صاحب کا ذہن اتنا ہمہ گیر اور ان کا ذوق اتنا رچا ہوا ہے کہ وہ فطرت کی اس گراں بہا استعداد سے پورے طور پر فائدہ اُٹھاتے ہیں اور فائدہ پہنچاتے ہیں۔!

ذاکر صاحب کو تمام عمر دشواریوں میں کام کرنا پڑا اور دشواریوں ہی سے کام لینا پڑا۔ اچھے اور بڑے کام کی مشکلات اُٹھانے اور اُٹھاتے رہنے سے انسان کی بعض غیر معلوم

وغیر معمولی ذہنی و روحانی صلاحیتیں بر سر کار آ جاتی ہیں۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ ذاکر صاحب کو ذاکر صاحب بنانے میں ان دشواریوں کا بڑا دخل ہے جن میں انھوں نے اب تک کام کیا ہے! ذاکر صاحب میں فطرت کی طرف سے امید اور حوصلے کی استعداد غیر معمولی لوگوں سے بھی کچھ زیادہ ہی ارزانی ہوئی ہے دوسروں کو امید اور حوصلہ دلانا ہوتا ہے تو ان میں یہ صلاحیت اور زیادہ توانا ہو جاتی ہے!

O

چند دنوں کی بات ہے رفقائے شعبہ کے ذہن میں ''علی گڑھ ہسٹری آف اُردو لٹریچر'' کی تالیف کا خیال آیا، چنانچہ ایک اسکیم کا خاکہ تیار کر کے ذاکر صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا اور جیسا کہ موصوف کا ''اسٹائل'' ہے کچھ مجھ پر کچھ اسکیم پر کچھ بیماری میں علاج اور کھانے پینے کی احتیاط پر جرح و تنقید شروع کر دی میں بھی بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے! آخر میں وہی ہوا جو پہلے سے جانتا تھا۔ ذاکر صاحب نے ہم سب سے بڑھ کر اسکیم کا خیر مقدم کیا اور فرمایا اہتمام شروع کر دیجیے، اخراجات کا انتظام ہو جائے گا چنانچہ حکومت نے اسکیم منظور کر لی اور سارے مراحل طے پا گئے!

یہ تو ایک معمولی سی مثال تھی ورنہ ذاکر صاحب کے عہد میں اس طرح نیز دوسری نوعیتوں کے توسیعی اور تعمیری منصوبے مختلف شعبوں اور مصلحتوں سے مسلسل آتے رہتے موصوف اپنا تھوڑا سا بھی اطمینان کر لینے کے بعد اور کبھی کبھی محرک کی ہمت افزائی کی خاطر مجوزہ منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی منظوری دے دیتے۔ کام یہاں پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتا تھا بلکہ مجوزہ سے زیادہ موصوف اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لیے سرگرم سعی ہو جاتے!

ذاکر صاحب نے کسی شعبہ یا محکمہ کی اصلاحی یا توسیعی اسکیم کو مسترد نہیں کیا خواہ وہ معمولی اخراجات پر مشتمل ہوتی خواہ کثیر پر یہی اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کی کوشش اس شوق اور حوصلہ سے کرتے جیسے اس اسکیم کے مصنف اور کار پرداز بھی خود تھے۔ ہم میں سے کسی کی کوئی کتاب 'زیور طبع سے آراستہ' نہ ہو پاتی تو کہیں نہ کہیں سے روپے فراہم کر دیتے یہ نہ کر پاتے تو اپنی جیب سے ادا کرتے اور کبھی کبھی اچھی خاصی بڑی رقم! میرا خیال ہے کہ

ذاکر صاحب کے زمانے میں کسی کی کوئی کتاب اس وجہ سے چھپنے سے نہیں رہ گئی کہ اس پر جتنی لاگت آنے والی تھی اس کا مصنف انتظام نہ کر سکتا تھا!

یہ سب اس کے علاوہ تھا جو وہ معلوم نہیں کتنے نادار طلبا اور کبھی کبھی ان کے والدین یا سرپرستوں کی طرح طرح کی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے اپنے پاس سے روپے دیا کرتے تھے۔ ڈیوٹی سوسائٹی کی طرف سے اکثر عرض کیا گیا کہ جیب خاص سے دی ہوئی رقوم کی بازیافت کے لیے حسب دستور انجمن سے کوئی دستاویز نکالی جایا کرے تاکہ وصول شدہ رقم دوسرے مستحق طلبا کو دی جا سکے اس طرح ڈیوٹی کی بھی مدد ہو جایا کرے گی لیکن موصوف نے اس تجویز کو منظور نہ کیا!

O

ذاکر صاحب جس زمانے میں وائس چانسلر ہو کر تشریف لائے یونیورسٹی تقسیم ملک کے اندوہ ناک نتائج سے دوچار تھی۔ یونیورسٹی میں، یونیورسٹی سے باہر دور اور نزدیک چاہے کسی حیثیت کا آدمی ہو جو کچھ جی میں آتا سنا کر اور ایک طور پر ہم سے ''نیک چلنی کی ضمانت'' لے کر چلا جاتا تھا، اخبارات میں کونسل میں جلسوں میں ہمارا ہی ''ذکر خیر'' ہوتا تھا۔ خطرے اور خواری کے وہ دن اب تک یاد ہیں۔

ذاکر صاحب کے آتے ہی ایک صبح ایسا معلوم ہوا جیسے ساری فضا صاف روشن اور خوش گوار ہو گئی ہو۔ اس کے بعد معمولی اور اوسط درجے کے لوگوں کے ''نزول اجلال'' کا سد باب تو خود بہ خود ہو گیا۔ پھر یہ ہوا کہ بڑے سے بڑے آدمی بھی دنیا کے کسی گوشے سے آئے کسی فن کے امام ہوئے، سب سے پہلے انھوں نے رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد!، ذاکر صاحب کو نذر عقیدت پیش کی ادارہ کی خدمات اور خوبیوں کا اعتراف کیا اور رخصت ہوئے تو کچھ اس طرح کا احساس لیے ہوئے جیسے وہ ایک بڑے شخص اور بڑے ادارے سے مسرور و مفتخر ہو کر جا رہے ہیں!

ہم میں سے بہتوں کو وہ دن یاد ہو گا جب مہاشے ونوبا بھاوے کا اسٹریچی ہال میں خیر مقدم کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کے خلاف جھوٹی خبریں بھیجنے اور پھیلانے والوں

کو ڈانٹا تھا اور کس سچائی سے کیسے وقار سے کتنے کھرے الفاظ اور نذر رلب ولہجہ میں یونیورسٹی کی پوزیشن واضح کی تھی! ذاکر صاحب پر وہ جلال، مہاشے ونوبا بھاوے کی پر تقدس وتمکین موجودگی ہال کے چپے چپے کا طلبا واسٹاف اور شہر کے اکابر سے بھرا ہونا، موقع اور زمانے کی نزاکت۔ مجمع پر سکوت کی ایک پر اسرار گرفت، مختصر یہ کہ گذشتہ 36-35 سال میں اسٹریچی ہال میں ایسی میٹنگ کم سے کم میری نظر سے نہ گزری تھی!

اس تقریر کے بعد پھر جب تک ذاکر صاحب نے یونیورسٹی سے اپنی علاحدگی کا اعلان نہیں کر دیا اشرار وانفار کے زبان وقلم کے فتنوں سے ہم اور ہماری یونیورسٹی نہ صرف محفوظ رہی بلکہ ہر جگہ اور ہر موقع پر یونیورسٹی اسٹاف اور طلبا کے بارے میں تحسین وتہنیت ہی کے کلمے سنے گئے! ذاکر صاحب کے اس احسان خدمت یا کارنامے کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو اس ادارے کے ناکسی ونامرادی کے وہ دن دیکھ چکے ہیں جس کا ذکر اوپر آیا ہے!

O

ذاکر صاحب کے وائس چانسلر ہونے سے پہلے اپنا کچھ ایسا حال تھا کہ ملک یا ملک سے باہر کا کوئی مشہور شخص یا اپنے فن یا مسلک کا کامل آجاتا تو یہ فکر دامن گیر ہوتی کہ مہمان کی رفاقت یا راہ نمائی کے لیے کسی شخص کا انتخاب کیا جائے تاکہ ہمارا بھرم قائم رہے اور مہمان خوش و مطمئن اور اس ادارے کی خوبیوں کا معترف ہو کر رخصت ہو۔ بات یہ ہے کہ اتنے دنوں سے اپنی یونیورسٹی کو یونیورسٹی کے درجہ سے گرتے اور طرح طرح کی فضیحتوں سے دوچار ہوتے دیکھ چکا تھا کہ آپ اپنی نظر میں سبک ہو چلا تھا اور کچھ اس طرح کا احساس ہونے لگا تھا کہ اپنی روایات اپنی قوم اپنی یونیورسٹی یہاں تک کہ اپنے بزرگوں عزیزوں اور دوستوں کے بارے میں محبت اور عظمت کی جو رائے رکھتا تھا وہ شاید ایک خود فریبی تھی جس نے میرے احساسات کے احترام میں خوش عقیدگی کا جامہ پہن لیا تھا!

لیکن جب ذاکر صاحب آ گئے، تو ایک ایک کر کے میری تمام خوش عقیدگیوں کی تصدیق ہونے لگی اور ایک دفعہ پھر وہی کالج والی طالب علمانہ یا طفلانہ اسپرٹ عود کر آئی کہ کاش کوئی بڑا آدمی آئے اور ہم کو، ہمارے ادارہ کو اور ہمارے بڑے آدمی کو دیکھے۔ چنانچہ اس سات

آٹھ سال میں جب تک ذاکر صاحب یہاں رہے جب کبھی یہ سنتا کہ فلاں بڑا آدمی آ رہا ہے اور اس زمانہ میں کتنے بے شمار منتخب روزگار یہاں آئے تو دل خوش ہو جاتا تھا اور حوصلہ بڑھ جاتا تھا اس لیے نہیں کہ وہ بڑا آدمی تھا بلکہ اس لیے کہ ہم کو اپنی بڑائی ثابت کرنے کا موقع ملے گا... چنانچہ یہ یقین رہتا تھا کہ مہمان کسی اعتبار سے کتنا ہی عظیم المرتبت کیوں نہ ہو ذاکر صاحب اس سے مل لیے اور گفتگو کر لی تو وہ ہمیشہ ہمارا، ہمارے ادارہ کا اور ہم جس بات کی نمائندگی کرتے ہیں اس کا ثنا خواں رہے گا!

ذاکر صاحب نے یہ روایت طالب علمی کے عہد سے قائم رکھی ہے۔ اس زمانہ میں کبھی یونین میں تقریر کرنے کسی اعتبار سے کوئی یگانۂ روزگار یا یکتائے فن آ جاتا تو ہم سب کو بڑی خوشی ہوتی کہ مہمان محترم کا سابقہ ہمارے ایک ایسے ساتھی سے ہوگا جو تقریر ہی کے فن پر نہیں بلکہ مطالعہ و معلومات، ذہانت و خطابت اور شرافت و شگفتگی کے اعتبار سے بھی کالج کا گل سر سبد تھا!

o

ذاکر صاحب ہندوستانی پکے گانے اور مصوری کے جدید اسالیب و رجحانات کے بڑے قدر دان ہیں۔ ہندوستانی موسیقی کے علاوہ یورپین موسیقی کے بھی دل دادہ ہیں۔ ہم میں کم لوگوں کے پاس ہندوستانی اور یورپین موسیقی کے ماہرین کے ایسے منتخب گراموفون ریکارڈس موجود ہوں گے جتنے ذاکر صاحب کے پاس۔ علم و فن کے باکمالوں کو علی گڑھ میں جمع کرنے کی ذاکر صاحب کو بڑی فکر رہتی تھی اکثر کہا کرتے ہیں ایسا ہو سکتا کہ ہندوستانی ساز اور موسیقی کے منتخب روزگار علی گڑھ میں اکٹھا کیے جا سکتے۔ باکمالوں کی جگہ نوجوانوں میں ہے!

جدید مصوری سے میری مراد رنگ خطوط اور زاویوں کا وہ ابہامی یا ایمائی طوفان و تہلکہ ہے جو باوجود کوشش کے میرے "تخمین وظن" کے خس و خاشاک کے قابو میں کچھ نہ آیا اور کیوں آئے جب دریا بہ وجوہ خویش موجے دارد! ذاکر صاحب نے اس طرح کے مصوری کے نادر اور نمائندہ نمونے جمع کیے ہیں جن میں سے دو ایک دیوار پر آویزاں تھے۔ کبھی کبھی میری نگاہ ان پر جا پڑی اور ذاکر صاحب کی مجھ پر تو ایک لمحہ کے لیے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ہم تینوں یعنی ذاکر صاحب میرے اور تصویر کے اکسپرشن (Expressions) ایک جیسے ہو گئے ہوں!

جدید مصوری اور میرے درمیان اس طرح کی جو دیرینہ بدگمانی چلی آتی تھی اس کا احساس کر کے ذاکر صاحب نے ایک مشہور اور مستند مصنف کی کتاب مطالعہ کے لیے مرحمت فرمائی اس بشارت کے ساتھ کہ اس کے مطالعہ کے بعد جدید مصوری کے پرکھنے اور پسند کرنے میں سہولت ہوگی۔ کتاب پڑھ کر واپس کی تو میرے تاثرات دریافت کیے۔ میں نے عرض کیا کہ اس کتاب کے مصنف پر میرے کچھ 'اخلاقی' اعتراضات ہیں اوّل تو معلوم نہیں کیوں اور کیسے اسے میری طرف سے سوءِ ظن ہے کہ میں اس کی باتوں پر دھیان نہ دوں گا اس لیے اچھی خاصی سمجھ میں آنے والی بات بھی ڈانٹ ڈانٹ کر سمجھاتا ہے جیسے کچھ اس طرح کا مطلب ہو کہ نہ سمجھوں تو بھاڑ میں جاؤں!

دوسرے یہ کہ اس نے آرٹ کے بڑے نازک بلیغ نکتے واضح کیے ہیں، جن کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن ثبوت یا مثال میں جب وہ انھیں 'شاہکاروں' کا حوالہ دیتا ہے جن سے میں 'رنج ہوں' یا جن پر وہ نکتے مرکوز ہیں یا جن میں سے چند آپ کی مشیت میں ہیں تو میں جہاں کا تہاں رہ جاتا ہوں! میں جسے 'بنائے مخاصمت' بتاؤں مصنف اپنے لیے اس کو 'سند جواز' قرار دے تو انصاف کیجیے ''مردِ نادان'' کدھر جائے جس کی نہ بھرتری ہری سنتے ہیں نہ ڈاکٹر اقبال۔

ذاکر صاحب کے چہرہ پر شکن نہ پا کر میں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا اور عرض کیا ذاکر صاحب آپ مجھ سے بدگمان نہ ہوں، یہ طرح طرح کی ہیولے سر آنکھوں پر لیکن یہ آرٹ کا نمونہ نہیں ہیں بلکہ ہمارے حیوانی یا شہوانی مطالبات یا میلانات کی سائنٹفک تصویریں یا تعبیریں ہیں جن کا جمالیات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد گفتگو کا دروازہ بند ہو گیا، اور تصاویر زہر خند فرماتی رہیں!

O

ذاکر صاحب کی ایک صفت جو ان کے درجہ کے دوسرے لوگوں سے ان کو ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ کیسی ہی اہم تقریب کیوں نہ ہو اس کے لیے خطبہ لکھنا ہوگا تو وہ خود لکھیں گے کسی دوسرے کی مدد کے خواستگار نہ ہوں گے باوجود اس کے اس موضوع پر معتبر و مستند لکھنے والے اور اس خدمت کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھنے والے ان کے قریب کافی تعداد میں موجود

ہوں گے۔ اس بارہ میں وہ کسی فنی مشیر یا ماہر کے کبھی محتاج نہ ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں ہندوستان میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی نہیں جن کی تقریریں اور بیانات ماہرین فن نہ تیار کرتے ہوں۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے اس لیے کہ ایسے اصحاب اس درجہ عدیم الفرصت ہوتے ہیں کہ تقریر لکھنے پر زیادہ وقت اور توجہ نہیں صرف کر سکتے۔

لیکن یہ ''بہ قلم خود'' لکھنے کا اصول یا عادت ذاکر صاحب کے لیے بلائے جان سے کم نہیں! چنانچہ اس طرح کے مواقع جب کبھی پیش آتے ہیں اور کثرت سے آتے رہتے ہیں تو وہ اتنے مضطرب ہوتے ہیں کہ آس پاس کے لوگ آسانی سے سمجھ جاتے ہیں کہ موصوف کسی خطبے کی گرفت میں ہیں۔ اضطراب کی تشخیص ''خطبہ'' اس لیے کہ ذاکر صاحب کسی اور سبب سے کچھ مضطرب نہیں پائے گئے!

اضطراب کا سبب یہ ہوتا ہے کہ خطبہ لکھنے کا اہتمام وہ یہ حساب لگا کر کرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ خطبہ لکھنے کا کام ختم کرنے اور اس کے پڑھے جانے کے درمیان تھوڑا سا بھی فصل زمانی باقی رہ جائے! اور ستم ظریفی یہ ہے کہ آج تک ایسا نہ ہوا کہ خطبہ نامکمل رہ جائے یا اپنی جگہ پر بے مثل نہ ہو!

علی گڑھ والوں کے بارہ میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ جس کام کو وہ بہترین طور پر انجام دینا چاہتے ہیں اسے بالعموم 'گیارھویں' گھنٹے میں شروع کرتے ہیں اور بارھویں پر ختم کر دیتے ہیں۔ جہاں تک خطبہ لکھنے کا تعلق ہے، ذاکر صاحب نے اس ریکارڈ کو بہتر بنانے کی مزید کوشش اس طور پر کی ہے کہ کام بارہویں گھنٹے میں شروع کیا جائے اور اس سے کچھ پہلے مکمل کر دیا جائے۔

دوسری صفت یہ ہے کہ وہ ایسے موضوع پر بھی جو خصوصیت کے ساتھ ان کی مطالعہ میں نہ رہا ہو ایسی جچی تلی اور اتنی فکر انگیز بات کہتے ہیں جو شاید کوئی ماہر فن بھی نہ کہہ پاتے! ہر طرح کی کانفرنس اور جلسوں میں خطبات اور تقریریں سنتے زمانہ گزرا لیکن اکثر ہوا یہ کہ یا تو بندھی ٹکی باتیں سنیں جن سے طبیعت اُکتائی یا اصطلاحات کی بھرمار سے سابقہ ہوا جو سمجھ میں نہ آئیں لیکن ذاکر صاحب کے خطبات یا تقریروں میں خواہ وہ ذاکری سے متعلق ہوں خواہ انجینئری سے خواہ

کسی ٹکنیکل موضوع سے ہمیشہ ایسے نکتے سننے میں آئے جن سے عالم اور عامی دونوں متاثر اور مسرور ہوئے۔ کبھی بات سے، کبھی بات کہنے کے انداز سے، اکثر دونوں سے۔ مصرعہ طرح کیسا ہی ہو ذاکر صاحب اس پر اچھی سے اچھی غزل کہہ سکتے ہیں!

سبب وہی ہے جس کی طرف ابتدا میں اشارہ کر چکا ہوں یعنی ذاکر صاحب کو ہر بات سے دلچسپی ہے۔ ان میں زندگی کے نہاں کو آشکار سے، پیچیدہ کو آسانی سے اور سادگی کو پرکاری سے ربط دینے یا ایک کو دوسرے سے تعبیر کرنے کا حیرت انگیز ملکہ ہے اور یہی وہ بات ہے جو اُن کے ہر بیان میں جان پیدا کر دیتی ہے۔

عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا!

O

میرا خیال ہے کہ یونیورسٹی کے ہر چھوٹے بڑے پر ذاکر صاحب کا بحیثیت مجموعی جتنا اچھا اور دیرپا اثر پڑا ہے کسی دوسرے کا ان سے قبل نہیں پڑا تھا باستثنا سرسید اور ان کے قریبی رفقا کے! اس اثر کی اہمیت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ بھی محفوظ رکھیں کہ ذاکر صاحب نے جب اس ادارے کا کام سنبھالا تو اس کی شہرت مجروح اور عام فضا مکدر ہو چکی تھی ایسی مجروح اور مکدر جیسی پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی نہ سنی — اور جب یہاں کام چھوڑا تو یونیورسٹی کی شہرت بحیثیت یونیورسٹی کے دور دراز ملکوں تک پہنچ چکی تھی اور اس کی ظاہری شکل وصورت ہر اعتبار سے پہلے سے بدر جہا بہتر ہو گئی تھی۔ جس کو ایک اجنبی بھی یونیورسٹی کے حدود کے اندر قدم رکھتے ہی محسوس کر لیتا تھا۔

یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اوروں سے قطع نظر طلبا کی تقریروں اور تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ان میں ذاکر صاحب کی طرح سوچنے لکھنے اور تقریر کرنے کا انداز اور معمولی سطح سے بلند ہو کر بات کہنے اور کرنے کا سلیقہ آ چلا ہے۔

ذاکر صاحب یہاں آئے تو یونیورسٹی کا بجٹ کم وبیش 13 لاکھ کا تھا اور جب رخصت ہوئے تو غالبًا 54 لاکھ تک پہنچ چکا تھا۔ اس میں وہ پرائیویٹ عطیات شامل نہیں ہیں جو ذاکر صاحب کے عہد میں ذاکر صاحب کے اثر سے موصول ہوئے — قیاس ہے کہ یہ رقم 20

لاکھ تک پہنچتی ہے — موصوف کا یہ کارنامہ اس ادارے کی جدید تاریخ میں یادگار رہے گا۔ جب پرائیوٹ عطیات کا دروازہ تقریباً بند ہو چکا ہے۔

ذاکر صاحب بالعموم ہر اسکیم بڑے پیانے پر سوچتے ہیں اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مشورہ کسی ماہر فن سے لیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ بڑے پیانے پر سوچنے اور ماہر فن سے مشورہ کرنے میں ہرگز بخل نہ کرنا چاہیے۔ البتہ اسکیم کو عملی شکل دینے میں اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ ہمارے ذرائع اور وسائل کس حد تک ہمارا ساتھ دے سکیں گے۔

یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ذاکر صاحب کے قیام کے زمانے میں یونیورسٹی کی توسیع اور تزئین کا جو کام ہوا ہے اس کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ مدتوں ان میں بنیادی ردّوبدل کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ اب تک وسیع پیانے پر نہ سوچنے اور ماہر فن سے مشورہ نہ کرنے کا یہ نتیجہ رہا ہے کہ یونیورسٹی میں زیادہ تر چیزیں خواہ وہ عمارات ہوں سڑک ہو درخت ہوں سب 'خودرو' سے معلوم ہوتے ہیں یعنی جس سے جہاں بن پڑا نمودار ہو گیا۔ ظاہر ہے اس کا سبب وہ ناقابل تسخیر دشواریاں تھیں جن سے ہمارا ادارہ شروع سے اب سے چند سال پہلے تک دوچار رہا۔

O

کوئی ضخیم کتاب یا فائل ہو، کانفرنس ہو، جلسہ ہو، پرائیوٹ یا پبلک متنازعہ فیہ مسئلہ ہو، ذاکر صاحب ان میں سے وہ تمام امور جلد سے جلد اخذ کر لیں گے جو مفید مطلب، تصفیہ طلب یا یوں کہیے جانِ سخن ہوں گے — پھر ان کا ذہن اتنا رسا، حافظہ قوی اور طبیعت شریفانہ ہے کہ تصفیہ یا مفاہمت کا جو فارمولا وضع کریں گے وہ ہر فریق کے لیے قابل قبول ہوگا۔ میں نے آج تک کوئی ایسی میٹنگ نہ دیکھی جہاں ذاکر صاحب تشریف رکھتے ہوں اور مناقشہ یا مباحثہ غیر معمولی مدت تک کھنچا ہو، مثلاً یونیورسٹی کی کمیٹی کونسلوں میں شاید ہی کبھی کوئی ایسا فیصلہ ہوا ہو جس پر سب نے اتفاق نہ کیا ہو حالاں کہ بحث مباحثے میں جس کسی کا جی چاہتا تھا بڑی آزادی سے حصہ لیتا تھا۔

ذاکر صاحب کا مطالعہ بڑا وسیع اور متنوع ہے۔ یونیورسٹی میں کم ایسے لوگ ہوں گے جو موصوف کی مانند کثیر المشاغل اور عدیم الفرصت ہوں۔ یا جن کی ضمنی دلچسپیاں (Hobbies)

اتنی ہوں جتنی ذاکر صاحب کی۔ اس کے باوجود مطالعۂ کتب پر اتنی توجہ اور وقت صرف کرتے ہوں جتنا ذاکر صاحب — اُردو کی مطبوعات اور رسائل کا بھی اسی شوق وانہماک سے مطالعہ کرتے ہیں جیسے انگریزی اور جرمن مصنفین کی کتابوں کا!

ذاکر صاحب اُردو کے نئے پرانے شعرا اور ادیبوں کی تصانیف نیز نئی پرانی تحریکوں پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ اُردو کے تقریباً تمام مستند رسالے اور تصانیف ہدیۃً ذاکر صاحب کے ہاں آتے رہتے ہیں۔ مدیران و مصنفین مجھ پر بھی کرم کرتے رہتے ہیں، لیکن جب کبھی ذاکر صاحب سے ملاقات ہوئی تو یہی معلوم ہوا کہ وہ کتاب یا رسالہ جو صرف ایک رات پہلے ہم دونوں کو موصول ہوا تھا ذاکر صاحب کی نظر سے بالتفصیل گزر چکا تھا اور میں اسے ہاتھ تک نہیں لگا پایا تھا! اور یہ معلوم اس لیے ہوتا تھا کہ موصوف ہی اس کا ذکر چھیڑتے تھے۔ یہاں تک غنیمت ہے تعجب تو اس وقت ہوتا ہے جب ان کتابوں یا رسائل کے موضوعات اور مضامین پر اس خوبی سے اظہار کرتے ہیں اور ایسی پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے یہ خیال ہونے لگتا ہے جیسے تنقید و تبصرہ ان کے مطالعہ کا دیرینہ اور دل پسند موضوع رہا ہے۔

ذاکر صاحب مدت دراز سے اپنی پسند کے فارسی اشعار ایک بیاض میں درج کرتے رہتے ہیں۔ جس کی مجموعی تعداد کئی ہزار تک پہنچ چکی ہے — یہ بیاض ہر طویل سفر میں ساتھ رہتی ہے، ان اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کا فارسی کا ذوق کتنا پاکیزہ ہے اور جذبات و خیالات کی نزاکت و لطافت سے قطع نظر جن کے یہ اشعار حامل ہیں خود شاعری جس حسن خیال اور حسن اظہار سے تعبیر کی جاتی ہے اس کے ذاکر صاحب کتنے مبصر اور کیسے معتقد ہیں۔

اس کا سب سے واضح اور دل کش پرتو ان کی اُردو کی تحریروں میں نظر آئے گا جس میں فکر و نظر کو انشا پردازی کے رقص و رامش میں اس طرح تحویل کیا ہے کہ یہ بتانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون کس کی رہینِ منت ہے۔ مدت ہوئی کہیں ذاکر صاحب کی تحریر و تقریر پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے غالب کا مصرعہ لکھا تھا!

ریحاں دمد از مینا، رامش چکد از قلقل!

ذاکر صاحب کی قابلیت اور ذہانت کا اظہار یوں تو ہر موقع پر ہوتا رہتا ہے لیکن بدیہہ آفرینی میں اور برجستہ جوابی کے الماس ریزے اور برق پارے اس وقت دیکھنے میں آتے ہیں جب وہ حریف کی ناانصافی یا نالائقی پر برہم ہو جائیں! طالب علمی کے زمانہ میں یونین میں بھی ان کی معرکے کی تقریر وہ ہوئی تھی جب مباحثہ کے محرک ہونے کی حیثیت سے وہ مخالفین کے جواب میں سب سے آخر میں تقریر کرتے تھے!

ان کی تحریر و تقریر کے ساتھ آج کم و بیش آٹھ سال کا ساتھ بھی یاد آ رہا ہے!

O

ذاکر صاحب سے ملنے اور ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا ہر اس شخص کا دل چاہے گا جو ان سے خلوص نیت کے ساتھ کبھی مل چکا ہو اس لیے کہ وہ ملنے والے سے اس شفقت سے پیش آتے ہیں اور اس کی اتنی عزّت کرتے ہیں کہ اس میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی بھی اہمیت ہے۔ یہ احساس خود کو بحیثیت مجموعی سوسائٹی کے لیے مفید اور خود اپنی نظر میں قابل وقعت بنا دیتا ہے۔ سبب وہی ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے یعنی ذاکر صاحب کا ہر شخص اور ہر چیز سے دلچسپی لینے کا شوق اور ان کو بہتر بنانے کا حوصلہ۔ وہ جیسے کسی خول میں نہ رہتے ہوں جہاں سے نکلنے میں ہر ایسے شخص کو تامل ہوتا ہے جو کبھی خود پرستی کے لیے اور اکثر ناسازگار حالات سے بچنے کے لیے 'جائے پناہ' کے طور پر بنا لیتا ہے! بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اپنے لیے کسی نہ کسی طرح کا خول نہ بنا رکھا ہو۔ ذاکر صاحب کو اس طرح کی باتوں سے دور دور کا واسطہ نہیں!

موصوف کافی دنوں یہاں کے وائس چانسلر رہے لیکن میرے لیے وہ وہی ذاکر صاحب رہے جو کبھی کچی بارک میں تھے یا قرول باغ اور جامعہ نگر میں۔ یقیناً ان کے اور بھی ایسے ساتھی ہوں گے جنھوں نے ذاکر صاحب کو شروع سے آخر تک ذاکر صاحب ہی پایا۔ اپنی حیثیت بنانے یا منوانے میں ذاکر صاحب کبھی کسی عہدہ منصب یا پیروی اور پروپیگنڈہ کے محتاج نہ ہوئے۔ اور مجھے یقین ہے وائس چانسلر رہنے پر بھی بھروسہ وہ اپنے ذاکر حسین ہونے پر کرتے رہے! ذاتی طور پر میں اسی شخص کو بڑا سمجھتا ہوں جو اپنی بڑائی کے لیے کسی اضافی یا خارجی شے کا محتاج نہ ہو!

ذاکرصاحب ہرموقع اور ہرحال میں بڑے اچھے ساتھی ہیں۔ وہ آپ کی تفریح راحت اور رکھ رکھاؤ کا ہمہ وقت لحاظ رکھیں گے خواہ وہ خود کسی حال میں ہوں، اور اس لطف اور بےتکلفی سے کہ آپ پر یہ ظاہر نہ ہوگا کہ وہ ایسا کر رہے ہیں۔ آپ دل گرفتہ ہوں یا آپ میں خدانخواستہ عیب کی حد تک کوئی کمزوری ہوتو ذاکرصاحب سے مل کر دونوں کو بھولنے لگیں گے اور کچھ اس طرح محسوس کریں گے جیسے زندگی اور دنیا لطف اُٹھانے کی بھی جگہ ہے اور تکلیف اُٹھانے کی بھی، جتنی اپنے لیے اس سے زیادہ دوسروں کے لیے، مایوسی اور بےہودگی کے لیے نہیں۔ محنت اور سلیقہ سے کام کرنے کی داد جس قدر دل کھول کر اور خوش ہوکر ذاکرصاحب دیتے ہیں کوئی اور کم دے گا اس لیے کہ اس طرح سے کام کرنے کی آزمائش اور لطف سے جس طرح وہ گزرے ہیں شاید ہی کوئی اور گزرا ہو۔ جس کے کام سے خوش ہوتے تھے اس شخص کا اور اس کے کام کا بار بار اور مدتوں مناسب موقع اور محل پر ذکر ضرور کرتے خواہ وہ آدمی چھوٹا ہوتا یا بڑا یا اس کا کام!

O

علالت کی مسلسل کم وبیش خلش سے ادھر ذاکرصاحب کچھ بےکیف رہنے لگے تھے اور کبھی کبھی معمولی باتوں پر بھی بےلطف ہوجایا کرتے تھے۔ اس کا سبب تنہا علالت نہ تھی بلکہ کچھ اور طرح کی ناسازگاریاں بھی تھیں جو یقیناً سنگین نہ تھیں اور عام طور پر اس شخص کو پیش آتی رہتی ہیں جس کے سپرد اتنا بڑا کام ہو لیکن ان سب نے مل کر کچھ ایسی صورت پیدا کردی کہ ذاکرصاحب کو علی گڑھ نہ چھوڑنے پر راضی نہ کیا جاسکا۔

ذاکرصاحب طبیعت اور تربیت کے لحاظ سے معلم ہیں اور رہنا بھی یہی چاہتے ہیں۔ معلم کا سب سے اونچا درجہ پیغمبر ہے لیکن پیغمبروں میں Administrator (ایڈمنسٹریٹر) غالباً کم ہی گزرے ہیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر کی طرف لانے اور بلانے کا کام پیغمبروں کے سپرد کیا ہے اور انسان کو اشرار سے بچانے کے کام پر دوسری طرح کے لوگوں کو مامور کیا ہے۔ دونوں کا طریقۂ کار جداگانہ ہے۔ گو جب اقبال کہتے ہیں کہ عصا نہ ہوتو کلیمی ہے کارِ بےبنیاد! تو ان کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبری میں بھی تشدد بغیر ''چارہ نہیں''۔ چاہے وہ تشدد اور

پیغمبری حضرت موسیٰ ہی سے شروع اور انھیں پر ختم ہوگئی ہو۔ ممکن ہے ''لاٹھی چارج'' کی تلمیح ملیح بھی اس وقت سے چلی آ رہی ہو!

ذاکر صاحب نسلاً کھرے پٹھان ہیں لیکن پیشہ اختیار کیا معلّمی کا۔ ''اس نصیبے پر کیا اختر شناس''— اس ستم ظریفی کا انجام ظاہر ہے کیا ہوگا۔ ان کی قوم کے ایک فرد کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ افلاس سے تنگ آ کر خانہ نشیں ہو گئے اور وہاں سے بیوی کے دم بہ دم طعنے اور شب و روز کے فاقے سے نیم جان ہوکر بھیک مانگنے نکلے۔ تھوڑی دور گئے تھے کچھ یاد آیا واپس ہوئے۔ بیوی نے پوچھا کیا ہوا، بولے کھونٹی پر تلوار لٹکی ہے اسے لا دو۔ نیک بخت نے کہا نکلے تو ہو بھیک مانگنے تلوار کا کیا کرو گے۔ فرمایا اور جو کہیں حجت ہوگئی تو کیا تلوار لینے گھر آ ؤں گا!

(مطبوعہ: مسلم یونیورسٹی گزٹ، ذاکر نمبر 1957)

●●●

گزرگاہ خیال

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال (غالبؔ)

(پھولوں کی خوشبوؤں سے خیال کی گزرگاہ چراغاں ہوگئی ہے)

اقبالؔ کو معلوم نہیں کس عالم میں آب رودِ گنگا گلستانِ اندلس کی یاد آئی۔ اس وقت ذاکر صاحب کے تصور کے ساتھ مجھے علی گڑھ یاد آرہا ہے اور کیوں نہ آئے جب بلاکشانِ علی گڑھ کے لیے آب رودِ گنگا اور گلستان اندلس دونوں کا قران السعدین علی گڑھ ہو۔

گلستان اور رود بار دونوں کی زندگی و زیبائی کا مدار ایک دوسرے پر ہے۔ زندگی آزادی اور روانی ہے۔ اسی آزادی اور روانی سے ''زندہ ہیں اقوام، اور ان ہی اقوام کے جلیل و جمیل کارنامے گلستانِ اندلس ہیں، جن کو وہ آب رودِ گنگا (زندہ رود) کے کنارے اور سہارے تعمیر کرتی چلی جاتی ہیں۔ آب رودِ گنگا ایک صلائے عزم و عزیمت ہے، ازلی و ابدی، صحت مند حوصلہ مندی اور صالح مہم جوئی کی۔ جو ملتیں اس رمز کو نہیں سمجھتیں یا اس آزمائش میں پڑنے سے گریز کرتی ہیں، وہ اپنی تقدیر کو صرف جھیلتی ہیں، اس کو بدل نہیں سکتیں۔''

1915 میں ایم۔اے۔او کالج میں داخلہ لیا اور ذاکر صاحب سے پہلے پہل ملاقات ہوئی۔ موصوف دو ایک سال پہلے سے یہاں طالب علم تھے۔ جون پور سے آیا تھا، جو کبھی

علم و فضل اور شرافت اور شائستگی کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ ذوق اور ذہن پر اس کا برائے نام تصرف بھی تھا۔ علی گڑھ نے اس تصرف کو تازہ اور توانا کر دیا اور ایسا محسوس ہوا جیسے امید و آرزو کا ایک وسیع روشن افق سامنے آ گیا ہو اور نئی راہیں اور وادیاں نئے سفر نئے برگ و سامان، اور نئی تقدیر کی دعوت اور بشارت دے رہی ہوں۔ جن سے ملا جن کو دیکھا یا اس ادارے کی جن گراں مایہ اور دل آویز شخصیتوں کے بارے میں سنا، اس سے اس آب رودِ گنگا اور گلستانِ اندلس کا نقشہ سامنے آیا، جن کی 40 سال پہلے علی گڑھ میں داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ اس نقشے نے اپنے سے پہلے کی گنگا اور اندلس کی نشان دہی کی۔ یہاں تک کہ تصور و تاریخ کے بے شمار اوراق تصور دیکھتا ہوا اس دیارِ شرف و سعادت تک پہنچ گیا، جہاں سے عظمت انسان اور انسانیت کے ہر رودِ گنگا اور گلستانِ اندلس کی آب یاری ہوتی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ذاکر صاحب کے دو بڑے بھائی مظفر حسین خاں اور عابد حسین خاں مرحومین یہاں کے طالب علم رہ چکے تھے۔ ان میں سے کسی کو میں نے نہیں دیکھا، لیکن ان کی شرافت اور ذہانت کا چرچا ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر تھا۔ اس کی تصدیق ذاکر صاحب کی پاکیزہ سیرت، غیر معمولی قابلیت اور دل کش شخصیت سے اس طرح ہوتی تھی جیسے ان بھائیوں میں سے کسی سے براہ راست متعارف ہونے کی ضرورت نہ رہ جاتی ہو جن لوگوں نے عابد حسین خاں مرحوم کو دیکھا تھا ان کا بیان ہے کہ ذہانت و فطانت میں وہ تمام بھائیوں میں فرد تھے۔ مظفر حسین خاں مرحوم کے بارے میں مشہور تھا کہ بڑے سنجیدہ، ذی علم، صلح جو کم سخن اور عزلت پسند تھے، ان کا ایک انگریزی مضمون اس وقت کے ایک بڑے ممتاز انگریزی رسالہ ''ماڈرن ریویو' میں پڑھا تھا، جس کے ساتھ ان کی تصویر بھی چھپی تھی۔ مضمون ایسی سہل اور شستہ زبان میں لکھا گیا تھا کہ اس کے سمجھنے میں نہ صرف یہ کہ کوئی دقت نہیں ہوئی، بلکہ ایسا محسوس ہوا جیسے سہل اُردو اور یہ انگریزی ایک ہوں۔ چوتھے بھائی زاہد حسین خاں تھے، جو میرے سامنے فرسٹ ایر میں داخل ہوئے کتنا قد آور، متناسب الاعضا، سرخ سپید، خوش رو، شرمیلا، پاک باز نوجوان مشکل سے سولہ سترہ کا سن۔ اقبال نے ایسے ہی نوجوان کو قبیلے کی آنکھ کا تارا کہا ہوگا، ان کو دیکھ کر کچھ اس طرح کا احساس ہوتا ہے جیسے یہ قائم گنج سے نہ آئے ہوں بلکہ جنت سے براہ راست علی گڑھ میں

اُتار دیے گئے ہوں۔ ایک دن معلوم ہوا کہ وہیں پہنچ گئے جہاں سے ان کے اُتارے جانے کا خیال دل میں پیدا ہوا کرتا تھا۔ خاندانی نامراد مرضِ دق کا تینوں بھائی شکار ہوئے۔ دوسرے بھائی یوسف حسین خاں اور محمود حسین خاں ہیں۔

پچھلے سال یوسف صاحب مسلم یونیورسٹی کی پرووائس چانسلرشپ سے سبک دوش ہوکر رخصت ہورہے تھے سارا اسباب بھیجا جاچکا تھا۔ جانے میں دوتین دن رہ گئے تھے۔ ایک آدھ میز دو چار کرسیاں ادھر اُدھر پڑی تھیں۔ بیگم یوسف کی طویل علالت، اندیشہ ناک حد تک پہنچ چکی تھی۔ یونیورسٹی کی فضا ویران اور سنسان، جیسے یہ معلوم نہیں کب، کس کو، کیا سانحہ پیش آجائے۔ جنگ کی ہولناکیوں سے ملک دوچار، حسب معمول ملنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ضخیم کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہیں۔ قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں، ایک 'جذبۂ بے اختیار شوق' سے فرمایا: آپ نے سرسید کی تفسیر کلام پاک پڑھی ہے، کل ہی لائبریری سے لایا، کبھی پہلے نظر سے گزری تھی، اب جو دیکھتا ہوں تو عجب ایک جہان معنی ہے۔ میں نے دبی زبان سے عرض کیا: سرسید کی تفسیر تو نہیں ان دنوں ان کی 'اسباب بغاوتِ ہند' کے پیچھے کیا کرتا ہوں جس تشویش ناک حالات کے نرغے میں یوسف صاحب اس وقت تھے، اس میں ان کے مطالعے کا یہ انہماک دیکھ کر حیران رہ گیا۔ تاریخ، تنقید، فلسفہ، مذہب، ادب بالخصوص فرانسیسی ادب کا اتنا جامع اور مستند مطالعہ آس پاس کے لوگوں میں سے کسی اور کے حصے میں شاید ہی آیا ہو۔ یونیورسٹی کے ہمہ وقت انتظامی امور کے فشار میں مبتلا غیر معمولی ناسازگار حالات میں گرفتار، لیکن علم و ادب سے یہ شغف، یوسف صاحب کی سیرت کے بعض بڑے صالح دل کش پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے جیسے اعلیٰ اقدار کی پیروی سے انھوں نے اپنے آپ کو زندگی اور زمانے کے مکائد و مصائب سے بے نیاز کرلیا ہو۔

اس وقت 1947 کا بھیانہ دورِ خوں آشامی و غارت گری یاد آتا ہے۔ مسلسل تردّد، تشویش اور جانکاہی کے سبب ذاکر صاحب کی صحت تیزی سے گرنے لگی تھی۔ احباب اور ڈاکٹروں کے اصرار سے مجبور ہوکر بحالی صحت کی خاطر کشمیر کے لیے روانہ ہوئے۔ جالندھر پر ٹرین روک لی گئی خوں ریزی کا جنون انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ ذاکر صاحب کو گاڑی سے اُتار کر قتل گاہ

کی طرف لے چلے۔ اللہ کی رحمت سے جس کا گوارا نام ہم نے بخت و اتفاق رکھا ہے، ریلوے کا ایک افسر ذاکر صاحب کو پہچان لیتا ہے اور انھیں اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں بٹھا کر ایک دوسرے افسر کو بلاتا ہے۔ یہ افسر عین اس وقت جب تلواریں، چھرے اور غضب ناک ہو کر فضا میں بلند ہو رہے تھے، ذاکر صاحب کو اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے۔ یہ دونوں ہمیشہ ہماری احسان مندی اور شکر گزاری کے سائے میں رہیں گے۔

یہ حادثہ دیکھا نہیں، لیکن اس کا تصور کر سکتا ہوں۔ ذاکر صاحب سوئے مقتل اسی دل جمعی سے جا رہے ہوں گے، جیسے جمہوریۂ ہند کے معزز صدر کی حیثیت سے کسی علمی، ثقافتی، یا اس طرح کی کسی اور تقریب کا افتتاح کرنے یا پھر کسی شادی خانہ آبادی میں بانیانِ تقریب، دولہا دلہن کے ساتھ تصویر کھنچوانے، ان کو ہاتھوں ہاتھ اور زیادہ ہوا تو کشاں کشاں لیے جا رہے ہوں۔ بہر حال بخیریت تمام دہلی مکان پر واپس آئے تو بشرے سے ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی میلا دخواں مہنگے سے توقع سے زیادہ نقدی اور مٹھائی پا کر بیوی بچّوں میں پہنچ گیا ہو۔

ذاکر صاحب کے اس اطمینان و استقامت کے ذکر کے ساتھ ایک اور حادثہ یاد آتا ہے، جو آنکھوں کے سامنے گزرا۔ جب وہ یہاں وائس چانسلر کی حیثیت سے تشریف لائے، ان پر قلب کا دورہ پڑا اور وہ سب گزر گیا جو ایسے میں گزرا کرتا ہے، اس کا ذکر نہ کرتا۔ اگر کچھ دنوں بعد خود اس حادثہ سے دوچار نہ ہوا ہوتا اور یہ نہ معلوم ہوتا کہ اس کے شدائد کیا ہوتے ہیں، اور ایسے میں نفس کی کم تری یا روح کی برتری کب، کہاں اور کس طرح اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ ہم دونوں شام کو تھوڑی دور ٹہل کر واپس آئے تھے۔ ذاکر صاحب مہمان کے کمرے میں ٹھہر گئے۔ میں اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ گیا تو کوئی غیر معمولی بات نہ دیکھی، سوا اس کے موصوف شیروانی سمیت چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ دن میں وہ شیروانی شاید ہی اُتارتے ہوں۔ آرام کرنا ہوا تو اچکن سمیت لیٹ رہیں گے، اور بانگ اشارہ یا اطلاع اس طرح اٹھ کھڑے ہوں گے، جیسے ایمرجنسی وارڈ کے ڈاکٹروں کے آرام کرنے اور اٹھ کھڑے ہونے کا طریقہ ہے۔ چاہا کہ ادھر اُدھر کی کوئی بات چھیڑوں۔ ذاکر صاحب نے بڑے ہموار اور استوار لہجے میں فرمایا، ''قلب کا دورہ پڑ رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے آخری وقت ہے۔ چاہا کہ

آپ کو آواز دوں۔ پھر خیال آیا کہ جلدی کیا ہے، جو ہونے والا ہے، وہ ہو کر رہے گا۔ آپ بھی آتے ہی ہوں گے۔ ذاکر صاحب کے اس اطمینان قلب پر دم بخود رہ گیا۔ موصوف نے بالکل نہیں کہا کہ ڈاکٹر کو بلایا جائے گھر پر اطلاع کی جائے وہاں پہنچا دیا جائے۔ ڈاکٹر بلائے گئے۔ گھر پر اطلاع کی گئی موٹر آئی اور بڑے اطمینان سے اس میں بیٹھ کر کوٹھی پر آ گئے، جیسے کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں ڈاکٹروں نے بتایا کہ ذاکر صاحب پر وہ سب حادثے گزر گئے سوا زندگی کے آخری حادثہ کے۔ میرا ہر وقت کا آنا جانا رہتا تھا۔ ذاکر صاحب پر چاہے جو گزرتی ہو، لیکن بات چیت یا چہرے بشرے سے کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ ہر لحہ کتنے سنگین امکانات کی زد میں تھے۔ ہمیشہ اسی لطف و شگفتہ روئی سے گفتگو کی، جیسے پہلے کیا کرتے تھے۔ جالندھر میں قاتلوں اور ان کی ننگی تلواروں اور چھروں کا سامنا اور کس درجہ غیر طبعی الم ناک موت سے صرف چند لمحوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ دوسری طرف علی گڑھ میں قلب کا شدید دورہ پڑا اور یہ طبعی موت بالعموم جیسی غیر طبعی ہوتی ہے کسے معلوم نہیں، لیکن دونوں آزمائش وہ اس طرح جھیل گئے جیسے ''اک موج خوں وہ بھی۔''

ان بھائیوں میں شرافت، حمیت اور استقامت کے جوہر ان کی نسلی اور قبائلی صفات میں سے ہیں۔ دوسری طرف علم سے شغف اور اس کو اعلیٰ سطح تک پہنچانے کی مشکل و مبارک مہم کی سربراہی اور اس میں کامیابی بجائے خود ان کا بڑا قیمتی کارنامہ ہے۔ محمود صاحب نے جرمنی سے اور یوسف صاحب نے فرانس سے ڈاکٹریٹ لی اور پروفیسری پر فائز رہے۔ محمود صاحب حکومت پاکستان میں وزیر تھے اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ اب کراچی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ یوسف صاحب جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر تھے اور سالہا سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر شپ کے فرائض انجام دیے۔ ذاکر صاحب کے بارے میں کون کیا نہیں جانتا۔ تفصیل اس مجلّے میں مل جائے گی۔

سوچتا ہوں، اگر تینوں مرحوم بھائی زندہ رہتے اور ترقی کے جیسے آثار ان میں ہویدا تھے، ان کو برگ و بار لانے کا موقع ملا ہوتا تو آج ان کی موجودگی اور بے بہا خدمت سے ہمارے وزن و وقعت میں کتنا گراں قدر اضافہ ہوتا، زندگی کی شام میں ماضی کی یادوں کا کارواں ایک بار متحرک ہو جائے تو اس کو قابو میں لانا اور رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایسا کرنا شاید گوارا بھی نہ ہوتا،

خیال ہوتا ہے کہ ان تمام بھائیوں کے لیے بے بہا کارناموں کو دیکھنے کے لیے ان کے والدین جنھوں نے اوسط سے بھی کم عمر پائی، بقید حیات ہوتے، تو اقبال کی زبان سے یہ کہنے میں کتنے حق بہ جانب ہوتے:

میرے گوہرِ تمام یکدانہ!

ذاکر صاحب ایم۔اے۔او کالج میں بحیثیت طالب علم داخل ہوئے تو پہلی جنگِ عظیم برپا تھی۔ ہندوستان میں ایک نیا سیاسی اور تہذیبی شعور بیدار ہو چکا تھا۔ یہ نتیجہ تھا دادا بھائی نوروجی، سرسید، گوکھلے، تلک اور ان کے دوسرے جلیل القدر ہم عصروں کی بے مثال ذہنی وسیاسی قیادت کا جس کے طفیل ملک میں اعلیٰ صلاحیتوں کی ایک نئی نسل وجود میں آ چکی تھی، اور عام ذہنوں میں قومی مقاصد وعزائم کا ایک دل کش اور واضح تصور جھلکنے لگا تھا۔ اس نئے ذہن اور جذبے کی ترجمانی اور قیادت گاندھی جی، محمد علی، ابوالکلام آزاد، موتی لال نہرو، مختار احمد انصاری، سی آر داس، ٹیگور، اقبال، سروجنی نائیڈو اور جواہر لال نہرو کر رہے تھے۔ ان کے اخلاص، اعتقاد، اولوالعزمی سے ہندوستان میں ایک ہمہ گیر ذہنی سیاسی تحریک کا آغاز ہوا جو بدیسی حکومت کو ہر قدم پر چیلنج کر رہی تھی۔ اس کا نہایت موثر اور قابل قدر اظہار حکومت کے خلاف اس سیاسی ہندو مسلم اتحاد کی شکل میں ہوا، جسے عام طور پر خلافت اور نان کوآپریشن کی تحریک سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلو تھے، جس کی تفصیل کی یہاں نہ ضرورت نہ گنجائش۔ مجموعی حیثیت سے اس تحریک نے قومی آزادی کے بنیادی مقاصد کے حصول میں تاریخی خدمت انجام دی اور بدیسی حکومت کی گلوافشار گرفت کو ڈھیلا کیا۔ اس کے علاوہ مغربی ادب اور علم وفنون سے پچھلی صدی میں ہندی ذہن کا جو تعلق قائم ہوا تھا اور پہلی جنگ عظیم سے جو نئی صورت پیدا ہوئی تھی وہ اب ایسی فکر، ایک ایسے جذبے اور ایک ایسی بصیرت کی شکل میں نمودار ہو رہی تھی جس کو بحیثیت مجموعی قومی تہذیب وتمدن کی اہم اور معنی خیز بازیافت اور عالمی سیاسی وذہنی رجحانات کے ایک نئے نامیاتی اور ناگزیر شعور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت کی سیاسی تصویر کو سامنے رکھیں تو کم وبیش تین واضح نقطۂ نظر کارفرما نظر آتے ہیں۔ ایک نقطۂ نظر انتہا پسندی کا تھا۔ اس کے کارکن یوں تو سارے ہندوستان میں تھے، لیکن ان کا

دائرہ عمل محدود تھا۔ ان کی موجودگی کا احساس بدیسی حکومت کے لیے بڑے تردّد کا باعث تھا۔ گاہے گاہے ان کی شدید اور سنگین کاروائیاں ملک کی سیاسی فضا کو جھنجھوڑ دیا کرتی تھیں۔ اس کے جواب میں حکومت سخت اقدامات کرتی تو اس کا ردّعمل مزید عام سیاسی بیداری کی صورت میں ہوتا لیکن مجموعی طور پر ہندوستانی ذہن نے انارکسٹ تحریک کے طریقۂ کار کو اپنانے سے احتراز کیا۔ اس طور پر سیاسی جدوجہد کو یکسر خفیہ اور سازشی انداز اختیار کرنے سے محفوظ رکھا دوسرا نقطۂ نظر حکومت سے مفاہمت کر کے مراعات اور حقوق حاصل کرنے کا تھا۔ اس کے ماننے والوں میں ہر مذہب اور علاقوں کے امیر امرا، نوکری پیشہ اور زمین دار قسم کے لوگ تھے جو اپنے چھوٹے بڑے مفاد کی خاطر حکومت کا تقرب اور تائید حاصل کرنے کے درپے رہتا ہے ان کی تمام تر کوشش کا مقصد و ماحصل یہ ہوتا کہ ملک کے سماجی اور سیاسی نظام میں کوئی ایسی بڑی تبدیلی نہ ہونے پائے جو ان کے مفاد اور مستقبل کو خطرے میں ڈال دے۔ اس لیے وہ ایک طرف حکومت کی خوش نودی حاصل کرنے کی مستقل کوشش و کاوش میں مبتلا رہتے اور دوسری طرف اپنی فطری اور اکتسابی موقع شناسی کو کام میں لا کر اپنے گروہ یا صوبے کی رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لیے وقت کے مناسب حال مسائل پیش کرتے اور ایک حد تک ان کو حل کرا کے اپنی سیادت کو متعین کراتے رہتے۔ اکثر یہ سب حکومت کے ایما سے ہوتا، لیکن اس چابک دستی اور خوب صورتی سے کہ اچھے بھلے لوگ اس سے متاثر ہوتے اور ان کی تائید کرتے۔ تیسرا نقطۂ نظر زیادہ واضح، مثبت اور قابل قدر انداز کا تھا۔ اس کے حامل ملک کی نجات اور آزادیٔ جمہوریت اور مساوات میں تلاش کرتے تھے اور ایک بااصول تنظیم اور ہمہ گیر قومی و سیاسی و ذہنی تحریک کا فروغ اور ایک پس ماندہ معیشت اور معاشرے کو باقاعدہ طور پر کم از کم وقت میں ترقی کے اعلیٰ مدارج سے ہم کنار کرنا چاہتے تھے۔

اس زمانے کا تفصیلی جائزہ لینا تاریخ، سیاسیات، سماجیات اور معاشیات کے ماہرین کا کام ہے۔ میرا مقصد تو اس وقت کی مخصوص فضا اور نقشے کے بعض ایسے پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا ہے، جن سے اس وقت کے نوجوان خاص طور سے متاثر تھے۔ صورت کافی پیچیدہ تھی اور فکر و عمل میں کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنا آسان نہ تھا اس لیے کہ بنیادی طور پر ہندوستانی ذہن کی

تعمیر و ساخت مختلف النوع احساسات، تصورات اور روایات سے ہوئی تھی، جو بہ یک وقت اتنے بڑے ملک اور اس کی اتنے مختلف قماش و قرینے کی آبادی کے باہمی اختلافات و ارتباط کی ترجمان تھی۔ چنانچہ ہندوستان کی بڑی شخصیتوں کو اکثر یہاں کے اجتماعی قومی ورثے اور تاریخ کی ایسی تعریف و تعبیر پیش کرنے میں دشواری پیش آئی ہے، جو ملک میں مختلف رہنے بسنے والوں کے لیے یکساں طور پر قابل قبول ہو، اس لیے کہ مختلف عقائد، مختلف زبانوں اور مختلف رسم و رواج کی موجودگی میں مشترک اقدار کے احساس کو اس طور پر ذہنوں میں جاگزیں کرنا کہ وہ قومی مزاج و موقف بن جائے، آسان نہیں ہے۔ چنانچہ ہمارے اچھے سے اچھے آدمی کی نیت پر خود اس کے لوگوں نے شبہ کیا اور اس کے قول و فعل کو مخصوص مفادات کی پاسداری پر محمول کیا۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ مشترک تہذیب اور سرمائے کی توضیح و توسیع کے مبارک اور مہتم بالشان کام کے لیے جتنے بامقصد مشاہدے، جس گہرے مطالعے، جس وسیع ہمدردی، بے لوث عمل، گہری ریاضت اور محکم دوست داری کی ضرورت تھی، وہ ایک عرصے سے قوم کی سیاسی اور تہذیبی زندگی میں عام طور سے موجود نہ تھی۔

یہ اس صورت حال کا اجمالی نقشہ ہے، جس سے ذاکر صاحب کا بحیثیت ایک ذہین مخلص و حوصلہ مند نوجوان طالب علم کے سابقہ ہو۔ کالج میں ذاکر صاحب کا شمار اس وقت کے مثالی طلبا میں تھا۔ ساتھی طلبا بڑی عزّت و محبت کرتے تھے اور اساتذہ ان کی غیر معمولی ذہانت، قابلیت و سیرت کا خاص طور پر لحاظ رکھتے تھے، باوجود اس کے کہ اس زمانے کا یورپین اسٹاف ذاکر صاحب کے نمونے کے طلبا سے کچھ زیادہ خوش گمان نہیں رہتا تھا۔ سبب یہ تھا کہ صورت حال کیسی ہی ہو، ذاکر صاحب حفظ مراتب کے آداب اور تقاضوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ خدا نے ان کو جن صفات سے نوازا تھا، خود کو اس کا اہل اور شکرگزار ثابت کرنے کے لیے انھوں نے جس مجاہدۂ نفس احتسابِ عمل اور احساس ذمہ داری کو تمام عمر اپنی زندگی کا شعار بنائے رکھا، اسے ان کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ آدمی کی بڑائی اس سے بھی پہچانی جاتی ہے کہ قدرت کی دی ہوئی نعمتوں کو وہ کس طرح اور کس مقصد کے لیے کام میں لاتا ہے۔ اپنی نمود و بہبود کا وسیلہ بناتا ہے۔ یا ان کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے وقف رکھتا ہے جس سے ضرورت مند

زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ ذاکر صاحب ہمیشہ موخر الذکر طبقے میں نہایت ممتاز درجے پر پائے گئے۔ شباب کے نشہ ونشاط کو خدمت خلق کے صوم وصلوٰۃ پر نثار کردینا آسان نہیں۔

ذاکر صاحب اس ادارے کے طالب علم رہ چکے ہیں، جو نہ صرف ایک مستند، مقبول اور اس وقت سے اب تک ایک عدیم المثال اعلیٰ ماڈرن تعلیمی ادارے کی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ ہندوستانی تہذیب کے ایک مخصوص اور مبارک پہلو کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ علی گڑھ مسلمانوں کے تعلیمی وتہذیبی مقاصد کا مرکز اور سرچشمہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے وسیے سے ملک کی نام وری اور خوش حالی میں ساتھی رہنے بسنے والوں سے توافق وتعاون کا متمنی بھی رہتا ہے اور مبلغ بھی۔ حسب حال ضرورت جدید تعلیم دینے اور پھیلانے کا حامی، سرسید سے زیادہ ان کے عہد میں شاید ہی اور کوئی رہا ہو۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ملک کی حقیقی اور ہمہ جہتی ترقی کے لیے تعلیم کو شرط اوّلین قرار دیا اور ہندوستان جیسے ملک کی ترقی وترفع کے پروگرام میں تعداد اور طاقت کو اتنی اہمیت نہیں دی، جتنی حقیقی اور عام تعلیم وتربیت کو اور سرسید کا تعلیم کا یہ تصور اعلیٰ اور دوررس امکانات کے اعتبار سے کتنا صحیح تھا۔

اس طور پر زمانہ طالب علمی ہی میں ذاکر صاحب کو مسلمانوں کی ذہنی، اخلاقی اور سیاسی زندگی کے جملہ نشیب وفراز اور اہم شخصیتوں اور مکاتب فکر سے براہ راست آشنا ہونے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ وہ مشترک ومستحسن خاندانی روایات تھیں جو یہاں کے طلبا اپنے اپنے گھروں سے لاتے تھے، اسلاف کے وہ کارنامے تھے جو انھوں نے بزرگوں میں دیکھے، ان سے سنے، اور کتابوں میں پڑھے، جن کی دور اور نزدیک طرح طرح کی نشانیاں بکھری ہوئی نظر آتی تھیں، اور وہ اچھے اور بڑے لوگ جو کالج کے ساختہ پرداختہ تھے، یا جنھوں نے کالج کی ساخت وپرداخت کی تھی، کالج کی نیک نامی اور خوش حالی کو اپنی نیک نامی اور خوش حالی جانتے تھے اور موقع آنے پر دفاعی دستے اور انجمن صنیب احمر دونوں کے فرائض انجام دیتے تھے۔ یہ سارے عوامل براہ راست یا بالواسطہ ذاکر صاحب کے شعور پر اثر انداز تھے اور کتنی مفید وموثر دن رات کی وہ صحبتیں تھیں، جو ان کو کالج میں منتخب مسلمان شریف طبقے کے ذہین اور حوصلہ مند ساتھی نوجوانوں کی حاصل تھیں جہاں وہ اپنی اعلیٰ ذہنی واخلاقی صلاحیتوں کو، اپنے ساتھیوں کے اعلیٰ ذہنی واخلاقی

صلاحیتوں سے براہ راست و ہمہ وقت کسر وانکسار میں بنتے اور سنورتے پاتے تھے۔ انسان اور زندگی کے مسائل کتنی وسعت، کتنا تنوع اور کتنی گہرائی رکھتے ہیں اور فرد و جماعت کے روابط کو کس طرح استوار کرتے اور بابرکت رکھتے ہیں، ان کا بتانا آسان نہیں ہے لیکن ذاکر صاحب کی شخصیت اور زندگی میں ان کی واضح جلوہ گری ملتی ہے۔

ذاکر صاحب کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی زندگی کے ہر پہلو سے گہری وابستگی رکھتے تھے اور اس کی تمام دلچسپ اور صحت مند سرگرمیوں میں اس انہماک سے حصہ لیتے جیسے وہ ان کا بڑا محبوب مشغلہ ہے۔ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، ٹینس میں جو کالج کی زندگی میں بڑے مقبول مشاغل تھے، عملاً کوئی حصہ نہیں لیتے تھے، لیکن ان سے لطف اٹھانے اور ان کے اسرار و رموز یا لطائف و ظرائف پر دلچسپ گفتگو کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ کوئی میچ یا تقریب کالج میں کہیں منعقد ہو، اس کے تماشائیوں میں ذاکر صاحب ضرور ہوتے۔ کسی قابل قدر ہنر کا ماہرانہ ادراک ہو یا نہیں، اس کے ہنرور کے بڑے قدردان تھے اور اب بھی ہیں۔

کالج کی ابتدائی نصف صدی کی اقامتی زندگی اس ادارے کا بڑا قیمتی بے مثل اور دل کش امتیاز تھا جو اس وقت تک کسی دوسرے ادارے کے حصے میں نہیں آیا تھا۔ یہ وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اس کے نوجوانوں کو ایک ناقابل شکست شیرازے میں منسلک رکھتا ہے۔ دوسری طرف اس کے ناموس کا نگہبان اور نشان بھی ہیں، ذاکر صاحب اس ادارے کی اسی ابتدائی نصف صدی کی اقامتی زندگی کی پیداوار ہیں، جب یہاں کی فضا محکم عقیدہ، صالح روایات، شائستگی، حوصلہ مندی اور وسیع النظری سے معطر و منور تھی۔ یہ عہد ایم۔ اے۔ او کالج کی شادمانی، شہرت و شوکت کا سب سے نمائندہ نمایاں اور ناقابل فراموش عہد تھا۔

ذاکر صاحب اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ سے انٹرنس پاس کر کے علی گڑھ آئے تھے۔ طلبا کے پسندیدہ اخلاق و اطوار، اساتذہ کی فرض شناسی اور طلبا سے ہمدردی اور دوسری قابل قدر روایات کے اعتبار سے اٹاوہ علی گڑھ کا مثنیٰ کہا جاتا تھا۔ اس کے مشہور اور نیک نام ترین ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین مرحوم کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان کے طلبا ان کی جتنی عزت و محبت کرتے تھے، کسی اور زندہ شخص کی نہیں کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کی ذہنی و اخلاقی صلاحیتوں کو سنوارنے

اور استوار کرنے میں سید الطاف حسین کی توجہ و تربیت کا بڑا قیمتی حصہ ہے جس کا اعتراف ذاکر صاحب نے ہمیشہ بڑے احترام وعقیدت سے کیا۔

کالج سے ذاکر صاحب نے انٹرمیڈیٹ سائنس میں کیا۔ اس وقت ان کا ارادہ لکھنؤ میڈیکل کالج میں داخلہ لے کر ڈاکٹری کا کورس پورا کرنے کا تھا لیکن بعد میں ارادہ بدل دیا اور علی گڑھ واپس آکر بی اے میں داخلہ لے لیا، جس میں ان کے مضامین انگریزی ادب، معاشیات اور فلسفہ تھے ان مضامین سے ان کو فطری مناسبت تھی۔ ان کا مطالعہ انھوں نے بڑی محنت سے کیا ہو یا نہیں۔ بڑے شوق سے ضرور کیا۔ یہ اس لیے کہنا پڑا ہے کہ ذاکر صاحب طالب علمی کے عہد میں کسی مضمون یا تصنیف کا مطالعہ اتنی محنت سے نہیں جتنا شوق سے کرتے تھے۔ انھوں نے علم وفن میں جو عرفان و آگہی حاصل کی، اس سے معمولی دکان داروں کی طرح اتنا خود فائدہ نہیں کمایا، جتنا اس علم وفن کے حدود کو آگے بڑھایا۔ بی۔ اے کے امتحان میں نمایاں امتیاز حاصل کیا اور کالج میں اوّل آئے، ایم۔ اے میں معاشیات کا انتخاب کیا۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں ٹیوٹر مقرر ہوئے اس کے ساتھ قانون کے پہلے سال کا امتحان پاس کیا۔ اسی زمانے میں افلاطون کی مشہور کتاب ریاست کا ترجمہ اُردو میں کیا، جسے بعد میں انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا۔ اس پر ذاکر صاحب نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ معانی ومطالب، نیز اسلوب اظہار و ابلاغ کی رو سے بڑی فکر انگیز و دل کش تحریر ہے۔ کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کے اس عہد کے ذہنی نشو ونما میں افلاطون اور ان کے استاد سقراط کی شخصیات اور عظیم فلسفیانہ افکار کا بڑا حصہ ہے۔ ذاکر صاحب کو ہر اچھے خیال، عمل اور شخصیت سے کچھ ایسی مناسبت ہے اور ان کا ذہن بجائے خود اتنا اخاذ، خلاق، حسن کار اور حسن آفریں ہے کہ بڑے سے بڑا خیال یا شخصیت ان کے فکر وعمل میں بڑی خوب صورتی سے پیوست ہو کر ایک نئی شان اور ایک نئی معنویت حاصل کر لیتی ہے۔

اس موقع پر اپنے ایک اور احساس کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ ابتدائے طالب علمی سے آج تک سرسید کی شخصیت، ان کے رفقائے کرام اور ان کے بنائے ہوئے ادارے سے مجھے جو شغف ہے، اس میں جہاں اور بہت سے عوامل کی کارفرمائی ہے، وہیں ذاکر صاحب کی شخصیت

کو بھی بڑا دخل ہے جو تمام تر علی گڑھ کی فضا میں بالیدہ و برومند ہوئی اور علی گڑھ اور اس کے بانی کے بہترین آرزوؤں کی مظہر ہے۔ سرسید کی وہ آرزوئیں کیا تھیں اور کیسی تھیں، ان پر یہاں بحث کرنے کے بجائے اس پر منصفی سے غور کرنا چاہیے کہ سرسید نے تعلیم و تربیت کے اعلیٰ علمی، اخلاقی اور قومی تصور کے پیش نظر جو پروگرام ہندوستان میں رہنے بسنے والے مختلف مذہب و مسلک کے پیروؤں کے لیے مرتب کیا اور اس کا نفاذ علی گڑھ میں جس خلوص اور جوش عمل سے کیا اور جس پر آج تک عمل ہو رہا ہے۔ اس کی مثال ہندوستان میں آج اکیانوے سال کے بعد بھی کہیں نظر آتی ہے یا نہیں۔ شاید یہ بات کچھ لوگوں کو عجیب معلوم ہو اس لیے کہ تحریک عدم تعاون کی پیروی میں علی گڑھ کو خیر باد کہہ کر ذاکر صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ سے منسلک ہو گئے جو ایک طور پر علی گڑھ کی مخالفت میں قائم کی گئی لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جامعہ ملیہ کا قیام خود فرزندان علی گڑھ کا کارنامہ تھا۔ محمد علی، شوکت علی، عبدالمجید خواجہ اور ذاکر صاحب یہ سب علی گڑھ ہی کے تھے۔ یکسر بدلے ہوئے حالات میں قومیت کے بے پناہ جذبے کو ایک مثبت تعلیمی تحریک کی شکل دینا، اس کے لیے مصیبت اٹھانا، ایثار و خدمت کی مبارک اور شان دار روایت قائم کرنا جس نے ہندی مسلمانوں کی جدید ذہنی و اخلاقی تربیت میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ علی گڑھ کے تعلیمی مشن کی، علی گڑھ والوں ہی کی کوشش سے مزید توسیع تھی۔

ذاکر صاحب نے غالباً اکتوبر 1920 میں کالج چھوڑا اور قومی تعلیم و ترویج کو اپنا شعار بنایا اور خود کو اس کے لیے وقف کر دیا۔ اس وقت ایسا کرنا ایک نہایت درجہ دشوار اور صبر آزما راستے کو اختیار کرنا تھا لیکن انھوں نے یہ سب اتنے شوق، خلوص اور قابلیت سے کیا جیسے ان کو اسی دن کا انتظار تھا۔ ایک خالص سیاسی تحریک کے طوفان کو تعلیم و تہذیب کی جوئے رواں میں تبدیل کر دینا آسان نہ تھا۔ ان کے اس اقدام میں علی گڑھ کے پیر دانا کے حسنِ خیال اور جوش عمل کی صداقت عظمت اور قومی ہمدردی کی بڑی مبارک نشانیاں ملتی ہیں۔ جس نے قوم کی ذہنی و اخلاقی تربیت کو ہر چیز پر مقدم رکھا اور اس طور پر سیاست کو تعلیم کا خادم اور تابع بنا کر قومی تہذیب کے تخلیقی ارتقا کے امکانات کو واضح اور روشن کیا۔ قومی تہذیب کی محرک و موید صحیح معنوں میں تعلیم ہی ہوتی ہے۔ علی گڑھ تحریک دراصل اسی نکتے کا ایک دل نشین اظہار تھی۔ ذاکر صاحب نے جو فیصلہ

کیا تھا اس کے پیش نظر ان کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ قبل اس کے کہ وہ جامعہ ملیہ کے کاموں کو سنبھالیں، انھیں تعلیم و تجربے کے لیے باہر جانا چاہیے تاکہ عصری مغربی تعلیم و تہذیب سے واقفیت نہ ہونے کے سبب سے ایسی دقتیں پیش نہ آئیں جو آئندہ ایک ترقی پذیر تعلیمی پروگرام کی تشکیل و تحصیل میں مانع ہوں۔

1922 میں ذاکر صاحب جرمنی کے لیے روانہ ہوئے اور برلن یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے کے لیے داخلہ لیا۔ ساڑھے تین سال وہیں مقیم رہے۔ اس عرصے میں نہ صرف یہ کہ ''برطانوی ہند میں زراعت'' کے موضوع پر تحقیقی مطالعہ پیش کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کی، بلکہ جرمنی اور دوسرے ملکوں کی تہذیب و تمدن بالخصوص ان کے تعلیمی نظام کا گہرا مطالعہ کیا۔ جن لوگوں نے ذاکر صاحب کو وہاں دیکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے اس دوران میں ان تعلیمی تجربات کا خاکہ تیار کیا جو بعد میں ان کی رہنمائی میں جامعہ میں نافذ کیے گئے۔ یہاں بھی ذاکر صاحب کے عمل کا یہ انداز سرسید کے اس طریق عمل سے کس درجہ مماثلت رکھتا ہے جو ان کے قیام انگلستان میں بروئے کار آیا جہاں سرسید نے اپنا تمام وقت اور توجہ قوم کے سود و بہبود سے متعلق تعلیمی پروگرام مرتب کرنے میں صرف کیا۔ برلن یونیورسٹی میں ذاکر صاحب کے استاد مشہور جرمن ماہر معاشیات زومبارٹ (Professor Sombart) تھے جن کی اس وقت کے جرمنی کے اعلیٰ علمی حلقوں میں بڑی منزلت تھی۔ اقتصادیات میں پروفیسر موصوف کا مخصوص مطالعہ معاشی نظام، خاص طور پر سرمایہ داری نظام کے ارتقا، اس کی ہیئت، طریقہ کار اور مقاصد سے متعلق تھا اور ان موضوعات پر ان کی بڑے معرکہ کی تصانیف ہیں جن میں سے بعض کا انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے۔ پروفیسر زومبارٹ کے علاوہ ان کے دوسرے پروفیسر، پروفیسر زیرنگ (Professor Sering) تھے جن کی نگرانی میں ذاکر صاحب نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ 'زراعتی معاشیات' لکھا تھا۔ پروفیسر زومبارٹ کے خیالات کا ذاکر صاحب کے اقتصادی نظریات پر نمایاں اثر پڑا۔ اس کا اندازہ ذاکر صاحب کے ان دو لکچروں کے مطالعے سے ہوتا ہے جو انھوں نے مختلف موقعوں پر دیے اور بعد میں شائع بھی ہوئے۔ پہلے لکچر ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی فرمائش پر دیے گئے جو معاشیات 'مقصد و منہاج' کے نام سے اُردو میں چھپے، دوسرے

لکچروں میں جو کیکا بھائی پریم چند جی لکچر کے نام سے دہلی یونیورسٹی کی دعوت پر Capitalism Essay in Understanding کے عنوان سے دیے گئے۔
ان کے علاوہ انھوں نے معاشیات کی دو مستند کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ایک ایڈورڈ کینن (Edward Cannan) کی 'اصولِ معاشیات' اور دوسری فریڈرش لسٹ (Friendrich List) کی کتاب 'معاشیات قومی' کا۔ اس طور پر کہہ سکتے ہیں کہ معاشیات میں ذاکر صاحب کی خصوصی دلچسپی ان مضامین سے تھی، جو بنیادی طور پر فلسفیانہ معاشیات یا معاشی عمرانیات سے متعلق تھے۔ یوں ان کا معاشیات کا عام مطالعہ نہایت وسیع ہے اور وہ ان تمام جدید تبدیلیوں سے پورے طور پر آشنا ہیں۔ جو اس علم میں بڑی تیزی سے راہ پاتی رہی ہیں، جن کو سمجھنے کے لیے مخصوص و مسلسل مطالعہ درکار ہے۔

ذاکر صاحب کی دوسری دلچسپی تعلیم کے مضمون سے تھی۔ بعد میں کچھ ایسا ہوا کہ معاشیات کے بجائے تعلیم ہی ان کا خاص مضمون بن گئی یہاں تک کہ اب ملک کے اندر اور باہر ایک ممتاز ماہر تعلیم کی حیثیت سے زیادہ جانے پہچانے جاتے ہیں اور یہ صحیح بھی ہے۔ جرمنی سے واپس آکر انھوں نے تعلیم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور عمر کا بیش تر اور بہترین زمانہ اسی کی نذر کیا۔ یہاں تک کہ جدید ہندوستانی تعلیمی نظام کی تشکیل و تعمیر میں ان کے تعلیمی افکار کو بجا طور پر بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع پر ذاکر صاحب نے اُردو میں جو کچھ لکھا وہ 'تعلیمی خطبات' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی میں متعدد لکچر ہیں جو کتابی شکل میں یکجا نہیں ملتے لیکن شائع ہو چکے ہیں، اور ملک کے تعلیمی حلقوں میں معروف و مشہور ہیں۔ حال میں ان کی ایک کتاب The Pynamic University کے نام سے انگریزی میں شائع ہوئی ہے جو ان کی تخلیق فکر کا قابل قدر نمونہ ہے۔ ان کے علاوہ ملک کی تعلیم کے سلسلے میں ذاکر صاحب کی تاریخی خدمت اسی رپورٹ سے عبارت ہے جو گاندھی جی کے ایما پر مرتب ہوئی اور عام طور پر 'واردھا ایجوکیشن رپورٹ' کے نام سے معروف ہے۔

ذاکر صاحب کے تعلیمی افکار و نظریات کی ابتدائی تشکیل و تعمیر میں اس گہرے مطالعے و مشاہدے کو خاص دخل ہے، جو ان کو جرمنی کے زمانۂ قیام میں میسّر آئے۔ اس میں دو نام قابل

ذکر ہیں، جن سے ذاکر صاحب گہرے طور پر متاثر ہوئے۔ ایک مشہور جرمن عالم کرشن اسٹائنر (Kerchansteinar) دوسرے ممتاز و معروف سوئستانی ماہر تعلیم پستالوزی (Pestalozi)۔

اس وقت وہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، اس لیے وہ جامعہ کو ایسا ادارہ بنانا چاہتے تھے جو ملک میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی نہ صرف بنیادی تعلیم گاہ بلکہ تجربہ گاہ بھی ہو۔ قومی سیرت اور ذہن کی اساسی تعمیر اصلاً ابتدائی اور ثانوی تعلیم ہی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ معاشی اور سماجی اعتبار سے ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے جس کی تین چوتھائی سے زیادہ آبادی دیہات میں بودوباش رکھتی ہے۔ انگریزی حکومت نے جو نظامِ تعلیم رائج کیا تھا، وہ کل آبادی کی صرف ایک محدود تعداد کی تعلیمی ضرورتوں کو بھی ناکافی حد تک پورا کرتا تھا۔ ذاکر صاحب اس کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے تھے۔ ان کی آرزو اور کوشش یہ تھی کہ قومی ترقی اور فلاح کے لیے ایک ایسے جامع تعلیمی منصوبے کی تشکیل کی جائے، جو بچوں کی آزاد، صحت منداور مبارک ذہنی و جسمانی نشو و نما اور تربیت میں اعلیٰ قومی اقدار اور ایک حرکی معاشرے کو فروغ دینے میں معین ہو۔

ذاکر صاحب ہندوستان واپس آئے، تو یورپ کی بہترین متاع یعنی ترقی یافتہ تعلیمی افکار و نظریات اپنے ساتھ لائے اور آتے ہی اپنے وعدے اور منصوبے کے مطابق جامعہ کے کاموں کو سنبھال لیا۔ یہ مہم جتنی اہم تھی اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مادی ذرائع اور وسائل کی اتنی ہی کمی تھی۔ جن لوگوں نے یہ کام شروع کیا تھا، ان کی ہمت جواب دے رہی تھی، ابتدائی جوش اور ولولہ سرد پڑ رہا تھا، ملک کی سیاسی فضا تیزی سے مکدر ہو رہی تھی اور جامعہ کو پروان چڑھانا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ یہ محض ذاکر صاحب کی شخصیت کا اعجاز تھا کہ تھکے ماندے ساتھی تازہ دم ہوئے اور انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں ایک عہد آفریں تعلیمی پروگرام کو کامیاب بنانے کی عظیم مہم میں دل و جان سے شریک ہو گئے۔ جن لوگوں نے ذاکر صاحب کے وہ دن رات دیکھے ہیں ان کو یاد ہوگا کہ جاں بازوں اور ان کے شیخ نے کتنے دل شکن حالات میں کس دل جمعی اور پامردی کا ثبوت دیا۔ رضا کارانہ طور پر اپنے کو بے سروسامان رکھ کر قوم کے لیے کیسے ساز و سامان فراہم کیے۔ پسینا پانی ایک کر کے کتنی سنگلاخ زمین کو کتنا زرخیز بنا دیا اور اتنا کچھ کر ڈالنے کے بعد اپنا

کوئی حق نہیں جتایا۔ علم، تہذیب اور انسانیت کی خاطر اس جماعت نے جو کچھ کر دکھایا، اس کی یاد ملک و قوم کے دلوں کو ہمیشہ تازہ اور توانا رکھے گی۔

علی گڑھ سے جامعہ دہلی منتقل ہوئی، تو قرول باغ کے علاقے میں کرایے کے مکانات میں اس کا کام شروع ہوا۔ غالباً اس کی اپنی عمارت کوئی نہ تھی۔ اسکول اور کالج کہیں تھے، تو دفتر اور اقامت گاہیں کہیں اور تعلیم بالغان کا دفتر یہاں تھا تو مکتبہ جامعہ وہاں۔ لیکن ان دشواریوں کے باوجود جامعہ کا کام دیکھیے تو نہایت درجہ منظّم، مرتب اور بامقصد ادارے کا احساس ہوتا تھا۔ ہر کام قاعدے اور وقت کی پابندی سے انجام پاتا تھا۔ بحیثیت مجموعی اس زمانے میں قرول باغ کی بستی بڑی ناصاف، ناصحت مند، وحشت انگیز اور ویران تھی۔ لیکن جامعہ کے طفیل اس کی خرابیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ وہاں جایئے تو جامعہ، ذاکر صاحب، ان کے رفقا اور ان کے کاموں کے تصور سے ایسا محسوس ہوتا جیسے پورے علاقے کی فضا، جامعہ کی فضا میں تبدیل یا تحلیل ہوتی جارہی ہو۔ جامعہ والے اس بستی کو اپنی بساط اور وسائل سے زیادہ صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کرتے، ذاکر صاحب کا مکان بہت مختصر، لیکن اندر باہر صفائی، سادگی اور سلیقے کا نمونہ تھا۔ ذاکر صاحب کی بوریہ نشینی میں سلطان کی شان تھی۔ جو ملنے جاتا، اسے احساس ہوتا کہ قوم کی تقدیر و تاریخ میں وہ مبارک موڑ آچکا ہے، جس کے ہم منتظر و متمنی تھے، اور اب جب کہ وہ مسند حکومت پر متمکن ہیں، صدر جمہوریہ کا ایوان اتنا مرکز حشمت و قوت نہیں معلوم ہوتا، جتنا ایک ایسے امن کا جہاں اعلیٰ مقاصد قومی کا تعین اور ان کے حصول کی مناسب تدابیر عمل میں آتی ہیں اور جس کا مکین نئے ہندوستان میں ایک مہذب، منصفانہ اور صلح کل معاشرے کا نقیب بھی ہے اور نمائندہ بھی۔

ذاکر صاحب کی قیادت میں رفتہ رفتہ ملک میں جامعہ کی ساکھ قائم ہوئی۔ اس کی افادیت اور اہمیت کا احساس عام ہونے لگا۔ دلّی کے ہجوم و ہیجان اور دار و گیر سے دور اوکھلے میں ایک وسیع قطعے پر اس کی عمارتیں بننا شروع ہوئیں، اور دیکھتے دیکھتے ایک اجلی ستھری، تعلیمی بستی آباد ہوگئی۔ جامعہ کی عمارات دلّی کی تاریخی و تہذیبی عمارات کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ذاکر صاحب کے اعلیٰ تعمیری ذہن اور ذوق کا پتا دیتی ہیں۔ ہیئت و ساخت اور ان کے معانی و

متن میں ذاکر صاحب کے امید وعزائم پیوست ہیں۔ حالؔی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو سرسید نے بڑے چاؤ اور امنگ سے بنایا۔ جیسے کوئی اپنا گھر بناتا ہے اور وہ خود اس کے انجینئر، معمار، مزدور اور قلی تھے۔ کم وبیش یہی کیفیت ذاکر صاحب کی تھی۔ جامعہ کو گھر مل گیا۔ کاموں میں وسعت اور برکت ہوئی۔ اس طور پر ملک میں ایک صحت مند اور امید افزا روایت کا اضافہ ہوا۔

جامعہ نے غالباً 1946 میں اپنی زندگی کے پچیس سال پورے کیے، تو اس کی خدمات کے اعتراف میں ایک جشن منایا گیا۔ کس آشوب وآزمائش کا وہ دور تھا۔ ملک میں سیاسی منافرت وعداوت اس درجہ پھیل گئی تھی کہ ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے یہاں نہ کبھی یگانگت تھی، نہ ہوسکتی تھی۔ ایسے میں کسی ایسی تقریب کی طرح ڈالنا جس میں سب اتفاق ویک جہتی سے شریک ہوں ناممکن العمل نظر آتا تھا اسے ذاکر صاحب اور ان کے ادارے کی کرامت کہنا چاہیے کہ ان کی دعوت پر جامعہ کے اس جشن جوبلی میں سبھی شریک ہوئے۔ ڈائس پر کون نہیں موجود تھا۔ جواہر لعل نہرو، محمد علی جناح، راج گوپال آچاری، مولانا ابوالکلام آزاد، سید حسین نواب بھوپال، لیاقت علی خاں، عبدالمجید خواجہ۔ اس زمانے کی عصیان وعداوت کے سیل کو ذہن میں رکھیں تو اندازہ ہوسکتا ہے کہ جہاں پنڈت جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح یک جا نظر آئیں، وہاں کیسے کیسے لوگ یکجا ہو گئے ہوں گے۔

ذاکر صاحب ان دنوں علیل تھے، خطبہ پڑھنے اٹھے تو سب کی نظریں ان پر جم کر رہ گئیں۔ وہ خطبہ بھی کیا تھا، اور اس میں کیا کچھ نہ تھا۔ کتنی فکر انگیز اور سچی باتیں، کس خلوص، اعتماد اور دردمندی سے، کتنا سچا اور پکا آدمی، قوم وملک کے کس قدر نمائندہ مجمع کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ معلوم ہوا جیسے اس طوفان کا منہ پھر جائے گا، جو ہر اچھے فکر وعمل کو تہہ وبالا اور تہس نہس کر رہا تھا، اور امید واُلفت کا وہ سورج جو گہنا رہا تھا، از سرنو جگمگانے لگے گا۔ سب کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے قوم کا ضمیر خود قوم سے مخاطب ہو۔ ذاکر صاحب کی اس تقریر سے طوفان تو نہ تھما، اور جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا، لیکن ملک کی آئندہ تاریخ جو لکھی جائے گی اس میں اس حقیقت کا اظہار ہوگا کہ اس پُرمحن دور میں انصاف، شرافت وانسانیت کی

حمایت میں، ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر، جن لوگوں نے اپنی آواز بلند کی اور تعصب، تنگ دلی اور جہالت سے نبرد آزما ہوئے ان میں ذاکر صاحب کا نام بہت ممتاز ہے۔

جامعہ کی عام رہنمائی اور اس کے کاموں کی مسلسل نگہ داشت کے علاوہ ذاکر صاحب کی بے شمار مصروفیات تھیں۔ واردھا تعلیمی رپورٹ کے شائع ہو جانے کے بعد خاص طور پر جب کانگریس نے غالباً 38-1937ء کے ہری پورسشن میں اس کو پارٹی پروگرام کی حیثیت سے قبول کرلیا تھا۔ ذاکر صاحب پر ذمے داری کا ایک بوجھ آن پڑا۔ ملک کے دور دراز علاقوں کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ مختلف جلسوں اور اداروں میں رپورٹ کی وضاحت کرنی ہوتی اور بحث ومباحثہ میں حصہ لینا پڑتا تھا۔ گاندھی جی نے جن کی بے شمار مصروفیتیں تھیں اس لیے بنیادی تعلیمی پروگرام کی سربراہی کا سارا کام ذاکر صاحب کو سونپ دیا تھا۔ گاندھی جی کے اس اعتماد کا ذاکر صاحب پر بڑا اثر تھا۔ دونوں اعلیٰ اخلاقی رجحان رکھتے تھے اس لیے ان کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ ملک میں بنیادی تعلیمی پروگرام کو پارٹی یا اس کی حکومت کے اثر واقتدار کو کام میں لاکر نافذ نہ کیا جائے، بلکہ آزاد بحث مباحثہ اور افہام وتفہیم کے ذریعے اس سے صحیح واقفیت پیدا کرائی جائے اور یہی طریقۂ کار خیال اور عمل میں حقیقی اتحاد و یک جہتی کا باعث ہوگا۔ یوں بھی ذاکر صاحب کو محض اپنی بات منوانے کی اتنی فکر نہ ہوتی جتنی زیر بحث مسئلے کے تمام پہلوؤں کی تشریح، وضاحت اور اس کے اسباب ونتائج کو دوسروں کو سمجھانے کی۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، بنیادی تعلیم کے منصوبے کا مقصد ملک میں ابتدائی تعلیم کو یکسر نئی اور صحت مند بنیادوں پر قائم کرنا تھا اور نوخیز نسل کو بامقصد، بامعنی اور تخلیقی صلاحیتوں کے نشو ونما سے بہرہ مند کرنا تھا۔ عام ذہن مروّجہ تعلیمی نظام میں معمولی تبدیلیوں ہی کو کافی سمجھتا تھا، اس لیے جب یہ پروگرام سامنے آیا، تو کچھ عدم واقفیت کی بنا پر اور کچھ اس لیے کہ دیرینہ مفادات کو اس تبدیلی سے نقصان پہنچے گا، اکثر مذہبی نقطۂ نظر سیاسی عصبیت کے باعث اس کی طرح طرح کی تاویلیں کی گئیں اور مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ذاکر صاحب کو اس اسکیم کی جواب دہی کرنی پڑتی تھی۔ اس حوصلہ شکن اور صبر آزما صورت حال سے ذاکر صاحب جس مستقل مزاجی اور قابلیت سے عہدہ برآ ہوئے وہ ان کا بڑا قابلِ تعریف کارنامہ ہے۔ ملک میں جا بجا بنیادی تعلیم کا

کام شروع ہوا لیکن اتنے بڑے ملک میں اتنے بڑے کام کو ہر جگہ یکساں کامیابی سے پھیلانے میں بے شمار دشواریاں حائل تھیں۔ پھر یہ کہ سیاست اور مذہب کے دریاے بے پایاں وطوفان موج افزا میں تعلیم کی کشتی زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ بنیادی تعلیم کا کام جن توقعات اور حوصلے کے ساتھ شروع کیا گیا تھا وہ پورا نہ ہوا لیکن اس کی ذمے داری ان پہ نہیں ہے جنھوں نے اسے وضع کیا تھا بلکہ ان پر ہے جو اسے چلا نہ سکے۔

اگست 1947ء میں ہندوستان آزاد ہوا تو ذاکر صاحب دلّی میں تھے۔ بحالی صحت کے لیے کشمیر جارہے تھے کہ جالندھر کا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر ابتدائی صفحات میں آچکا ہے۔ دلّی واپس پہنچے تو عالم انتخاب میں، یہ شہر دہشت اور درندگی کی لپیٹ میں آچکا تھا مسلمانوں پر قہر و قیامت کا صور مسلسل پھونکا جارہا تھا ان کے لیے عرصہ حیات قبر کی طرح تیرہ وتنگ ہوچکا تھا اور دلّی کا گنج شائیگاں، گنج شہیداں کا سماں پیش کررہا تھا۔ مسلمان پارہ پارہ ہوچکے تھے شقاوت و شیطنت کے اس مکروہ ومہیب منظر کے ساتھ انسانیت، غیرت اور محبت کی جھلک بھی دیکھنے میں آئی تھی، گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، جواہرلعل نہرو، ذاکر صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن، شفیق الرحمٰن قدوائی بے بس اور بے سہارا مسلمانوں کو پناہ اور تشفی دینے کے لیے ہر انجام وانعام سے بے پروا ہوکر سینہ سپر تھے۔ بالآخر آگ، خون اور خباثت کا عفریت قابو میں آیا۔ لیکن کس طرح، کس وقت اور کس قیمت پر؟ ہندوستانی انسانیت کی سب سے گراں مایہ شخصیت، عالم گیر صلح و آشتی کے عظیم پیامبر اور مذہب واخلاق کے بہت بڑے نمونے ونمائندہ، گاندھی جی کی جان کی نذر لے کر، جیسے دلّی والوں کے اس دیرینہ توہم کی تصدیق ہوگئی ہو کہ جب تک وبا یا ابتلاے عام کسی بڑے آدمی کی جان نہیں لیتا، فرو نہیں ہوتی۔

بے بسی، بے قراری اور خطرے کے ان دنوں میں ذاکر صاحب نے جس اعتماد وعزم اور جس خلوص وخاموشی سے بگڑی اور بگڑتی ہوئی صورت حال کا مقابلہ کیا اور جس طرح تباہ حال مسلمانوں کو تسکین دینے اور حوصلہ دلانے میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں اس کا اعتراف سب نے کیا۔ یہ عمل اگر ایک طرف ان کے سچے اور پکّے مسلمان ہونے پر دلالت کرتا ہے تو دوسری طرف ان کے سچے اور پکے وطن دوست ہونے کی بھی دلیل ہے۔ ذاکر صاحب شب و روز

مصروف رہتے۔ جامعہ کے کاموں کے علاوہ طرح طرح کی دوسری ذمے داریوں سے سابقہ ہوا۔ دلّی کی مظلوم انسانیت کے تقاضے ان کی مسلسل توجہ چاہتے تھے۔ قومی حکومت کے تعلیمی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلے میں تمام متعلق کمیٹیوں اور کونسلوں میں شرکت کرنا لازمی سا ہوگیا تھا۔ یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کے رکن تھے۔ جو حصولِ آزادی کے بعد تعلیم کے مسائل پر مفصل رپورٹ پیش کرنے کے لیے مامور کیا گیا تھا۔ آزادی کے بعد کے کچھ دن ان ہی مصروفیتوں کی نذر ہوگئے۔ نومبر 1948 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ نے باالتفاق آرا ذاکر صاحب کو وائس چانسلر منتخب کیا۔

علی گڑھ پر بڑا سخت وقت گزر رہا تھا، جیسے کسی لرزہ خیز زلزلے کی زد میں ہو۔ پورے ملک میں اس وقت ذاکر صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا جو اس عظیم علمی، تاریخی اور تہذیبی ادارے کو بچانے اور بحال کرنے کی بیکراں اور بے امان ذمے داری قبول کرنے کا اہل ہوتا یا اس کی ہمت کرتا۔ آزادی سے چند سال پہلے ہندوستانی سیاست نے جو رنگ و رُخ اختیار کیا تھا اس سے علی گڑھ شدید طور سے متاثر ہوا تھا۔ اس لیے تقسیم ملک کے بعد پورے ملک میں تعصب و تخریب کے جو عناصر اُبھرے، علی گڑھ ان کا خاص نشانہ بنا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس لیے اور کہ کسی کے بوتے کا نہ تھا کہ جو صورت حال رونما تھی اور تیزی سے بگڑتی جارہی تھی، اس میں کیا کرے، کہاں جائے کیا ہوگا اور کس سے رجوع کرے۔ علی گڑھ کے چھوٹے بڑے سب دم بخود تھے جو نہ ہونا چاہیے تھا اس کا ان کو احساس تھا، جو کچھ ہوا تھا، اس کی ذمے داری قبول کرنے کو تیار تھے۔ دوسرے جو چاہتے تھے اس سے بھی برے بھلے واقف تھے جو نئی ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں، ان سے بھی خاطر خواہ عہدہ برآمد ہونے پر آمادہ تھے، لیکن یہ سب کیسے ہوتا اور کون کرتا، یہ وہ نہیں جانتے تھے۔

ستر پچھتر سال کی طویل مدت میں اس ادارے نے جو اچھے اور بڑے کام کیے تھے، ان کو محض ایک سیاسی حادثے کی بنا پر نظر انداز کر دیا جائے نہ مقتضائے انصاف تھا نہ قرین دانش مندی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات نے ملک کو اس طرح زیروزبر کر دیا تھا کہ شاید ہی کوئی ادارہ، جماعت یا جگہ یا کس و ناکس اس سے متاثر ہونے سے محفوظ رہا ہو۔ علی گڑھ

کے لیے جتنی غلط بات یہ تھی کہ وہ ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے کے منصب کو نظر انداز کر کے سیاست کے شور وفتن میں داخل ہوا، اس سے بھی زیادہ غلط بات یہ تھی کہ اس کے بدلے اس کے مٹا دینے کو عمل نیک قرار دیا جاتا۔ اگر آزادی کے معنی ہندوستان میں ایک نئی انصاف پسند اور جمہوری ریاست کا قائم کرنا تھا، تو اس ریاست کے قیام اور کامیابی کی اوّلین شرط یہ تھی کہ ماضی کے ناخوش گوار واقعات اور حالات کے مہلک سائے اور اس کے اثرات سے مستقبل کو محفوظ کیا جائے۔ ذاکر صاحب نے اس وقت علی گڑھ کی قیادت کی ذمہ داری قبول کر کے اس بات کو واضح طور پر ثابت کر دیا کہ نئی ہندوستانی ریاست کا بنیادی مقصد ایک مہذب، ترقی پسند اور ایک انصاف دوست معاشرے کو قائم کرنا ہے اور علی گڑھ کی بقا اور توسیع کا کام اس مقصد کے حصول میں ایک موثر اور مبارک وسیلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذاکر صاحب کا یہ کوئی نیا خیال نہ تھا۔ ان کی پوری زندگی اس مقصد کی نہایت مستند روشن اور دل کش تصویر و تعبیر رہی ہے۔

ذاکر صاحب علی گڑھ آ گئے۔ لسان الغیب نے بشارت دی: ''یوسف گم گشتہ باز آید بکنعان، غم مخور'' عندلیب باغ حجاز کی دعا پہنچی: ''کلی کلی ہو تری گرمی نوا سے گداز'' اور محسوس ہونے لگا جیسے ہم سب پھر ایک بار اپنی اس کھوئی ہوئی فردوس میں آباد ہیں، جس کو اقبال نے آغوش مادر کہہ کر کھوئی ہوئی فردوس سے بھی زیادہ دل کش بنا دیا تھا۔ یہ آنا علی گڑھ اور ذاکر صاحب کے درمیان ایک دیرینہ پیمانِ وفا کی تجدید، ایک نئی زندگی کا طلوع اور ایک نئے چیلنج کو قبول کرنے کا عزم و اعلان تھا۔ شکستہ بال، دل گرفتہ اور پابستہ مرغان چمن فرطِ مسرت سے زمزمہ سنج ہو گئے۔

سلامٌ علیٰ نجد وھل من نجدا

ذاکر صاحب کی موجودگی، ان کے کام کرنے اور کام لینے کا انداز دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک حد تک سرسید کا عہد واپس آ گیا ہو اور تباہی اور مایوسی کے ریگ زار میں تخلیق و تعمیر کے جابجا نخلستان اُبھرنے اور لہلہانے لگے ہوں۔ ذاکر صاحب مدتوں سے یونیورسٹی کی اگزیکیٹو کونسل، اکیڈمک کونسل اور شعبۂ اقتصادیات کے ممبر رہے تھے۔ یوں بھی وہ یونیورسٹی اور اراکین اسٹاف سے ذاتی طور پر متعارف تھے، بلکہ یہ کہنا بھی حقیقت سے دور نہ ہوگا کہ

ذاکر صاحب جب یہاں کے طالب علم تھے اس زمانے سے آج تک جب کہ وہ جمہوریہ ہند کے صدر ہیں ان کی اعلیٰ سیرت و شخصیت، علم وفن سے شیفتگی، عوام وخواص دونوں میں احترام ومحبت کی نظر سے دیکھے جاتے اور طالب علموں سے ہمدردی رکھنے کا چرچا جتنا علی گڑھ میں رہا اور اب تک ہے شاید ہی کسی اور کا کبھی رہا ہو۔ ان کے ذہن میں یونیورسٹی کے آئندہ نشیب وفراز کے سارے پیچ وخم کا نقشہ تھا۔ اس لیے ادارے کے انتظام وانصرام میں جوان کے لیے اتنا ادارہ نہیں جتنا گہوارہ تھا کوئی دقت پیش نہ آئی۔ ہر کام دیکھتے دیکھتے اس خوش اسلوبی سے انجام پانے لگا جیسے خوش اسلوبی سے انجام پانا ان کاموں کا خاصہ ہو۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ مواعظ حسنہ اور سب وشتم کے ان خطبات افتتاحیہ سے ہم محفوظ ہو گئے جو ہر کس وناکس اختیار کے نشہ یا اقتدار کی جستجو میں علی گڑھ آتا اور یہاں کی تواضع وتکریم سے آسودہ ہو کر ہم کو سنا جاتا۔ ذاکر صاحب کے آجانے سے دردودرماندگی اور خوف وخواری کے وہ دن ختم ہوئے اور ہم کو اس ناقابل بیان وبرداشت کلفت وکوفت سے نجات ملی۔ اس زمانے اور ان حالات میں یہ کارنامہ کسی اور کے بس کا نہ تھا۔ پھر ان ہی آنکھوں نے دیکھا کہ بڑے سے بڑا شخص خواہ وہ اپنے عہد کا کیسا ہی علامہ یا عالی جاہ کیوں نہ ہوتا، علی گڑھ آکر ہم کو خطاب کرنے کی جرأت کرتا تو سب سے پہلے ذاکر صاحب کی قیادت میں ہدیۂ عقیدت پیش کرتا اور جو کچھ کہتا اور جس طرح کہتا، انداز وہی ہوتا جیسے استاد کے سامنے اس کی اجازت لے کر پورے آداب واکرام کے ساتھ سعادت مند شاگرد مشاعرے میں اپنا کلام سناتے ہیں۔

ذاکر صاحب کے طریقہ کار کا بڑا دل آویز پہلو یہ ہے کہ انھوں نے کام کرنے یا کام لینے میں منصب کو بطور قوت یا سیاست کبھی نہیں استعمال کیا، ان کو جتنا بھروسہ اپنی خیراندیشی اور دوسروں کی اچھائی پر ہے، اتنا منصب پر نہیں۔ جیتنے کا اس سے بڑا حربہ اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے، لیکن اس حربے کا استعمال آسان نہیں۔ ذرا غفلت ہوئی اور آدمی خود اس کا شکار ہو گیا۔ علی گڑھ میں ذاکر صاحب محض وائس چانسلر نہ تھے جو بندھے ٹکے دفتری یا انتظامی طور طریقوں سے کام لینے اور کرنے کو سب کچھ جانتے ہوں، ان کی وائس چانسلری ایک عالی صفات شخص کی قیادت تھی، جس پر نہ صرف علی گڑھ کو بلکہ اس کے باہر بھی ہر چھوٹے بڑے کو اعتماد وافتخار تھا۔ اس

طور پر ذاکر صاحب کے عہد میں علی گڑھ نئے ہندوستان میں اعلیٰ علمی تعلیمی و تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔علی گڑھ کا شروع سے یہی رول بھی رہا ہے۔اپنے حسن عمل سے جب تک وہ اس کو ادا کرتا رہے گا،اس کی افادیت واہمیت مسلّم رہے گی،اور یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی۔اس طرح کے ادارے صرف اپنے اعلیٰ بنیادی مقاصد کی توسیع،ترقی وتکمیل میں زندہ ونفع بخش رہتے ہیں ان کو مصالح ومقاصد کے تابع کرنا ایسا ہی ہے جیسے تازہ اور صحت بخش ہوا اور پانی کو مسموم ومتعفن کرنا اور رکھنا۔

انگریزی اساتذہ کے عہد (ایم۔اے۔او کالج) میں تفریحی ورزشی کھیلوں اور ان کی صحیح اسپرٹ (Sportsmanship) کو تعلیم وتربیت اور معلومات زندگی کا جس طرح اور جس حد تک جزو بنا دیا گیا تھا،جس کے سبب سے علی گڑھ کے عام طلبا دوسروں سے نمایاں طور پر ممتاز تھے،اس کو ذاکر صاحب نے بڑے شوق،اصرار واہتمام سے ازسرنو نافذ کیا۔ذاکر صاحب کی طالب علمی کے زمانے میں ایم۔اے۔او کالج نے کھیلوں میں جو ناموری ونیک نامی حاصل کی تھی وہ صرف کھیل کے میدان تک محدود نہ تھی،بلکہ یہاں کے طلبا اور کالج کے جملہ متعلقین و متوسلین کی روزانہ کی زندگی میں نظر آتی تھی۔اس کا سبب یہ نہ تھا کہ علی گڑھ کے طلبا آسمان سے نازل یا روس اور امریکہ سے آیا کرتے تھے،بلکہ ان میں اسپورٹس کی روح اس درجہ سرایت کر چکی ہوتی تھی کہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر خود کھیل کے فن میں ان کو غیر معمولی مہارت حاصل ہو جاتی تھی،آج بھی جب کہ حالات سازگار نہیں ہیں،علی گڑھ کے طلبا میں اسپورٹس مین شپ،کی روایت تابندہ ہے اور یہ واضح علامت اس کی ہے کہ اس کی سرشت صالح ہے اور وہ ان روایاتِ عظیمہ،اور اقدارِ عالیہ کا احترام کرتے ہیں جس کا ایک نام علی گڑھ بھی ہے۔

آج کل طرح طرح کے کھیلوں کو جو ترقی دی جارہی ہے اور ان پر جو کثیر رقم صرف کی جاتی ہے،کسے نہیں معلوم،لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ان کھیلوں سے اسپورٹس مین شپ،نہ صرف معدوم ہو چکی ہے،بلکہ ناسمجھی سے اس کو ایسے ہاتھوں میں دے دیا گیا ہے،جو اسپورٹس کو عبادت اور ذمے داری نہیں،پیشہ قرار دیتے ہیں اور پیشہ بھی ادنیٰ درجہ کا جیسے اسپورٹس کا مقصد ذہن واخلاق کی شائستگی نہیں،لاٹھی چارج ہو۔اسپورٹس بازاروں میں نہیں پنپتے،ان کی نشو ونما،

اخلاق کی مانند، اچھی تعلیم گاہوں میں، اساتذہ کی نگرانی اور تہذیبی روایات کے سایے میں ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ذاکر صاحب نے ایک موقع پر علی گڑھ کے کھلاڑیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''عزیزو! یہ بات اچھی نہیں ہے کہ کھیلوں کے میدان بالخصوص علی گڑھ میں تمہارے اچھے کھیلنے پر تمہارے ساتھی تمہاری تحسین کریں اور فریق مخالف کے اچھے کھیل پر خاموش رہیں یا اس کی کسی معذوری یا نارسائی پر اس کا مضحکہ اڑائیں۔ یہ کھیل اور شائستگی دونوں کے آداب کے خلاف ہے۔ اگر تم دیکھو کہ ایسا ہو رہا ہے، تو کھیل بند کر دو اور اس پر اصرار کرو کہ جب تک مقابل ٹیم کے کھلاڑیوں کے کھیل کی خاطر خواہ داد نہ دی جائے گی، تم کھیلنا ملتوی رکھو گے۔''
ذاکر صاحب جانتے تھے کہ نئے ہندوستان میں جو نقشہ بنے گا اور اس کو جن نئے احوال سے سابقہ پڑے گا، اس میں صحیح وصالح خطوط پر نوجوانوں کی تنظیم کا مسئلہ سب سے اہم ہوگا اس لیے وہ طلبا میں زیادہ سے زیادہ 'اسپورٹس مین شپ' پیدا کرنے کے لیے خواہاں وکوشاں تھے اور ان کا خیال صحیح تھا۔ آج کے نوجوان میں ڈسپلن کے فقدان سے جو خطرہ ہے وہ دوسرے تمام خطروں سے زیادہ ہے۔ سیاسی ناخداؤں کو کوئی سمجھائے کہ جب تک جمہور نام میں صحیح سیاسی و جمہوری شعور نہ پیدا ہو جائے نوجوانوں کی تنظیم سیاسی مقاصد و مصالح کی سطح پر نہیں۔ اسپورٹس اور اخلاق کی سطح پر کرنا چاہیے، لیکن خود غرضی اور تنگ نظری اس کی مہلت یا اجازت نہیں دیتی، تو نوجوانوں کی موجودہ بے راہ روی کا ماتم کرنا صرف فعل عبث ہے۔

ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کا زمانہ کم وبیش آٹھ سال رہا۔ اس عرصے میں کتنے بڑے ادارے میں کتنے بڑے کام انجام پاگئے، ان کا احاطہ کرنا آسان نہیں۔ طلبا کی اعلیٰ ذہنی و اخلاقی تربیت ونشو ونما کے لیے نئے مواقع اور نئی سہولتیں فراہم کی گئیں درس وتدریس کا کام زیادہ دل سوزی اور یک سوئی سے ہونے لگا۔ لیبورٹریوں کے لیے ضروری اور جدید آلات و سامان فراہم کیے گئے۔ اساتذہ کی بڑی تعداد کو تعلیمی رخصت دے کر باہر بھیجا گیا، تاکہ اپنے مضامین میں مزید لیاقت حاصل کرسکیں۔ سنجیدہ تصنیف و تالیف اور توسیعی خطبات کا بڑے پیمانے پر انتظام ہوا، طلبا کی اقامتی زندگی اور سرگرمیوں کو زیادہ بامقصد، دلچسپ اور راحت رساں بنانے پر خاص طور سے زور دیا گیا۔ حفظانِ صحت کی تدابیر کو وسیع پیمانے پر نافذ کیا گیا، خوب صورت

کارآمد اور ضروری عمارات تیار ہوئیں۔ یونیورسٹی کے خطے کو صحت بخش اور دل کشا بنانے کے لیے وسیع پیانے پر چمن بندی کی گئی اور باغات لگائے گئے۔ افتادہ زمینوں میں کاشت کاری شروع کی گئی۔ باہر کی علمی دنیا سے بہتر روابط قائم کیے گئے۔ انھوں نے دینیات و اسلامیات کے نصاب پر مستند علما سے نظر ثانی کرائی اور اس کی خاطر خواہ تعلیم کا بندوبست کیا۔ قومی ورثے کی نگہ داشت کے پیش نظر ایک مربوط اور فکر انگیز نصاب تیار کرایا اور اس کو نافذ کیا گیا۔ اسلامی علوم کے مطالعے اور تحقیق کے لیے ادارہ علوم اسلامیہ قائم کیا۔ شعبۂ تاریخ میں ازمنہ وسطیٰ کی تحقیق و تدوین کے لیے ایک مستقل شعبہ تصنیف و تالیف کھولا۔ قومی زبان کی توسیع و ترقی کے لیے بی اے اور بی ایس سی کی سطح پر لازمی اُردو و ہندی کا مناسب و معتبر نصاب رائج کیا۔ نوجوان طالب علموں کی بہتر مجلسی تربیت کے لیے ان کی انجمن اتحاد یونیورسٹی یونین کے قواعد و ضوابط میں اصلاحات اور اضافے کیے گئے، جن سے اس کا کیرکٹر زیادہ سے زیادہ جمہوری اور نمائندہ ہو گیا اس کی خیابان بندی اس طور پر کرائی گئی کہ طلبا اطمینان اور یکسوئی سے مطالعہ کریں، یا گلگشت سے لطف اندوز ہوں۔ علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کی اسکیم منظور کرائی، خواتین کے کالج کی اخراجات کی پوری ذمہ داری اور کفالت یونیورسٹی سے منظور کرائی۔ یہ کالج علی گڑھ کے نام ور فرزند شیخ عبداللہ مرحوم کی مجاہدانہ کوشش سے عرصے سے قائم ہے، مسلم یونیورسٹی سے ملحق تھا، لیکن محدود مالی وسائل کے سبب سے اپنے توسیعی پروگرام کو پورا کرنے سے معذور تھا۔ بورڈنگ ہاؤس اور ان کے کامن روم کی سرگرمیوں کو زیادہ باقاعدہ بنایا۔ انجینئرنگ کالج، پالی ٹیکنک اور ان کی کارگاہوں (ورکشاپ) کے کاموں کو ترقی دی اور ان میں طلبا کے داخلہ کی تعداد میں اضافہ کیا۔ یونیورسٹی اسپتال اور ہیلتھ سروس کے کاموں کو وسیع تر اور منظم تر کیا اور لائق طبی عملہ فراہم کیا جن سے بحیثیت مجموعی طبی سہولتوں میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ طبیہ کالج کے نصاب میں مفید اور دور رس تبدیلیاں کی گئیں اور اس کے انتظام و انصرام کو زیادہ وسیع اور مستحکم بنیادوں پر قائم کیا گیا۔ مجوزہ میڈیکل کالج کے قیام کی اسکیم کے لیے حکومت کی باقاعدہ منظوری اور اعانت حاصل کی۔ امراض چشم کی مخصوص تعلیم اور تحقیقات کے لیے انسٹی ٹیوٹ کھولا۔ یونیورسٹی کی املاک اور آراضی کا باضابطہ ریکارڈ تیار کرایا اور ان میں اضافے کیے۔ لائق اساتذہ، طالب علموں اور

اہل علم کی نہ صرف ذاتی طور پر ہمت افزائی کی، بلکہ ان کے کاموں کے لیے کثیر رقمیں حکومت کے علاوہ دوسرے ذرائع سے فراہم کیں۔ ذاتی اعتبار واثر سے جتنے کثیر عطیات حاصل کیے اس سے پہلے اتنے مختصر عرصے اور کلیتہً بدلے ہوئے حالات میں شاید ہی کبھی جمع کیے گئے ہوں۔ کیمپس کی موجودہ اور آئندہ ضرورتوں کے پیش نظر تفصیلی منصوبہ مرتب کیا گیا، جس کا بڑا حصہ ذاکر صاحب کے عہد میں نافذ ہوا اور بقیہ بعد میں پورا کیا گیا۔ لائبریری، آرٹس فیکلٹی، جیالوجی اور فزکس کے نئے معمل، پالی ٹیکنک اور انجینئرنگ کالج میں بڑے پیمانے پر ترمیم و توسیع، یونیورسٹی ہسپتال کی عمارت میں اضافہ اور ضروری ردّ و بدل، یونین کی عمارت کی توسیع وغیرہ جن کی تکمیل بعد میں ہوتی رہی۔ ان کا نقشہ اور ان کی تعمیر کے لیے ضروری رقم کی منظوری، یہ سب ذاکر صاحب کے عہد میں ہی طے پا چکے تھے۔

یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونے کے علاوہ ذاکر صاحب انجمن ترقی اُردو اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بھی صدر رہے تھے۔ انجمن کا دفتر ان ہی کے ایما سے علی گڑھ منتقل ہوا۔ ان کی رہنمائی میں اس کی نئی تنظیم عمل میں آئی، مالی حیثیت سے مستحکم ہوئی اور اس کے کاموں کا آغاز ہوا۔ کانفرنس ایک مضمحل ادارہ بن کر رہ گئی تھی۔ ذاکر صاحب نے اس کو سہارا دیا اور فعال و کارآمد بنایا۔ نابینا اسکول کو سرپرستی میں لے کر اس کی بنیادوں کو مضبوط اور اس کے مقاصد کو بارآور کیا۔ ہونہار اور ضرورت مند طالب علموں کی امداد اور ہمت افزائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ سرسید ڈے ایک عرصے سے رسمی روایتی انداز سے منایا جاتا تھا، ذاکر صاحب نے اس کو اس طرح منانے کی طرح ڈالی جو نہ صرف اس دن کی اہمیت کو واضح اور دل نشین کرے، بلکہ علی گڑھ کے فرزندوں میں اس کے ذریعے شعور ذات اور انفرادی و اجتماعی ذمے داریوں کا احساس پیدا کرے۔ یونیورسٹی کی تاریخی عمارتوں اور ان کے کمروں کو ادارے کی شایان شان نہایت نفاست سے مزیّن کرایا۔

غرض اتنا کچھ ہوا کہ ملک میں علی گڑھ کو نہ صرف ایک مثالی تعلیم گاہ کا درجہ حاصل ہوا، بلکہ وہ ایک ایسی تہذیب و شائستگی کا ترجمان بن گیا۔ جو اصلاً اسلامی تھی، مگر اس کے ساتھ ہی دوسری تمام تہذیبوں کی اعلیٰ روایات و اقدار کو انسانیت کا ناقابل تقسیم ورثہ تسلیم کرتے ہوئے،

ہندوستان کی تعمیر نو میں ایک اہم اور بیش بہا کردار ادا کرنے کی طاقت رکھتی تھی۔ اس طور پر مستقبل میں علی گڑھ ایک ہم آہنگ وسیع المشرب اور مہذب قومی زندگی کے فروغ و استحکام کی علامت و بشارت بن گیا۔ یہ خوش آئند تبدیلی سب کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ تھی، لیکن اس کے محرک اور روح رواں ذاکر صاحب تھے۔

علی گڑھ تحریک کا سب سے بڑا مقصد ہندی مسلمانوں کی اعلیٰ ذہنی و اخلاقی تربیت کے لیے ایسے مواقع فراہم کرنے تھے جو ایک طرف ان کو قومی زندگی میں ایک فعال اور ترقی پذیر جماعت کی حیثیت دلانے میں معین ہوں اور دوسری طرف ملک میں اسلامی تہذیب کی بامعنی اور تخلیقی نشو ونما میں مدد دیں۔ اس طور پر ایک بوقلموں متوازن ہندوستانی تمدن کے صحت مند، ہم آہنگ اور بابرکت ارتقا کے فروغ کا باعث ہوں۔ یہ ادارہ نوجوان نسلوں کی کیسی تربیت کرنا چاہتا تھا اور ان سے کیا توقعات رکھتا تھا، اس کی وضاحت اس ایڈرس میں ملے گی جو اس کی تاسیس کے موقع پر دیا گیا تھا، جس کا اقتباس یہ ہے:

> "... That this College may expand into a University whose sons shall go forth throughout the length and breadth of the land to spread the Gospel of free enquiry, of large hearted toleration and of pure morality."

ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کا عہد علی گڑھ تحریک کے اس بنیادی نصب العین کی پیروی و پابندی کا رہا۔

ذاکر صاحب کا نہایت درجہ قابل ذکر اور تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شدید تباہی اور یکسر مسماری کے ماحول میں تخلیق و تعمیر کے کاموں کا آغاز کیا۔ ان کا یہ عمل اس حدیث شریف کے موافق تھا، جس میں آں حضرتؐ نے فرمایا ہے کہ اگر مجھ کو یقین ہو کہ کل قیامت آنے والی ہے، تب بھی میں ایک کھجور کا نیا پودا زمین میں نصب کروں گا۔ اس قول پاک میں انسانیت

کے تعمیری و تخلیقی تربیت کے لیے کتنی بشارتیں ملتی ہیں! اس وقت ذاکر صاحب کے اس عمل سے مایوس و ملول دلوں کو کیسی اور کتنی تسکین و تقویت نصیب ہوئی، اس کا تصور آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بے غرض خدمت کا تصور عام کیا اور یہ بتایا کہ بے لوث خدمت بالآخر تخریبی عناصر پر غالب آتی ہے۔ انھوں نے اچھے اور بڑے کام کو خود اپنا انعام جاننے اور ماننے پر زور دیا اور اسے عزّت نفس اور اطمینان نفس حاصل کرنے کا وسیلہ بتایا۔ تعصب تنگ نظ کے مقابلے میں شرافت اور انسانیت پر قائم رہنے کا درس دیا، جہالت اور گمراہی کا ـــ ـــے موثر علاج تعلیم و تہذیب سے کرنا سکھایا، اور مہذب اور ایمان دار رہنے کے لیے کوئی قیمت وصول کرنے کے بجائے قیمت ادا کرنے کی اہمیت جتائی، مایوسی کے اندھیرے میں امید اور حوصلے کے دیے کو روشن رکھنے کی ذمہ داری کا احساس دلایا، ہندی مسلمانوں کو ہندوستانی انسانیت کا جزو لاینفک جان کر ان کی خدمت کو ہندوستان کی خدمت اور خیر اندیشی قرار دیا، اور ان پر ہندوستانی ریاست کی تمام ذمہ داریوں کو اپنانے کی ضرورت کو واضح کیا، علی گڑھ کو قوم کی امانت جان کر اس کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اس کی افادیت اور اہمیت کو ظاہر کیا اس طور پر ہندوستان کی غیر مذہبی جمہوریت کی لاج رکھی۔ ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کے یہ آٹھ سال علی گڑھ اور ملک دونوں کبھی نہ بھلا سکیں گے۔

ستمبر 1956 میں جب وائس چانسلر کی میعاد کے پورے ہونے میں تقریباً سوا سال باقی تھا، ذاکر صاحب نے علی گڑھ چھوڑنے کا فیصلہ کیا، جو انتہائی غیر متوقع تھا سب نے اسے شدت سے محسوس کیا اور کوشش کی کہ یہ اپنا فیصلہ بدل دیں، لیکن وہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے۔ یہ فیصلہ انھوں نے کن اسباب پر کیا، اس کی وضاحت انھوں نے نہ کی، نہ دوسروں کو دریافت کرنے کی جرأت ہوئی۔ قیاس آرائی بہت ہوئی لیکن بیش تر غلط تھی۔ ذاکر صاحب اجتماعی ذمّے داری کا بڑا گہرا احساس رکھتے ہیں۔ ان کی پوری زندگی اس پر گواہ ہے کہ انھوں نے ذاتی خواہش اور نفع کو اجتماعی مفاد و مقاصد پر کبھی ترجیح نہیں دی۔ اس لیے اس بات کا یقین رکھنا چاہیے کہ انھوں نے علی گڑھ چھوڑا ہوگا تو اُن کے نزدیک یہ فیصلہ ان کی ذات کے لیے نہیں بلکہ ادارے کے مفاد میں تھا۔ ذاکر صاحب نے کالج چھوڑا، تو جامعہ کو سنبھالا پھر وقت آیا، تو جامعہ کو

چھوڑ کر علی گڑھ کی ذمّے داری قبول کی۔ علی گڑھ سے جانے کے بعد قومی حکومت کی رکنیت اختیار کی۔ قومی خدمت کا مطالبہ جب کبھی اور جہاں کہیں سے ہوا، ذاکر صاحب نے قبول کیا۔ ہر ایسے کام کو فرض جانا اور اس کو اس طرح سرانجام دیا کہ اس کام کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا۔ لیکن جب کبھی یہ محسوس کیا کہ وہ مجوزہ فرائض کے مطالبات کو پورا نہیں کر سکتے جس کا وہ متقاضی تھا، تو اس سے دست بردار ہو گئے۔

ذاکر صاحب طبعاً ہر شخص کو اپنا سمجھتے ہیں، یا اس میں اچھا بننے کی صلاحیت دیکھتے ہیں یا اس کو اچھا بنا لینے کی اپنے میں صلاحیت پاتے ہیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ اصول جتنا اعلیٰ و ارفع ہے، سیاست یا انتظامی مصالح کے اعتبار سے اتنا ہی ناقابلِ عمل، مضر یا خطرناک ہو سکتا ہے۔ تاریخ ہی سے نہیں، روزمرہ کے حالات و حوادث میں بھی اس کی تصدیق ملتی ہے۔ کبھی کبھی وہ ایسے کو بھی اچھا سمجھنے لگتے ہیں جو ناسزا کا مرتکب ہونا، اپنے مسلک کا تقاضا اور اپنا کارنامہ سمجھتا ہے۔ عام طور پر دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ کسی ناسمجھ یا شریف آدمی سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے اور اس کی خبر کسی مفسد کو مل جائے، تو وہ اس راز کو افشا نہ کرنے کے معاوضے میں طرح طرح کے تاوان وصول کرتا ہے اور بدنصیب اپنی شہرت اور ناموس بچانے کی خاطر اپنی ہر متاع عزیز قربان کرتا رہتا ہے۔ ذاکر صاحب کے یہاں اس کی نوعیت اور طرح کی ہے۔ وہ اپنی نیک نامی کو محفوظ رکھنے کے لیے نہیں۔ اس لیے کہ وہ ہمیشہ سے مسلّم اور بے داغ رہی ہے، بلکہ اپنے سکونِ خاطر کو بچانے کے لیے جو اُن کو بہت کم میسّر آتا ہے اور جس کے مرتکب یہی اہل غرض ہوتے ہیں، ان کے مطالبات پورے کرتے رہتے ہیں۔ بعینہٖ اس بدنصیب کے مانند جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔ مختصر یہ کہ اہلِ غرض ذاکر صاحب سے اپنے سیئات کا انعام پاتے رہتے ہیں اور خود ذاکر صاحب اپنے حسنات کا تاوان ان کو ادا کرتے رہتے ہیں، اور جب تک فریقین بفضلہٖ بقید حیات ہیں۔ یہ کاروبار یوں ہی چلتا رہے گا۔ کام کرنے اور شاید کام لینے کا ایک اسٹائل یہ بھی ہے، لیکن اکثر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ یہ فتنہ ایک بار راہ پا جائے، تو کسی نہ کسی طرح اپنا سر ضرور اُٹھائے گا۔ پھر وہ سب کچھ ہو جائے گا جو جلد یا بہ دیر ایسے میں ہوا کرتا ہے اس میں شک نہیں کہ نالائق یا فتنہ پرداز کو ذاکر صاحب جتنا جلد پہچان لیتے ہیں، دوسرا شاید نہ پہچان سکتا ہو۔ نیز وہ ان

عناصر کو جس طرح قابو میں رکھ سکتے ہیں، دوسرا نہیں رکھ سکتا لیکن منصب کے دوران میں، ورنہ اس سے کنارہ کش ہونے کے بعد وہ عناصر وعوامل جیسا کہ ان کا معمول ہے، اپنی پوری تخریبی قوتوں سے اُبھرتے ہیں جن کو ذاکر صاحب نے اپنے عہد میں کسی نہ کسی مصلحت کی بنا پر انگیز کیا تھا یا اپنے طور پر قابو میں رکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام اقدار اور ادارے، منصوبے، مقاصد اور نیک ارادے جن کی حفاظت اور ترقی کی امانت وعنانت ان کے سپرد کی گئی، ان کی علاحدگی کے بعد ابتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ذاکر صاحب جرائم کی اصلاح کر سکتے ہیں، جرائم پیشہ کا استیصال نہیں کر سکتے۔ اسے اچھے اور بڑے آدمی کی بڑائی بھی کہہ سکتے ہیں، اور اس کی معذوری بھی! بہر حال یہ جام وسندان باختن کا معاملہ ہو یا نہیں اندیش ہائے دور دراز کا مسئلہ ضرور ہے۔

ذاکر صاحب میں ایک خاصہ یا خوبی اپنے قبائلی اجداد کی ملتی ہے، یعنی صوفیہ، فقرا اور اہلِ اللہ سے ارادت اس فرض کے ساتھ کہ وہ ان نقوش قدسیہ کے کشف وکرامات پر اتنی نظر نہیں رکھتے، جتنی ان کے پاکیزہ کردار پر اس سے ان کی اخلاقی وذہنی دروبست میں توانائی اور نظر میں رفعت ورافت آئی ہے۔ معلّم ومرشد کا قران ذاکر صاحب میں آج سے نہیں، بہت دنوں سے چلا آرہا ہے۔ لیکن اس قران کو ہر سطح اور ہر موقع پر ملحوظ رکھنا کبھی کبھی فتنے اور فتور کا بھی باعث ہو سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہو کر اوج طور سے اپنے ساتھیوں میں واپس تشریف لائے، تو سامری کی فتنہ پردازی اور گئو سالہ کی گرم گفتاری پر بے قرار ہو گئے اور حضرت ہارون پر، جن کے سپرد کیمپ کا ڈسپلن کر گئے تھے، پیش دستی کر بیٹھے۔ رسالت پر سرفراز ہونے سے پہلے بھی ایک قبطی کو بنی اسرائیل پر ظلم کرتے دیکھ کر حضرت نے ایک گھونسے سے اس کا کام تمام کر دیا۔ پیغمبروں میں یہ روایت صرف حضرت موسیٰ کے حصے میں آئی۔ اس پر کسی ستم ظریف نے یہ کہا ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار میں سے صرف ایک پیغمبر پٹھان تھے، یعنی حضرت موسیٰ۔ ذاکر صاحب کے سامنے قائم گنج کے ہم وطنوں کی اس طرح کی کتنی روایات تھیں، لیکن انھوں نے اپنے وطن، اپنے سرحدی قبائلی اجداد اور حضرت موسیٰ کی روایات نیز اقبال کے مشہور مقولہ ''عصا نہ ہو، تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد'' کو نظر انداز کر کے حضرت مسیح کے مصلوب ہو جانے کی روایت کو کس طرح ترجیح دی، تعجب سے خالی نہیں۔

ایک بات ذہن میں اکثر آئی ہے وہ یہ کہ داستان کوئی لکھے، ڈراما میرا دیکھا ہوا ہے، اور مولانا محمد علی کا فقرہ یاد ہے، جو کچھ اس طرح کا تھا: جامعہ ملیہ کا قائم کرنا اور فروغ دینا اتنا مقصود نہیں ہے، جتنا ایم۔اے۔او کالج کو قبضے میں لینا اور راہ پر لانا منظور ہے۔ لیکن ذاکر صاحب نے کتنی کڑی قربانی دے کر اور آزمائش میں پڑ کر اس کا نقشہ یکسر بدل دیا اور جامعہ کو بجائے خود ایک مستقل مقصد بنا دیا اور کتنا عظیم الشان مقصد! ان کے عہد میں ان کے غیر معمولی ایثار و اثر سے ہندوستان میں جامعہ ایک نادر الوجود ادارہ تھی لیکن ذاکر صاحب جامعہ سے علاحدہ ہوئے تو جامعہ بھی شعلۂ مستعجل بن کر رہ گئی۔ علی گڑھ اور جامعہ دونوں کو ذاکر صاحب ملے۔ ایک نے ذاکر صاحب کو پالا پوسا اور پروان چڑھایا، دوسرے کو ذاکر صاحب نے پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ لیکن اگر کسی دیوانے کو یہ کہتے بھی سنا جائے تو فرزانے کیا کہیں گے کہ علی گڑھ سے ٹوٹ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ خانۂ خدا بنی ہو یا نہیں، علی گڑھ آج بھی خانۂ خلق اللہ ہے۔

ذاکر صاحب دلی سے علی گڑھ گئے، تو خیال تھا کہ تھوڑے دنوں ان کو آرام و سکون ملے گا جس کی ان کو بڑی ضرورت تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ وہاں پہنچتے ہی حکومت ہند نے ان کو یونسکو کے اجلاس میں جو اسی سال دلی میں منعقد ہو رہا تھا اپنا نمائندہ مقرر کر دیا۔ اس اجلاس میں یونسکو نے ان کو اپنی مجلس منتظمہ کا رُکن منتخب کیا اور اس سلسلے میں انھیں یورپ جانا پڑا۔ اس مجلس کے دو وقفوں میں ذاکر صاحب علاج کے لیے جرمنی گئے وہیں وزیر اعظم کا پیغام پہنچا کہ بہار کی گورنری پر تقرر کرنا چاہتے ہیں اور وہ ذاکر صاحب کا جواب نفی میں نہ قبول کریں گے۔ جو لوگ ذاکر صاحب کو جانتے ہیں، وہ اس کا احساس آسانی سے کر سکتے ہیں کہ ان کا دل اس عہدے کو آسانی سے قبول کر لینے پر مشکل ہی سے آمادہ ہوا ہوگا، اور اس قسم کی دعوت محض وزیر اعظم کی طرف سے موصول ہوتی تو بہت ممکن ہے، وہ معذرت کی کوئی صورت نکال لیتے لیکن ان کے لیے پنڈت جی کی بات کو ٹالنا ممکن نہ تھا۔ گاندھی جی کے بعد اگر کسی کے منشا کو پورا کرنے میں ان کو دلی خوشی ہوتی، تو وہ پنڈت جی تھے۔ ذاکر صاحب آمادہ ہو گئے اور غالباً اپریل 1957ء میں پٹنہ جا کر گورنر کا چارج لے لیا۔ مسلسل پانچ سال تک اس کی ذمہ داریوں سے بہ طریقِ احسن عہدہ

برآ ہوتے رہے ان کو حکومت اور عوام کا وہ مثالی اعتماد و تعاون حاصل رہا، جسے اہالیان بہار اور حکومتِ ہند مدتوں نہ بھلا سکیں گے۔

گورنر کی آئینی پوزیشن کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ صرف مخصوص حالت میں صدر ہند کے نمائندہ خاص کی حیثیت سے اسے حکومت کے پورے اختیارات حاصل ہوتے ہیں، ورنہ عام طور پر ریاستی حکومت کا سارا کام وزیر اعلیٰ اور اس کی کابینہ انجام دیتی ہے اور گورنر محض ایک مشیر کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے مشورے کی پابندی پر ریاستی حکومت بالکل مجبور نہیں ہوتی۔ یہ صرف ذاکر صاحب کے اعلیٰ ذہن اور اخلاقی صفات کا نتیجہ تھا کہ حکومت ان کے مشورے کی طلب گار ہوتی تھی اور اس پر عمل کرتی۔ اس کے ساتھ لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ راج بھون جو ریاست کی عام زندگی سے الگ تھلگ حکومت کے سب سے بڑے نمائندہ کا ایک سرد اور سنسان مسکن تھا اور صرف سرکاری تقریبات کے موقعوں پر اس بیمار کے منہ پر مضمحل سی رونق آجاتی، ذاکر صاحب کی موجودگی سے اربابِ علم و فن، طلبا، شرفا اور ضرورت مندوں کا ماوا اور ملجا بن گیا۔ گورنمنٹ ہاؤس کی تزئین و آرائش میں ذاکر صاحب نے جو دلچسپی لی اس کا صحت مند اور خوش گوار اثر ہر شخص نے محسوس کیا۔ انھوں نے وہاں کے مقرر قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی اس خوش اسلوبی سے کی اور کرائی کہ یہ گرانی طبع کا باعث بننے کے بجائے گوارا اور پسندیدہ معلوم ہونے لگے۔

ذاکر صاحب موقع اور محل کے مناسب حال عمل پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں بیک وقت اثر پذیر اور اثر ہونے کی غیر معمولی صلاحیت ہے، ان کا غیر معمولی رسا ذہن آسانی سے ان اسرار و رموز کو پالیتا ہے، جو دوسروں کی سمجھ میں مسلسل مشاہدے اور مطالعہ سے بھی بہ مشکل آتے ہیں، یہ ان کی صفت علم و حکمت کے دقائق اور غوامض ہی کی عقدہ کشائی پر قادر نہیں ہے بلکہ زندگی میں نت نئے پیش آنے والے پیچیدہ اور نازک مسائل سلجھانے میں بھی کارگر ہوتی ہے۔ بہار میں وہ نہ صرف ایک ہر دل عزیز گورنر تھے، بلکہ ریاست کے ایک محترم بزرگ، دانش وروں اور طالب علموں کے ہمدرد و قدر دان اور حکومت کے معتبر مشیر اور عوام کے خیر خواہ تھے۔ اس زمانے میں بہار کے جن لوگوں سے ملنا ہوا وہ ذاکر صاحب کی گورنری کو ریاست کے لیے باعث امتنان و افتخار سمجھتے تھے۔

1962 کے انتخابات کے بعد جب نئی مرکزی حکومت بنی، تو ذاکر صاحب کو نائب صدر منتخب کیا گیا۔ ہندوستان کے نائب صدر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے جو خدمات انجام دیں، ان سے ملک کا ہر چھوٹا بڑا واقف ہے اور اب پچھلے مئی 1967 سے وہ صدر جمہوریہ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں۔ لیکن حکومت کے ایک عالی مقام عہدے دار ہونا ذاکر صاحب کے لیے اتنا وجیہہ امتیاز نہیں، جتنا یہ کہ ان کی حیثیت ایک اعلیٰ مدبّر اور قائد کی ہے، جو ہماری تہذیب کی اعلیٰ اقدار کا حامل و مبلغ، ہندوستانی ریاست کے بنیادی عقائد کا نگہبان، انصاف، انسانیت اور شرافت کا پیکر و پیامبر اور ہندوستان میں عالم گیر انسانیت کے اتحاد و یگانگت کا بےلوث خادم بھی ہے اور اس کا گراں مایہ مخدوم بھی۔ حکومت اور ریاست کا کاروبار جیسا کچھ ہوتا ہے، اس سے تھوڑا یا بہت کون نہیں واقف ہے۔ مصلحت کی خاطر کیا کیا نہیں ہوتا اور جو اس کام میں پڑتا ہے، اس کو کیا کچھ کرنا، سننا یا سہنا نہیں ہوتا۔ ذاکر صاحب کے حصے میں یہ سب آیا ہو، تو کیا عجب۔ لیکن ملک کے سنجیدہ طبقے کو اس کا یقین ہے کہ ذاکر صاحب بااصول اور صالح سیاست کے راستے سے کسی حال میں تجاوز نہیں کریں گے اور حکومت و ریاست کے کاموں میں ہمیشہ انصاف پسندی اور روشن خیالی سے کام لیں گے۔ ذاکر صاحب کا نہ صرف یہ عقیدہ ہے بلکہ عمل بھی ہے کہ اعلیٰ مقاصد صرف اعلیٰ وسیلوں سے حاصل ہوتے ہیں اور اعلیٰ مقاصد ادنیٰ وسیلوں کے استعمال کا کبھی جواز نہیں بن سکتے۔ حکومت کے فیصلوں کے خوب و زشت کے بارے میں دو رائیں ہوسکتی ہیں، لیکن ذاکر صاحب اپنا فریضہ پورا کرنے میں حتی الوسع کوئی دقیقہ نہیں رکھتے، اس کا اعتراف ان کے سارے ہم وطن کرتے ہیں خواہ وہ کسی مسلک و مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔

ذاکر صاحب کے لیے نئی اور نادر چیزوں میں بڑی کشش ہے، چاہے وہ چیزیں اتنی مختلف ہوں جتنا گلاب کا پھول یا جیالوجی کا کوئی عجوبہ۔ نئی چال کی تصویر اور مصوّری ہو یا پُرانے زمانے کا کوئی مخطوطہ، شریعت، تصوف، کلام پر کوئی قدیم تصنیف ہو یا مغرب کے جدید ترین ناول اور افسانے یہ ''اپنا بیان حسن طبیعت نہیں'' اظہار واقعہ ہے۔ ذاکر صاحب گھر پر ہوں گے تو ان سے چند ہی گز کے فاصلے پر یہ ساری چیزیں اپنی اپنی جگہ رونق افروز ملیں گی۔ کوئی صاحبِ فن ہو،

اس سے گفتگو اس سطح سے کریں گے جو فن اور فن کار دونوں کے حسب حال ہو ایسے میں بعض فن کاروں نے کچھ اس طرح بھی محسوس کیا ہے جیسے ذاکر صاحب کے سامنے عرض ہنر کرنے میں محتاط رہنا فن سے مقدم یعنی فرزانگی ہے۔ ذاکر صاحب کے فکر کی تازہ کاری اور تخیل و ذوق کی رنگارنگی، ان کی شخصیت اور صلاحیتوں کو کبھی باسی یا دور از کار اور ان کی نفع رسانیوں کو بھی کم نہ کرسکیں گی جس طرح فطرت کی تازہ کاری، رنگارنگی اور نفع رسانی میں آج تک نہ کوئی فرق آیا، نہ آئے گا۔ زندگی اسی کا نام ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے ''ہر دم جواں ہے زندگی'' یہ صلاحیتیں زیادہ تر فطری ہوتی ہیں، لیکن اس میں اس تربیت کو بڑا دخل ہے جو فرد کو اپنی تاریخ و تہذیب کی اعلیٰ روایات صحت مند، پُر آزمائش ماحول اور محترم بزرگوں اور ممتاز ساتھیوں سے میسر آتی ہے، ایم۔اے۔او کالج کی تعلیم و تربیت کے یہی وہ عوامل تھے، جن کے کسر وانکسار میں ذاکر صاحب کی شخصیت بالیدہ ہوئی اور برگ و بار لائی اور کیسے عجیب اور عظیم عوامل تھے وہ عظیمہ گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را'' بقول غالب۔

علم، مذہب، اخلاق اور انسان دوستی کے پیرو پیکر کبھی اپنی افادیت و اہمیت نہیں کھوتے، اس لیے کہ وہ اقدارِ عظیمہ کے امین و حامل ہوتے ہیں وہ جتنے معمّر اور نحیف ہوتے جاتے ہیں ان کا فیض اور فضیلتیں اتنی ہی زیادہ وسیع موثر اور محکم ہوتی جاتی ہیں برخلاف سیاسی لیڈروں یا سرکاری عمال یا عہدہ داروں کے جو باعتبار منصب و عہدہ کتنے ہی اثر واقتدار کے مالک کیوں نہ ہوجائیں ان سے سبک دوش یا محروم ہوتے ہی اتنے کس مپرس اور نامراد ہوجاتے ہیں جیسے وہ اپنے دور منزلت کے گناہوں کی سزا بھگت رہے ہوں۔ ایسی عبرت ناک مثالیں ہر شخص ہر روز، ہر جگہ دیکھ سکتا ہے۔ جن اعلیٰ صفات اور خدمات کی بنا پر ذاکر صاحب نے عام دلوں میں عزّت و محبت کی جگہ پیدا کر لی ہے وہ ہمیشہ ترقی کرتی رہے گی خواہ وہ کسی سیاسی یا ملکی عہدے پر متمکن رہیں یا نہ رہیں وہ نائب صدر اور صدر کے مناصب پر فائز نہ ہوئے ہوتے، جب بھی ان کے مرتبے میں کوئی فرق نہ آتا۔ بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ان عہدوں کی سربراہی ان کو سونپی نہ گئی ہوتی تو کیا عجب وہ عوام اور خواص میں اور زیادہ مقبول و محترم ہوتے۔ ذاکر صاحب کی منزلت کا مدار مناصب جلیلہ پر نہیں، بلکہ اخلاق فاضلہ پر رہا ہے، اور اخلاق

فاضلہ میں ذوق و ذہانت اور علم و دانش کا اضافہ ہو جائے تو شخص اور شخصیت کی گراں مائیگی لازوال ہو جاتی ہے۔

ذاکر صاحب کا مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ بہت وسیع اور متنوع ہے انھوں نے کثرت سے سفر کیے ہیں۔ ہر سطح پر ہر طرح کے ذہنوں سے گوناگوں مسائل پر گفت وشنید کے مواقع ہوئے ہوں گے۔ ان کو افہام و تفہیم سے ہموار کرنے میں ذاکر صاحب کی کتنی اور کیسی اعلیٰ ذہنی و اخلاقی صلاحیتیں برسرکار آئی ہوں گی، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ایسے مواقع پر ان سے بہت قریب یا ان کی زندگی کی سرگذشت سے واقف ہوں گے۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کا لحاظ رکھنے میں ذاکر صاحب بڑی انصاف پسندی اور ہمدردی سے کام لیتے ہیں۔ اس اصول یا عقیدہ پر کاربند ہونا آسان نہیں اس لیے کہ اس میں دوسرے کے حق بجانب ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ سیاست اور ڈپلومیسی کی دنیا میں ایسے حق شناس اور عالی ظرف کم ملیں گے، جو اس خطرے کا سامنا کر سکے۔ تنازعہ کے تصفیہ کے لیے ایسا فارمولہ دریافت کر لینا جس پر زیادہ سے زیادہ اتفاق اور کم سے کم اختلاف ہو، ذاکر صاحب کا ایسا ہنر ہے جس میں ان کا ہمسر مشکل سے ملے گا۔

اس کی مثالیں اس زمانے میں دیکھنے میں آئیں جب وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ کانفرنسوں، کونسلروں اور کمیٹیوں میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا موقع آیا ہوگا، جب اتفاق آرا کے بجائے کثرت آرا سے متنازعہ فیہ مسئلہ کا تصفیہ ہوا ہو۔ طریقِ کار بالعموم یہ ہوتا کہ زیر بحث مسئلے پر ہر شخص کو آزادی تھی کہ وہ اپنا نقطۂ نظر نہایت اطمینان شرح وبسط سے پیش کرے، صدر کی حیثیت سے ذاکر صاحب بھی اس میں حصہ لیتے۔ گفتگو کے بعد ذاکر صاحب اپنی تجویز پیش کرتے اور وہ ایسی جامع و مانع ہوتی کہ تمام ممبر اس پر متفق ہو جاتے اور یہ محسوس کرتے کہ زیر بحث مسئلے کا بحیثیت مجموعی وہی تصفیہ مناسب حال تھا، جو ذاکر صاحب نے کیا تھا۔ اکثر ایسا معلوم ہوتا جیسے تنازعہ اور اس کا تصفیہ دونوں بیک وقت ان کے سامنے آتے ہوں۔ اس کا سب سے اچھا اثر یہ ہوتا کہ میٹنگ کے بعد کسی ممبر کے ذہن میں اپنے ساتھیوں کے خلاف کوئی کاوش یا کدورت نہ پیدا ہوتی، نہ باقی رہتی۔ اعلیٰ تعلیم گاہوں میں یہ روایت اور فضا کتنی مفید اور مبارک ہوتی ہے، اس کا اندازہ اس صورتِ حال سے ہو سکتا ہے جو عام طور پر آج کل چھوٹے بڑے تعلیمی

اداروں میں نظر آتی ہے اور ملک کی بھلائی اور بڑائی چاہنے والوں کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔ ذاکر صاحب کے عہد میں اور ان ہی کی رہنمائی میں طلبا کی مجلس اتحاد (یونیورسٹی یونین کلب) کے قواعد وضوابط میں بڑی وسعت نظر سے ایسی اصلاح واضافے کیے گئے کہ خود طلبا ان سے زیادہ حقوق آزادی کے کبھی طلب گار نہیں ہوئے۔ کہا تو یہاں تک جاتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبا کی یونین کو جتنے جمہوری حقوق ملے ہوئے ہیں کسی دوسری یونیورسٹی کی یونین کو نصیب نہیں ہیں۔ اسے ذاکر صاحب کا فیض کہیے یا طلبا کا احساس ذمے داری وفرض شناسی کہ ان کی وائس چانسلر شپ کے زمانے میں طلبا نے یونین کے راستے سے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جو اُن کے اور اس ادارے کی بہترین توقعات اور روایات کے شایانِ شان نہ ہوتا۔

ذاکر صاحب کے اردگرد ہر طرح کی مخلوق مل سکتی ہے، سوائے اس نسل کے جسے عرف عام میں مصاحب یا درباری کہتے ہیں۔ پہلے کبھی کسی رئیس اور ریاست کا مرتبہ اس پیمانے سے ناپتے تھے کہ اس پر کتنا قرض ہے اور اس کے گرد کتنے مصاحب ہیں۔ رئیس اور ریاست تو اپنی شامتِ اعمال سے ختم ہو گئے لیکن ہماری شامتِ اعمال سے ان کے آثار وروایات باقی ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ قرض حکومت کے اور مصاحب نیتاؤں کے حصے میں آئے۔ ذاکر صاحب کو اچھے لوگوں میں بیٹھ کر اچھی باتیں کرنے کا بڑا شوق اور سلیقہ ہے، بالخصوص طلبا، اساتذہ اور اربابِ فن کمال سے ایسے میں ان کا انداز حاکمانہ ہوتا ہے نہ مربیانہ، بلکہ نہایت درجہ احترام ودلنوازی کا۔ اپنی شان کے مطابق بات کرنا سب کو آتا ہے بالخصوص جب وہ شان مشتبہ ہو، لیکن دوسروں کے نازک، شریفانہ احساس اور اس کی ذہنی واخلاقی سطح کو ملحوظ رکھ کر اس طرح گفتگو یا پرسش احوال کرنا کہ مخاطب کو تشفی ہو اور اسے اچھے سے اچھے کام کی ترغیب ملے۔ ذاکر صاحب کی سلامت طبع، دل سوزی اور دانش مندی کی نمایاں دلیل ہے۔ البتہ وہ اس کو اچھا نہیں سمجھتے کہ آدمی کی جو مخصوص ذمہ داری اور فرائض ہوں، وہ ان سے مختلف، فروتر مسائل پر گفتگو کرے اور اس میں اعانت کا خواستگار، یا داد پانے کا متمنی ہو۔ لیکن اس کو اچھا سمجھنے یا نہ سمجھنے کی اہمیت اکثر باقی نہیں رہتی، جب گدائے مبرم جن کی بے شمار اقسام ہیں، اپنے مطالبے کو ان سے منوا کر رہتا ہے۔

ذاکر صاحب کا یہ عمل اکثر ایک فارمولے کی بنا پر ہوتا ہے، جس کا قصہ انھوں نے ایک بار بڑے لطف لے کر سنایا تھا۔ ذاکر صاحب جامعہ کے ابتدائی دور میں قرول باغ میں مقیم تھے۔ ان کی اور ان کے رفقا کی زندگی جس ''پیغمبری وقت'' سے گزر رہی تھی، وہ سب جانتے ہیں۔ ایک دن کوئی مولوی صاحب تشریف لائے اور ذاکر صاحب سے تادیر اُن تمام امور پر گفتگو کرتے رہے، جن کا ہر غیر مسلم کو مشرف بہ اسلام ہوتے وقت اقرار کرنا اور ایمان لانا پڑتا ہے۔ ذاکر صاحب نے ان مواعظ کو اس احترام وعقیدت سے سنا جیسے اس طرح سننا بھی ایمان کا جزو لازم ہو۔ لیکن جب مولوی صاحب نے اس میں ایک عمل کا اضافہ کیا یعنی کچھ روپے بھی مانگے تو ذاکر صاحب کی سنجیدگی سراسیمگی میں منتقل ہونے لگی۔ مولوی صاحب نے اسے بھانپ لیا اور بڑی نرمی اور نوازش سے فرمایا۔ ''میں جانتا ہوں، زمانہ سازگار نہیں، زندگی پائیدار نہیں۔ مجھے ایسی فرمائش نہیں کرنا چاہیے تھی، لیکن اب جب کہ کر چکا، تو اس کو پورا کرنا لازم آتا ہے۔'' مولوی صاحب کا مطالبہ کسی نہ کسی طرح پورا کیا گیا۔ یہ فارمولا تفریح بھی ہے، ٹریجڈی بھی؟ اور ذاکر صاحب ہی جانتے ہوں گے کہ کب اور کہاں تک یہ تفریح ہے، اور کہاں پہنچ کر ٹریجڈی بن جاتا ہے۔

ذاکر صاحب کی 'آب وہوا' میں مصاحب اور درباری پنپ نہیں سکتے۔ جب تک وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، کسی بھلے آدمی کو اس کی شکایت نہ ہوئی کہ ذاکر صاحب کے گرد ایسے مختلف الاوضاع اور اتنے کثیر المقاصد منصوبے کے اشخاص جمع رہتے ہیں یا ایسے مواقع ہوتے ہیں کہ عرضِ حال کا نہ موقع ملتا ہے، نہ اس کی ہمت ہوتی ہے۔ درباری یا مصاحب دور دور تک نظر نہ آتے۔ سبب یہ تھا کہ طالب علم ہوں یا اراکین اسٹاف ذاکر صاحب ان سے جس شفقت وعزّت سے پیش آتے، اسی شوق سے یہ بھی دریافت کرتے کہ اس نے مطالعے کے لیے کیا مضامین انتخاب کیے ہیں، کیا پڑھا ہے اور کس ڈھنگ سے پڑھا ہے۔ فلاں کتاب یا مصنف کے مطالعے کا موقع ملا ہے یا نہیں۔ اسی طرح اراکین اسٹاف سے بھی بعنوان شائستہ یہ پوچھتے کہ وہ کیا پڑھاتا ہے، کیا کتابیں، کن مصنفین کی مطالعے میں رہتی ہیں، نصاب کیا ہے کیا ہونا چاہیے، شعبے کی ترقی کی کیا اسکیم پیش نظر ہے، کیا مضامین لکھے اور شائع کیے، طلبا اور شعبے کے رفقائے کار

سے کتنا اور کیسا ربط ہے، اور اسی طرح کی دوسری باتیں۔ آرٹ ہو یا سائنس، انجینئرنگ ہو یا ڈاکٹری، اسپورٹس ہوں یا صحت وصفائی کے منصوبے، امور دین ہوں یا مسائل مملکت ان سب پر ذاکر صاحب کی نظر حیرت انگیز حد تک جامع ومعتبر ہے۔ اس لیے اصحاب متعلقہ ان پر تبادلۂ خیال کرنے کے مواقع یا مواخذے سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کرتے، تاوقتیکہ ان کو ان مسائل پر عبور نہ ہوتا اور ان کی خدمات بحیثیت مجموعی قابل اعتنا نہ ہوتیں، اور یہ وہ مواقع تھے جو درباریوں اور مصاحبوں کے لیے ناسازگار اور ناقابلِ تسخیر تھے۔ پھر بھی یہ اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ زمین کتنی ہی سنگلاخ کیوں نہ ہو۔ شعرائے کرام اشعار نکال ہی لیتے تھے۔

عام طور پر منفی خوبیاں قابلِ لحاظ نہیں ہوتیں مثلاً یہ کہنا کہ فلاں شخص آبرو باختہ برخود غلط، ابن الوقت، بدباطن، جھوٹا، بدچلن یا ہرزہ سرا نہیں ہے تو یہ اس شخص کی کوئی تعریف نہیں ہے اس لیے کہ یہ عیوب عام طور پر شریف لکھے پڑھے آدمی میں یوں بھی نہیں ہوتے۔ نہ ہونے چاہئیں لیکن جب بدحالی بدنظمی اور بے غیرتی عام ہو اور اخلاقی بندشیں تیزی سے ٹوٹ رہی ہوں، اس وقت سلبی صفات ایجابی خوبیوں کی ہم سطح ہو جاتی ہیں، اس لیے کہ ایجابی صفات تقریباً معدوم ہو چکی ہوتی ہیں۔ ذاکر صاحب کی طالب علمی سے آج تک کی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو کوئی پہلو مجہول یا مبہم نظر نہیں آتا۔ انھوں نے کبھی کوئی بات اضطراراً یا تفریحاً ایسی نہیں کی جو شرافت وشائستگی کے آئین کے خلاف ہو۔ کسی موقع پر اور کسی حال میں کوئی سخیف یا سوقیانہ کلمہ زبان سے نہیں نکالا۔ اپنی کسی برتری کا بھولے سے اظہار نہیں کیا۔ کسی کی ہتک یا دل آزاری نہیں کی۔ مخالفوں ہی سے نہیں، دشمنوں سے بھی تحمل وتواضع سے پیش آئے۔ اپنی بات منوانے کے لیے نہ گلے پر زور دیا نہ زبان کو آلودہ کیا، بلکہ سنجیدگی اور مساوات کی فضا کو ہر طرح سے برقرار رکھا۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں وہ جس ہمدردی، وسیع النظری اور دانش مندی سے کام لیتے ہیں وہ ان کی اعلیٰ ذہنی واخلاقی قابلیت کا ثبوت ہے۔ آدمیوں کے جنگل میں وہ چند ہی ایسے افراد میں ہیں، جو احساس کمتری سے مغلوب ہو کر احساس برتری کی نمائش طرح طرح کی خفیف الحرکتی سے نہیں کرتے۔ ذاکر صاحب ہمیشہ اور ہر حال میں، ہر شخص سے، خوش ہو کر عزّت ومحبت سے ملتے ہیں۔ ملنے والے سے کبھی نہ اُکتائیں گے کسی بدنصیب کی آبروریزی میں دلچسپی لینا تو

درکنار اس خیال کو بھی ذہن میں نہ آنے دیں گے، بلکہ اس کی ہر طرح سے پردہ پوشی کریں گے۔ انھوں نے کبھی احسان نہیں جتایا۔ بظاہر یہ بڑی معمولی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ بڑے ظرف و ضبط کا کام ہے جیسے جذبات غصبیہ و شہوانیہ کو قابو میں رکھنا۔ پوشاک ہمیشہ دیسی کپڑے کی سادہ، بجلی ستھری بیش تر سفید پہنی۔ ان کے جسم پر کسی نے کاواک، ملگجا، بوسیدہ یا داغ دار لباس نہیں دیکھا۔ مہمان کی تواضع و تکریم میں وہ بدوی فیاضی و فخر سے کام لیتے ہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کو تحائف دینے اور ان کے لیے پھل و مٹھائی وغیرہ خریدنے میں روپے کا نہیں صرف اپنے حوصلے اور عزیزوں اور دوستوں سے محبت اور ان کے احترام کا خیال رکھتے ہیں، اور یہ باتیں اس وقت سے ہیں جب نہ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، نہ بہار کے گورنر، نہ جمہوریۂ ہند کے نائب صدر اور صدر بلکہ صرف ذاکر صاحب تھے اور آمدنی کے وسائل بہت محدود تھے۔

ذاکر صاحب کو تحریر و تقریر پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے، ان کے خطبات، تراجم اور مضامین ہمارے علم و ادب میں قیمتی اور مستقل اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی کہانیاں اور ڈرامے لکھے ہیں، جو شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ذاکر صاحب کا منفرد اسلوب ہے۔ ان کا متوازن متجسس، شائستہ، شفاف و شگرف ذہن پاکیزہ، شریفانہ اور نازک احساس، شگفتہ ادبی ذوق، بیدار و تربیت یافتہ شعور، وسیع اور متنوع مشاہدہ علم اور تجربہ، انسانیت سے عشق اور خدائے واحد پر ایمان، ان کی تحریر و تقریر کو غیر معمولی کشش، قوت حسن و تاثیر بخشتے ہیں۔ ذاکر صاحب حتی الوسع تحریر و تقریر سے بچتے ہیں، اس لیے کہ ان کاموں کے لیے جتنا وقت یا فرصت درکار ہوتی ہے، وہ ان کو بہت کم میسر آتی ہے۔ ایسے مشاغل کے لیے وہ اسی وقت آمادہ ہوتے ہیں، جب گریز کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں، چنانچہ یہ کام سخت ذہنی و جذباتی فشار میں انجام پاتا ہے۔ وہ اصلاً تکمیل پسند ہیں، اس لیے خود اپنے کاموں سے بہت کم مطمئن ہوتے ہیں۔ بڑے ذہن کا احساس اکثر یہی ہوتا ہے۔ انھوں نے جو کچھ اور جتنا کچھ لکھ دیا ہے وہ اپنے موضوع پر اجتہاد و استناد کا درجہ رکھتا ہے، سادگی، اعتقاد اور جوش جو اچھی ادبی تحریر کی اہم خصوصیات بتائی جاتی ہیں، ذاکر صاحب کی تحریر و تقریر میں ان کا بڑا اچھا اظہار و

امتزاج ملتا ہے۔ وہ حشو وزوائد سے یکسر پاک ہوتی ہیں اور پڑھنے اور سننے والے کو ہمیشہ ایک نئے خیال انگیز اور قیمتی تجربے سے آشنا کرتی ہیں، جس سے تعمیری وتخلیقی فکر وعمل کی کتنی راہیں کھلتی اور روشن ہوتی ہیں، کتنے مختلف النوع مواقع اور مشکل، نازک اور خصوصی موضوعات پر کس کثرت سے ذاکر صاحب کو تقریر کرنی پڑی ہے، لیکن ہمیشہ ایسا معلوم ہوا کہ انھوں نے نئی اور وقیع بات کہی۔ یہ فن اور فیض کم کسی کے نصیب میں آیا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ اب کوہِ ندا کی آواز پر وہ کدھر اور کہاں جاتے ہیں۔ سعدؔی کا دیدہ ودل بہر حال ان کے ہمراہ اور جگؔر کا یہ شعر زبان پر رہے گا۔

نیتِ شب بخیر اے ساقی
بزم جم کیا ہے، ساغرِ جم کیا!

(مشمولہ ''نذرِ ذاکر'' 1967)

●●●

ذاکر صاحب

(۵)

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ذاکر صاحب کا انتقال ہوگیا۔ کتنی مختصر خبر، لیکن کتنا بڑا حادثہ، اُن تمام لوگوں کے لیے جو اچھے شخص اور اچھی باتوں کا احترام کرنا جانتے ہیں۔ تین دن تک مسلسل دہلی میں جو کچھ دیکھنے میں آیا، اس سے اندازہ ہوا کہ آج بھی لاتعداد ایسے لوگ ہیں جو اچھے اشخاص اور اچھی باتوں کا احترام کرنا جانتے اور چاہتے ہیں۔ موت اور زیست ہر متنفس کے لیے تقدیر ہے لیکن ان کا شرف کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب کی زندگی اور مرگ دونوں باشرف تھے اس لیے کہ ان کے دونوں ایک دوسرے سے مشرف تھے۔

طبیعت کی افتاد کو کیا کہوں۔ کوئی اچھا شخص ہوتا ہے یا کوئی اچھا شغل تو معلوم نہیں کیوں اور کیسے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ نہ یہ آدمی مرے گا نہ شغل ختم ہوگا۔ پھر ایسے کو کیا کہوں جو دونوں ایک ہی تھا۔ وفات کی خبر سُنی تو پہلا جھٹکا اسی کا لگا، ارے ذاکر صاحب اور یہ جہاں دونوں کا قرار تھا۔ اقدار کو موت نہیں اس لیے کہ ان کا حامل خود واصل بحق ہوکر ان کو

لازوال کر جاتا ہے۔ اقدارِ اعلیٰ کی حیثیت علوم متداول کے بندھے ٹکے اصول یا ظن وتخمین کی نہیں ہوتی، ان کو تائید وتوانائی ملتی ہے افراد کے اعلیٰ عقیدے اور عمل صالح سے۔

حادثہ کی خبر سنتے ہی وہ ہوا جو بے اختیاری میں اکثر ہوا کرتا ہے۔ جیسے اپنا وجود رہ گیا ہو نہ شعور۔ درد و درماندگی اور گزرے ہوئے دنوں کی یادوں کا اُجڑا ہوا قافلہ مرحوم کی تکریم و تعاقب میں رواں دواں ہوگیا۔ آواز سے بے اختیار رونے لگنا وہ بھی نوکروں، بچوں اور عورتوں کے سامنے بڑھاپے میں زیب نہیں دیتا۔ لیکن کیا کروں حادثہ سخت ہوتو آدابِ محفل کو ملحوظ رکھنا میرے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگا اور کیا عجیب یہ احساس تھا کہ اس حادثے اور ایسے حادثے کے بعد اپنی تمام خوبیاں متاعِ کاسد، اپنے تمام کارنامے بے نور، وہ تمام تعمیریں مسمار، وہ سبز و شاداب باغ جھلس گیا اور نہریں خشک ہوگئی ہوں اور امید وحوصلے کے وہ سفینے غرق ہونے لگے ہوں جن سے کبھی ذہن اور تخیل کی فضا معمور، منور اور معطر تھی جیسے کسی جدید ترین ہولناک بم کے پھٹنے سے آدمی، جانور، ہوا، پانی، نباتات و جمادات اور ہر وہ چیز جو دیکھی یا محسوس کی جاسکتی تھی مسخ، معدوم اور پاش پاش ہونے لگی ہو۔ طبیعت کو جلد ہی قابو میں لانا پڑا تاکہ لوگ میری طرف متوجہ رہنے کے بجائے اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوجائیں اور میری وہ پشیمانی کم ہوجائے جو اِن سب کے سامنے بلند آواز سے گریہ کرنے سے پیدا ہوگئی تھی۔

پھر ایسا معلوم ہوا جیسے 1915 سے اب تک کا فصل زمانی و مکانی یک قلم مٹ گیا ہو اور ذاکر صاحب کے ساتھ اور ان سے دور اور نزدیک رہنے کے سارے واقعات، اور کیسے کیسے واقعات، جن سے محبت و منزلت کی زندگی عبارت تھی اپنے تمام تنوع وتفصیل کے ساتھ دفعتاً حافظے میں جگمگا اُٹھے ہوں ماضی اور حال پر ایک ناچیز مخلوق کو یہ قدرت حاصل ہوتو اس علیم وقدیر کے اختیار واقتدار کے بارے میں کون شک کرسکتا ہے جس کی ذات میں ماضی، حال اور مستقبل بیک وقت و ہمہ وقت پیوست و پائندہ ہوں۔ مستقبل کا علم مخلوق کے لیے چاہے جتنا ناممکن ہو خدا نے ہم کو یہ استعداد ضرور بخشی ہے کہ ہم مستقبل پر حکم نہ چلاسکیں تو اس کے غلام بھی نہ بنیں۔ انسانی زندگی میں ماضی اور حال ہی کے خیاباں اور خارزار سے مستقبل کا خیاباں اور خارزار نمو اور

نمود پاتا ہے! جو شخص ذاکر صاحب کے اس دنیا کے بے شمار حسنات سے واقف ہو وہ ان کی آخرت کے بیش از بیش اجر و انعام کا اندازہ آسانی کے ساتھ لگا سکتا ہے۔

جو پیدا ہوا وہ مرے گا۔ اس سے زیادہ مہیب، نا قابلِ فہم اور نا قابلِ انکار حقیقت اب تک دریافت نہیں ہو سکی ہے۔ کتنی برحق اور کیسی کرب انگیز! یہ کرب کتنا بڑھ جاتا ہے، جب رخصت ہونے والے میں وہ صفات یکجا ہو گئی ہوں جن کو اس نے نفس کے کیسے سرکش مطالبات سے منہ موڑ کر جن سے اس زندگیٔ دوروزہ کی لذّتیں وابستہ ہوں جو زندگی کے دوروزہ ہونے کی وجہ سے اور زیادہ پُرکشش اور نا قابلِ تسخیر ہوتی ہیں، اپنے اور اپنوں کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کی اچھائی اور بھلائی کے لیے اکتساب کیے ہوں۔ موت پر اب تک صرف انسانیت فتح پا سکی ہے۔ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ فہم و ادراک سے بیروں و برتر مشیت الٰہی میں انسان کا درجہ کتنا حسین و عظیم ہے۔ ذاکر صاحب اس حسین و عظیم کا نمونہ و نمائندہ تھے۔ کہتے ہیں ہر شخص کا مقدر پہلے سے متعین ہو چکا ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتا۔ غالب نے اسی مایوس و منفی تصوّر کے پیش نظر اپنی بے دلی اور بے باکی کا اظہار کیا ہے، جب وہ کہتے ہیں ؎

نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں مَیں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

لیکن اس جہان سے ایسے مردان حق بیں و حق آگاہ گزرے ہیں اور گزرتے رہتے ہیں جن کو اپنی تقدیر اور اپنے ساتھ انسانیت کی تقدیر لکھنے کی تائید اس قدر جلیل اور رحمتِ عظیم سے ملتی ہے جس کا انکشاف اور جس پر ایمان انسانی شعور و شرف کی معراج ہے۔ ذاکر صاحب کو میں ان ہی مردان حق بیں و حق آگاہ میں سمجھتا ہوں۔ بڑے آدمیوں کی زندگی یہی بتاتی ہے کہ وہ جس درجے پر فائز ہوئے وہ ان کو کسی صبح و شام کو قانوناً یا اتفاقاً نہیں مل گیا تھا بلکہ بہت دنوں میں بڑی سخت آزمائش سے گزرنے کے بعد میسّر آیا تھا۔ مجبوری یا مختاری کا مسئلہ اتنا اعتراف و انقیاد کا نہیں ہے جتنا عزم و اعتقاد کا۔ خدا اور انسان کا ایسا تصوّر بھی ہو سکتا ہے جہاں مروّجہ نظریہ جبر خدا اور انسان دونوں کے شایانِ شان نظر نہ آئے۔ خدا نے انسان کو جب اپنے پر بنایا ہے تو اس میں زیادہ صفات ایسی ہی رکھی ہوں گی جو دونوں کی منزلت پر گواہ ہوں۔ یہ صفات وہ ہوں گی جو

صرف انسان کو ودیعت ہو سکتی ہیں، فرشتوں کو نہیں۔ اس لیے کہ موخر الذکر کو جرأت اقدام (Initiative) نہیں دی گئی ہے۔ ان کے لیے صرف ایک وظیفہ انقیاد و طاعت کا مقرر ہے جس سے وہ باہر نہیں ہو سکتے۔ دلیل نہیں اپنے احساس کی بنا پر کہوں گا کہ جب کبھی خیر کی طرف مائل ہوا تو بے اختیار محسوس کیا جیسے یہ خدا کی طرف سے مجھے دیا ہوا اختیار ہے جسے میں پوری مختاری سے کام میں لا رہا ہوں۔ لیکن جب کبھی برائی نے کھینچا اور اس کا ارتکاب کیا تو ہمیشہ اپنے اختیار کو اس کا باعث سمجھا۔ جبر و اختیار کی میرے نزدیک ایک تعبیر یہ بھی ہے۔ یہ مثل صحیح ہے کہ کوئی شخص اپنے نج کے ملازم کی نظر میں دیر تک معصوم یا مقدس (سینٹ) نہیں رہ سکتا۔ نج کا سادہ لوح ملازم مالک یا مرشد کی کمزوری یا کمزوریوں کو اس کی کرامات پر بھی محمول کر سکتا ہے۔ ایسے ملازم سے کہیں زیادہ ساتھی طالب علموں کی نظر ہمہ گیر، ہمہ آشنا، سفاک اور بے باک ہوتی ہے جیسے ایکسرے کی شعاعیں جو گوشت اور ہڈی میں نفوذ کر کے صورت حال کا انکشاف کر لیتی ہیں۔ بعض ساتھی طالب علموں کا وتیرہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے بہتر و برتر رفیق یا حریف کی معمولی سے معمولی کمزوری کا پتا لگا کر اپنی سنگین سے سنگین کمزوری یا لغزش کو وجہ جواز قرار دیتے ہیں۔ ادنیٰ درجے کے شخص کو سب سے زیادہ تسکین اسی طرح کی نالائقی میں ملتی ہے۔ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ اور ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے ذاکر صاحب کے ساتھی ابھی کافی تعداد میں بقید حیات ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہوں گے جو ذاکر صاحب کو عزیز و محترم نہ رکھتے ہوں گے ایسے بھی مل جائیں گے جو اُن سے بغض و کینہ رکھتے ہوں گے۔ وہ بھی نہیں بتا سکتے کہ ذاکر صاحب سے کبھی کوئی لغزش ایسی ہوئی جو سنِ شعور سے فارغ التحصیل ہونے تک ان کے اچھے سے اچھے طالب علم، اچھے سے اچھے رفیق اور اچھے سے اچھے انسان ہونے کی حیثیت کو بے نور یا داغ دار کرتی ہو۔

افترا پردازی، شر انگیزی اور آبروریزی کا سب سے بڑا موقع وہ ہوتا ہے جب کوئی شخص الیکشن میں منتخب ہونے کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ کالج کے زمانے میں ذاکر صاحب کو اس آزمائش سے گزرنا پڑا تھا۔ جب وہ یونین کے نائب صدر ہونے کے اُمیدوار تھے۔ اس زمانے میں یونین کے نائب صدر کی وہی حیثیت تھی جو آج صدر کی ہے۔ طالب علموں کا سب سے بڑا نمائندہ ہونے کے اعتبار سے اس کی منزلت قریب قریب اتنی ہی تھی جتنی اسٹاف کے کسی لکچرر

کی۔ کتنا فصل اور فرق آگیا ہے اس عہد کے طالب علموں کے نمائندے کے درمیان۔ پہلے وہ اپنی تعلیم گاہ کا سفیر اور اس کی روایات کا امین ہوتا تھا۔ اب سیاسی اشخاص اور اداروں کا تابع دار و حکم بردار۔ کیسی خواری، کتنی عبرت! الیکشن سے زیادہ معرکے اور دھوم کی کوئی اور تقریب کالج میں نہیں منائی جاتی تھی۔ بے ہودگی نام کو نہ ہوتی جو آج کل کے الیکشنوں میں بالعموم دیکھی جاتی ہے۔ یہ الیکشن سیاسی پرچھائیوں میں منعقد ہوتے ہیں اور جہاں سیاسی پرچھائیاں پڑ رہی ہوں وہاں کیا نہ ہوتا ہوگا۔ کالج کے اُن انتخابات میں شریف گھرانوں کے نوجوان جن کی تربیت اچھی روایات اور صحت مند ماحول میں ہوئی ہوتی شوخی و شرارت کے ایسے شگوفے چھوڑتے کہ حریف بھی داد دیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ الیکشن کے زمانے کی اُن گمنام تحریروں (نظم و نثر) کو دیکھ کر یہ بات ماننی پڑتی تھی کہ عریاں نگاری دراصل فن کار کی نارسائی ہے۔ ورنہ لکھنے کا سلیقہ ہو اور ذہنیت مریضانہ نہ ہو تو عریانی، شوخ شگفتگی یا شگفتہ شوخی سے متجاوز نہیں ہوتی۔ کیسے کیسے گمنام فن کار اس زمانے میں کالج میں تھے۔ یا ذاکر صاحب کا یہ تن و تنہا امتیاز ہے کہ ان پر کسی قسم کے چھینٹے نہیں اُڑائے گئے۔ طنز اور ہجو کے تو کیا خوش طبعی اور شوخی کے بھی نہیں۔

وہ زمانہ کبھی نہ بھولے گا اور ذاکر صاحب کے اُٹھ جانے کے بعد اس کو بھلا دینے یا اس کی شدت کے کم ہونے کا امکان اور بھی کم ہو گیا جب وہ صدر مملکت کے انتخاب کے لیے کھڑے ہوئے تھے اور پریس کا ایک سیکشن ان کے کردار کو مسخ اور مجروح کرنے کے لیے کیسی کیسی نجاست اُچھال رہا تھا۔ فتنہ سازی، افترا پردازی اور آبرو ریزی کی کوئی حد نہیں چھوڑی تھی۔ اتنا تک لحاظ نہیں رکھا تھا کہ الیکشن کسی تربیت نایافتہ دور افتادہ گاؤں کی پنچایت کا نہیں۔ ہندوستان کے صدر مملکت کا تھا۔ انتخاب کے زمانے میں فریقین کے ہفوات پڑھنے سے حتی الوسع بچتا ہوں۔ لیکن ذاکر صاحب سے متعلق اس پریس کی ہرزہ سرائی پر سرسری نظر ڈال لیتا تھا۔ اس خیال سے کہ شاید دو چار ہفتے کے اندر اس پریس کو ذاکر صاحب سے متعلق کچھ ایسی باتیں دریافت ہو گئی ہوں جو مجھ کو ان سے قریب رہتے ہوئے 52 سال میں نہ معلوم ہو سکیں۔ آخر میں صرف یہ معلوم ہوا کہ ذاکر صاحب کے بارے میں جن باتوں کی تشہیر کی گئی تھی وہ ان کی وقعت کو کم نہیں بلکہ بڑھاتی تھیں اور کوئی ایسا نہ تھا جو اِن باتوں سے پہلے واقف نہ تھا۔ ذاکر صاحب ان چند لوگوں

میں تھے یا شاید تنہا ایسے شخص تھے جن کے خلاف کوئی سیاسی یا فرقہ وارانہ جماعت کوئی لغزش نہ دریافت کرسکی نہ ایجاد کرسکی۔

بایں ہمہ ذاکر صاحب شروع سے آخر تک کبھی بھی رہن سہن، شکل وصورت، وضع قطع، میل جول، ہنسنے بولنے، رزم و بزم، تفریح وتفنن کے اعتبار سے دور دور تک عابد وزاہد یا سادھو سنت نہ تھے بلکہ ان میں تھے جن کے بغیر ہر محفل سونی ہوتی تھی۔ جہاں ہوتے اس کی رونق و اہمیت کئی گُنا بڑھ جاتی۔ اجتماع کیسا ہی ہو، مہمان خصوصی کوئی ہو، سب کی نظر ذاکر صاحب ہی پر پڑتی۔ ان کی موجودگی سے مجلس کا ٹون صحت مند خوش گوار اور بلند ہو جاتا۔ ذہانت، شخصیت اور انسانیت میں سب ان کو اپنے سے بلند و بہتر سمجھتے تھے۔ ان کے معاصرین خواہ شناسا ہوں یا اجنبی کسی جولانگاہ میں ذاکر صاحب کو رشک و رقابت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ وہ ہر ایک کے محبوب و محترم تھے۔ ہر شخص ان کی خوبیوں کا خوشی اور فخر سے اعتراف کرتا۔ اس عام محبت و عقیدت کو ان روایات سے بھی تائید ملی تھی جو ذاکر صاحب کے دو بڑے نیک نام اور نام ور حقیقی بھائیوں نے کالج میں چھوڑی تھیں۔ کیا بتاؤں اس زمانے کے کالج کے شریف نوجوانوں میں اعلیٰ روایات کی کیسی کارفرمائی تھی۔ اس کا کتنا احترام کیا جاتا تھا۔ روایات نہ ہونے پر یا اس بارگراں و گرامی کو اُٹھانے کی توفیق نہ ہونے ہی سے تو وہ بُرے دن دیکھنے پڑ رہے ہیں جو بجائے خود بُرے نہیں ہوتے صرف مشکل تر اور عجیب تر تقاضے لاتے ہیں۔ جن سے اپنی بعض کمزوریوں کے سبب سے نہ ہم آنکھ ملا سکتے ہیں نہ پنجہ۔ اس طرح اس مے مردافگن عشق کو کوئی حریف نہیں ملتا۔

ذاکر صاحب کے بعد ان کی قد وقامت کی کوئی شخصیت علی گڑھ کے اُفق پر طلوع ہو سکے گی یا نہیں۔ اس کا جواب تلاش کرنا اتنا ضروری نہیں معلوم ہوتا جتنا اس کے لیے حوصلہ رکھنا اور دعا کرتے رہنا۔ یہ اس لیے کہتا ہوں کہ جیسا کہ ہوتا آیا ہے ایسا شخص علی گڑھ ہی کے رندان قدح خوار سے اُٹھے گا۔

ایم۔اے۔او کالج کی اس عہد کی فضا جو سرسید اور ان کے رفقائے کرام کی شخصیت اور خدمات سے تازہ وتابناک تھی اور ذاکر صاحب کی طویل رفاقت نے اچھا آدمی بننے اور رہنے

کا شوق دیا۔ اس کا نہ دعویٰ نہ ایسے دعوے کی کوئی اہمیت کہ اس شوق نے مجھے تمام کمزوریوں سے پاک کر دیا۔ ائمہ معصومین سے قطع نظر، کمزوریوں سے پاک ہونا انسان کی فضیلت نہیں اس لیے کہ یہ کمزوریاں بعض بڑی مصالح کی بنا پر اس میں رکھی گئی ہیں۔ البتہ علی گڑھ اور اس سے متعلق اچھی باتیں جسم و جان میں اس طرح پیوست ہوگئیں کہ دوسرے اور تیسرے درجے کی باتوں کی طرف دل مائل نہیں ہوا۔ جیسے امراض سے محفوظ رکھنے کے لیے فطرت انسانی جسم میں دفاعی اور امتناعی قوت ودیعت کر دیتی ہے، ان عوامل نے ہر کرائسس (نازک مواقع) میں میری مدد کی۔ تقاضائے عمر سے جوں جوں قویٰ ضعیف اور معطل ہونے لگتے ہیں، امراض سے بچنے یا ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت گھٹنے لگتی ہے، اور وہ وقت آجاتا ہے جو بالآخر آ کر رہتا ہے۔ دوسری طرف اخلاقی توانائی جو صرف انسان کا کارنامہ ہے مرورِ ایام سے گھٹتی نہیں، بلکہ بڑھتی رہتی ہے۔ اس سے فطرت اور انسان دونوں کے مرتبہ اور سطح کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ادارے اشخاص سے اہمیت حاصل کرتے ہیں اور اسی اعتبار سے یہ مردود یا معظم قرار پاتے ہیں۔ میرے عہد کا علی گڑھ اس کے بانیٔ اعظم کے بعد جن شخصیتوں سے معظم ہوا اُن میں ذاکر صاحب کا درجہ نمایاں اور قابلِ فخر ہے۔

مسلمان ہوں، عبادت مآبوں کی نہیں خدمت گزاروں کی نظر میں اپنی اچھی صلاحیتوں یا کارگزاریوں کا سرچشمہ ان عقائد، اعمال، اقدار، احکام اور روایات کو جانتا ہوں جو اللہ نے اپنے اچھے اور اچھے سے اچھے بندوں کے ذریعے مجھ تک پہنچائے اور پہنچاتا رہتا ہے۔ ان میں ان عزیزوں، دوستوں اور بزرگوں کا بھی کچھ کم حصہ نہیں ہے جن کی اعلیٰ شخصیت اور کردار نے اللہ کے احکام اور اس کے بندوں کے حقوق کو پہچاننے اور ان کو بجا لانے میں میری ہمت افزائی کی۔ علی گڑھ سے تقریباً مدت العمر سے وابستہ ہوں۔ یہاں ایسے اشخاص اور حالات سے بھی سابقہ ہوا جن کو اپنے زندگی کے اچھے دنوں میں شمار نہیں کرتا۔ ایسے اشخاص اور امور سے سابقہ ہونے پر اور زیادہ اس کا یقین ہوا کہ ہماری تاریخی عظمتوں اور خودداریوں کا جس کا ایک سمبل علی گڑھ بھی تھا، کیسا عجیب و غریب فیضان تھا کہ اس نے کسی حال میں اپنے یا دوسرے سے کبھی مایوس یا بیزار نہیں ہونے دیا۔ بلکہ یہ عظیم حقیقت منکشف کر دی کہ نیکی اور سچائی جتنی اقلیت میں ہوگی اتنی ہی زیادہ بالآخر بدی اور باطل کی قوتوں پر غالب آئے گی۔ ذاکر صاحب جامع حیثیات

اور جامع حسنات دونوں تھے۔ گذشتہ 70-60 سال میں ہندوستان کے مسلمانوں میں، جن میں دوسرے ممالک کے مسلمانوں کو شامل کرلیا جائے۔ جب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مسلمانوں میں ذاکر صاحب جیسا جامع صفات شخص پیدا نہیں ہوا۔

مدت الایاّم طرح طرح کے عوارض کا شکار رہنے کے باعث ہمارا مزاج کچھ اس طرح کا بن گیا ہے کہ ہم اپنے اچھے افراد، اداروں، اقدار، روایات اور اخلاق و مذہب میں کوئی نہ کوئی خامی فرض کر لینے اور اس کے اُچھالنے میں غیر معمولی تسکین و فخر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسوں کے نزدیک کوئی بڑائی بڑائی نہیں ہے، غلط اندیشی یا خوش فہمی ہے! البتہ اتنا سمجھنے سے معذور رہتے ہیں کہ بڑائی نالائقی سے کبھی کبھی اس طرح بھی انتقام لیتی ہے۔ اگر خدا، قیامت، سزا جزا، رسول پاک (آیۂ رحمت) کی شفاعت اور تخلیق انسان کا مقصد و عظمت کا وہ تصور صحیح ہے جو مذہب نے بتایا ہے اور جس پر مجھ سے پہلے اور آج بھی بے شمار اور بدرجہا بہتر و برتر مسلمانوں کا ایمان رہا ہے۔ جن کے نقوش تاریخ کے صفحات اور دنیا کے چپّے چپّے پر پھیلے ہوئے ہیں تو اس پر یقین رکھتا ہوں کہ ذاکر صاحب آخرت کی ہر منزل میں اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں عقل و عشق کی اسی سپردگی و سرفرازی کے ساتھ حاضر ہوں گے اور واصل رہیں گے جن کی جھلک ان کی زندگی میں ہم دیکھتے تھے، جب وہ خدا کے بندوں کے درمیان تھے، ہر چھوٹے بڑے کے رنج و راحت میں شریک ہوتے اس وقار، محبت اور فروتنی سے جو اچھے مسلمان اور اچھے انسان کا شیوہ رہا ہے۔

ذاکر صاحب ہر شخص کو عزّت و محبت کا مستحق سمجھتے تھے۔ طالب علمی کی زندگی سے لے کر آخری جدائی تک اُنھوں نے بھولے سے بھی کسی موقع پر اپنی برتری نہیں جتائی۔ پردہ داری اور پردہ پوشی، عفو و درگزر ان کی سیرت کا بڑا نمایاں اور قیمتی جوہر تھا۔ کسی موضوع پر بحث ہوتی، اس میں تحمل، توازن اور خوش دلی ملتی۔ گفتگو سہل اور سادہ ہوتی ہوئی پُر معنی، فکر انگیز، اور پُر معنی اور فکر انگیز ہوتے ہوئے سہل اور سادہ ہوتی۔ یہ بات میں نے بڑے بڑے مشیخت مآب لوگوں میں نہیں پائی۔ علمی بحث میں قطعاً علمی انداز اور اعلیٰ سطح پیش نظر رکھتے۔ اشارۃً کنایۃً بھی اس کا اظہار نہ ہوتا کہ اپنی بات منوانا چاہتے ہیں۔ جب کہ آج کل کے کتنے لکھے پڑھے، برخود غلط

بوڑھے، اختلاف رائے پر، اگر مخاطب شریف ہوتو آبرو ریزی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کوئی مناقشہ ہوتا تو صلح صفائی کرانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے تھے۔ فریقین کتنے ہی ضدی اور غیر ذمہ دار کیوں نہ ہوتے ذاکر صاحب کے حکم بنائے جانے پر بلا تامّل راضی ہو جاتے۔ اس کی بڑی اچھی مثالیں ان کی صدارت میں راجیہ سبھا کے اجلاسوں میں ملتی تھیں۔ ان کی وفات پر سیاسی جماعت کے نمائندوں نے جو ہدیۂ عقیدت پیش کیے ان میں ایک ممتاز کمیونسٹ ممبر کا یہ کہنا کہ ذاکر صاحب اپنی صدارت میں اپوزیشن کے تحفظ کو بھی ملحوظ رکھتے تھے۔ بڑا تاریخی اور قابل قدر فقرہ ہے۔ شاید کسی اپوزیشن نے دنیا کے کسی سیاسی ادارے کے صدر کے اعزاز میں ایسا ہدیہ پیش نہیں کیا ہوگا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ذاکر صاحب کے تصفیہ پر کسی نے بددلی یا اپنے غیر مطمئن ہونے کا اظہار کیا ہو۔ اس لیے کہ وہ دانش مندی سے اور قطعاً غیر جانب دار ہو کر تصفیہ کرانے کی کوشش کرتے تھے۔ علی گڑھ میں طلبا کی یونین کے نائب صدارت سے لے کر ہندوستان یونین کی صدارت تک ہر موقع اور معرکہ میں ذاکر صاحب کی شخصی دانش و دیانت ان کے منصب پر سایہ فگن اور اثر انداز رہی۔ بڑے آدمی کی یہ بڑی قابلِ لحاظ علامت ہے۔

مایوس وملول کو اُمید و اعتماد سے آشنا کرا دینا ذاکر صاحب کی شخصیت کا غیر معمولی امتیاز تھا۔ وہ معمولی باتوں کی تلقین کرتے تھے۔ لیکن بڑے نتائج کی بشارت دیتے جو بالعموم صحیح ثابت ہوتی۔ ممکن ہے ایسے لوگ ہوں جو ذاکر صاحب کے مشورہ پر عمل کر کے ثروت واقتدار کے درجے پر پہنچ گئے ہوں۔ لیکن میرے علم میں متوسط درجے کے بیش تر ایسے لوگ ہیں جو ذاکر صاحب کے مشورہ پر کاربند ہو کر اور معمولی کامیابیوں سے دوچار ہو کر اپنے سے مسرور و مطمئن رہنے لگے۔ ان میں یہ تبدیلی کسی مجہول قناعت کے سبب سے نہ آتی جو افراد وقوم کی حوصلہ مندی اور خطر پسندی کو مفلوج کر دیتی ہے۔ بلکہ یہ اس سادہ پسندی اور بلند خیالی کی بنا پر ہوتا جو ذاکر صاحب ان میں پیدا کر دیتے۔ ذاکر صاحب جب تک جامعہ ملیہ کے براہ راست سردار و سالار رہے، اراکین جامعہ میں قناعت کی تونگری بڑی واضح تھی۔ ذاکر صاحب آج سے نہیں ہمیشہ سے ینگ ٹرکس (Young Truks) اور اولڈ گارڈ (Old Guards) دونوں کی نظر میں یکساں معتبر و محترم رہے، اس لیے نہیں کہ وہ کوئی بے ضرر سادھو یا پیر فقیر تھے بلکہ

دونوں جانتے تھے کہ ذاکر صاحب ان کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف تھے اور کسی قسم کی دھاندلی یا للو پتو سے زیر نہیں کیے جاسکتے تھے، اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھے کہ ذاکر صاحب ہمیشہ سے ینگ ٹرکس سے زیادہ ینگ ٹرک اور اولڈ گارڈس سے زیادہ اولڈ گارڈ تھے۔ ایک چیز جو اب تک جامعہ کے چھوٹے بڑوں میں نمایاں ہے جو کلیتہً ذاکر صاحب کی دین اور جامعہ کی روایت بن گئی ہے وہ ارباب جامعہ کا سلیقہ، صفائی، میل محبت سے رہنا، گردوپیش کو صحت افزا، خوب صورت اور دل کشا رکھنا اور بالعموم صاف ستھرا اور سجل لباس پہننا ہے۔

جامعہ اب بہت پھیل گئی ہے۔ علی گڑھ کا بھی یہی حال ہے۔ علمی و تہذیبی اداروں کو جیسے کہ یہ ہیں اس طور سے پھیلانا یا پھیلنے دینا اچھا نہیں۔ ان کو علمی و تہذیبی ہی رکھنا بہتر ہے۔ دوسرے اور مختلف خطوط پر ان کی توسیع بے معنی بھی ہے اور مضر بھی۔ یونیورسٹیوں کو کثیر المقاصد، ہمہ جہت اور ہمہ گیر نہ ہونا چاہیے۔ ہر علم وفن کی یونیورسٹی کا علاحدہ ہونا ضروری ہے۔ تاکہ تمام تر توجہ اور تگ و تاز اسی مقصد کے حصول پر مرکوز رہ سکے۔ بہ صورت دیگر ادارے کے انتظامی و اخلاقی دروبست میں فرق آنے لگتا ہے۔ گو مخصوص دشواریوں کی بنا پر ایسا کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ باتیں خاص طور پر اس لیے کہنی پڑیں کہ کثیر المقاصد اور ہمہ جہت و ہمہ گیر یونیورسٹیوں کے لیے سالارِ اعظم بھی ذاکر صاحب ہی کی مانند ہمہ صفت موصوف ہونا چاہیے۔ وہ ہر طرح کے تعلیمی اداروں کے تقاضوں کو پہچانتے اور اُن سے عہدہ برآ ہونے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان میں ایسی اخلاقی توانائی بلندی اور دیدہ و دانش تھی جن سے ادارے کی قدر و قیمت اور اس کے متعلقین و متوسلین اپنی بہترین صلاحیتوں کو بر سر کار لانا اپنا فریضہ اور فخر جانتے تھے۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کے نہ ہونے سے آج تعلیمی اداروں میں وہ سب ہو رہا ہے جو نہ ہونا چاہیے۔ لیکن ذاکر صاحب جیسی شخصیت اب پیدا کہاں ہو رہی ہے۔ جن عقائد اقدام اور روایات کے وہ ساختہ پرداختہ تھے ان کی قدر و قیمت نہیں رہی۔ لیکن ان کے فقدان کو ہم ہر لحظہ محسوس کرتے رہتے ہیں۔ اکثر یہاں تک خیال آیا ہے کہ استثنا سے قطع نظر آج کل کی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اس قد و قامت کے کیوں نہیں ہوتے جتنے پچاس ساٹھ سال پہلے بیش تر اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر اور کالجوں کے پرنسپل ہوتے تھے۔

ذاکر صاحب کا ماضی ان کے حال سے اور حال ان کے ماضی سے کم شان دار نہیں رہا ہے، لیکن اس کا تذکرہ انھوں نے کبھی نہیں کیا۔ ہر بڑے آدمی کی طرح ان کو اس امر کا احساس تھا کہ حال کو ماضی پر فخر کرنے کے بجائے ماضی کو حال پر فخر کرنا چاہیے۔ کسی محفل میں ہوں۔ نا قابلِ برداشت بوڑھوں اور معصوم بچوں کی مانند نہ وہ اس کے خواہش مند ہوتے نہ اسے گوارا کر سکتے تھے کہ حاضرین کی تمام تر توجہ تواضع وتکریم ان ہی کے لیے وقف رہے۔ اس کے برخلاف خاص طور پر کوشاں رہتے تھے کہ وہ خود دوسروں کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ رہیں۔ میں نے ان کو کسی سے کانا پھوسی کرتے آج تک نہیں دیکھا۔ ذاکر صاحب کا یہ امتیاز بہ ذات خود مجھے نہایت درجہ پسند تھا۔ اس لیے کہ میں نے بعض تعلیم یافتہ مہذب اور ماڈرن مردوں عورتوں کو اس بدتمیزی میں مبتلا پایا کہ دو سے زیادہ آدمی موجود ہوں اور دو شخص کانا پھوسی شروع کر دیں۔ اس سے بھی بڑی بدتمیزی یہ ہے کہ حاضرین میں سے کوئی شخص بالخصوص میزبان پوچھنے لگے کہ کیا کانا پھوسی ہو رہی تھی! بدنصیبی سے کسی شخص کو بدنصیبی یا رسوائی پیش آ جائے تو اس کے تجسس یا ٹوہ لگانے سے جیسا کہ بعض نالائقوں کا شیوہ ہے بہت دور رہ کر اس کی پردہ پوشی کرنا ذاکر صاحب اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ بظاہر یہ بات معمولی معلوم ہوتی ہے، لیکن آج کل سوسائٹی کا جو حال ہے اس میں جس بے رحمی اور بے حیائی سے ہم سب بالخصوص تعلیم یافتہ، معمر اور مسلمان کسی بدنصیب کی رسوائی کی اشاعت میں حصہ لیتے اور لطف اُٹھاتے ہیں وہ بھی کوئی راز نہیں ہے۔

ذاکر صاحب نے شاید ہی کسی کو تم کہا ہو۔ بڑوں کا کیا ذکر چھوٹے بچوں کو بھی وہ ہمیشہ آپ کہہ کر مخاطب کرتے اور پیار کرتے تھے۔ بچے بوڑھوں کی طرف کم ملتفت ہوتے ہیں، لیکن ذاکر صاحب میں ان کے لیے کچھ ایسی کشش تھی کہ بے اختیار ان کی طرف مائل ہوتے۔ جامعہ کے ابتدائی دنوں میں جب وہ اوکھلا (جامعہ نگر) کو منتقل ہوئی تھی کبھی وہاں جانے کا اتفاق ہوتا تو ہمیشہ یہی محسوس ہوتا کہ جیسے جامعہ کی فضا اور جامعہ کا سمبل (نشان امتیاز) معصوم بچے اور معظم ذاکر صاحب تھے۔ ذاکر صاحب کی شفقت اور بچوں کی شگفتگی کے ساتھ معلوم نہیں کیوں اس وقت شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم کی یاد آئی۔ کتنی حزیں اور دل نشین! لیکن جلد ہی ذاکر صاحب،

شفیق صاحب اور جامعہ کے اکٹھا تصور سے تسکین بھی ملی ۔ اعلیٰ یادیں اور عظیم یادگاریں چھوڑ جانا
بھی انسان کا کتنا بڑا امتیاز ہے جیسے خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں میں یہ لوگ اضافہ کرتے جاتے
ہوں ۔ ذاکر صاحب بچوں کو کوئی قصہ کہانی نہ سناتے نہ ان کو نصیحت کرتے یاڈراتے ۔ ہمیشہ ان کی
پسند یا ناپسند، کھیل کود، لباس اور کھانے پینے اور ان کے میل و محبت کے بارے میں اس لطف و
محبت سے باتیں کرتے جس میں اب تک ان کا نظیر دیکھنے میں نہیں آیا۔ بچے نہ ان کو بوڑھا سمجھتے
نہ جوان نہ ملاّ یا ماسٹر نہ اپنا کوئی رشتہ دار بلکہ اپنا جیسا سمجھنے لگتے ۔ بوڑھے پر کم سن، معصوم بچوں کا
یہ اعتبار کچھ کم قابلِ فخر امتیاز نہیں ہے ۔ جس پر سب سے زیادہ ایک معلّم ہی فخر کر سکتا ہے ۔ انہی
روزوں میں ایک شام کو حسبِ معمول ذاکر صاحب اس میدان کی طرف جانکلے، جہاں چھوٹے
بچے کھیل میں ہمہ تن مصروف دُھومیں مچارہے تھے ۔ ایک بچے نے ذاکر صاحب کو آتے دیکھا تو
کھیل چھوڑ کر دوڑتا ہوا آیا اور ان کی انگلی تھام کر کچھ دور چلا ۔ لیکن توجہ تمام تر ساتھی کھلاڑیوں کی
طرف تھی ۔ بالآخر نہ رہا گیا، اُنگلی چھوڑ کر کچھ کہے سنے یا رسم بجالائے بغیر دوڑ کر کھیل میں شامل
ہوگیا۔ دو تین اور بچوں نے بالکل اسی طرح اس ڈرامے کو دُہرایا ذاکر صاحب مسکرائے،
پھر بولے، یہ بچے بھی خوب ہوتے ہیں ۔

ذاکر صاحب نے اپنے آلام و آزار کا خواہ وہ جسمانی ہوں یا ذہنی برملا کبھی اظہار نہیں
کیا ۔ کسی تکلیف میں مبتلا ہو جاتے تو دریافت حال کرنے پر یہی بتاتے کہ تیزی سے زائل ہو رہی
ہے ۔ کبھی کبھی اس تیزی سے جیسے لاحق ہونے سے پہلے ہی زائل ہونے لگی ہو! ذاکر صاحب پر
بیماری کے شدائد غالب آنے لگتے تو کراہنے اور بے اختیار ہونے کے بجائے کسی خوش الحان
حافظ یا قاری سے کلام پاک سنتے ۔ رفتہ رفتہ ان پر سکون طاری ہونے لگتا اور نیند آجاتی ۔ اللہ اور
اس کے کلام میں اس طرح تشفّی و تقویت پانے والے وہی ذاکر صاحب تھے جنھوں نے دیارِ غیر
میں غضب ناک خونیوں کے نرغے میں تنہا، بیماری سے نحیف و نزار، قاتلوں کے بھیانک
اشاروں و ارادوں کے جواب میں ایک تبسّم کے ساتھ کہا، 'الحمد اللہ مسلمان ہوں جہاں چلنا ہو
چلیئے!' جاننے پہچاننے والے یا دوست اور عزیز آس پاس ہوں تو نہ معلوم کتنی باتوں کا لحاظ کرتے
ہوئے آدمی اپنی ثابت قدمی اور دلیری کا اظہار کر سکتا ہے ۔ لیکن جہاں دور دور تک اپنا کوئی نہ ہو

اور موت نزدیک سے نزدیک آ چکی ہو وہاں صرف اللہ کے دیے ہوئے ایمان وعقیدے پر بھروسا کر کے قاتلوں کو ایسے الفاظ میں، اس اطمینان و انداز سے چیلنج کر دینا معمولی بات نہ تھی۔ ہر مذہب کے پیروؤں میں ایسے لوگ ملتے ہیں جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنی عزیز ترین متاع قربان کر دی، لیکن اپنی زندگی میں اپنوں میں ایسی مثال دیکھی نہ سُنی۔ ان دنوں مسلمانوں کو جس قیامت کا سامنا ہے وہی کیا کم تھا کہ خود ان میں ایسے افراد کا ظہور ہونے لگا ہے جو اپنے اچھے سے اچھے لوگوں کو ان کی وفات کے بعد اپنی بڑی سے بڑی صلاحیتوں کا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔ اخلاق وشرافت کے صحیفہ میں ایک آیت اس مضمون کی بھی ملتی ہے کہ جس کی وفات ہوگئی ہو اس کے خلاف دشنام و بہتان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ جواب دینے سے محروم ہو چکا ہے۔ کسی مرحوم کی مفروضہ کمزوریوں کو اللہ کے سپرد کرنا کہ وہ بخش دے اور خود اس کی سیرت و شخصیت کو مجروح و مسخ کرنے کے لیے مسلسل نیش زنی اور زہر چکانی کرتے رہنا اور اس سے حظ اُٹھانا جس دماغی فتور اور نفسیاتی ناگفتنی کی علامت ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ مفاسد و مکائد کا یہ طائفہ اس درجہ نامبارک نہ ہوتا تو اس سے دور رہنے کو غالب نے ایسے انسانی الہامی انداز میں نہ کہا ہوتا۔

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی رایدرودے

علمائے سلف کے مقرر کیے ہوئے آئین وضوابط کے خطوط پر ذاکر صاحب نے مذہب کو قرین علم وحکمت ثابت کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ مذہب کے اوامر ونواہی کو زندگی میں برت کر مذہب کو قرینِ ثواب جاننے اور جتانے کے قائل تھے۔ حالت نزع میں مریض سے قریب اقربا واحباب کو کلام پاک اور کلمہ طیبہ پڑھنے کی جو ہدایت کی گئی ہے، ذاکر صاحب نے اسے اپنی زندگی میں سرمایۂ تسکین وطمانیت بنا لیا تھا۔ وفات کے بعد جب تک میت سپرد خاک نہیں کر دی گئی اور اس کے چند دنوں بعد تک خدا کے لاتعداد بندے ایصالِ ثواب کے لیے کلام پاک کی تلاوت کرتے رہے! گذشتہ چند صدیوں میں یہ شرف ایک دو ہی مسلمانوں کو نصیب ہوا ہوگا۔ اس سے ذاکر صاحب کی روح کو جو جسم کی ارضی و عارضی ربط سے رہا ہو کر

یوم الحساب تک آسودۂ رحمت رہے گی، اس کو کتنی تسکین، تطہیر و ترفع حاصل ہوا ہوگا۔ ہر مسلمان اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔

ذاکر صاحب ایک بار شدید انفلوئنزا میں مبتلا ہوئے۔ دونوں پھیپھڑے ماؤف اور ٹمپریچر 104، لیکن زبان سے بے اختیاری میں بھی کوئی کلمہ بیزاری، مایوسی یا تکلیف کا نہیں نکلتا تھا۔ چاہا کہ اس موقع پر وہ کلمات کہوں یا انداز اختیار کروں جو پہلے سے مقدر ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنی تکلیف کا نہیں میری دلچسپی کی باتوں کا ایسے ہموار اور اپنے مخصوص دل کش انداز میں ذکر چھیڑ دیا، جو اُن ہی کا حصہ تھا۔ فرمایا، ''آج رات دونوں[1] کھانے پر آرہے ہیں نا؟'' میں نے کہا۔ یہی کہنے آیا تھا کہ آپ کی طبیعت اتنی خراب ہے، یہ تقریب اور دن کے لیے کیوں نہ ملتوی کر دیجیے۔ بولے، نہیں۔ میرے بیمار ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان سبھوں کی موجودگی میں تکلیف کی طرف دھیان کم جائے گا۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق ڈنر ہوا۔ کھانے کی میز پر سب بیٹھ گئے اور کھانا شروع ہوا تو ذاکر صاحب نے اپنے سونے کے کمرے اور ڈائننگ

---

1. یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ میری سب سے چھوٹی لڑکی کی شادی ہوئی تھی۔ ذاکر صاحب نے لڑکی، اس کے شوہر اور بقیہ گھر والوں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ کچھ دنوں بعد لڑکی کا انتقال ہوگیا اس حادثے کو گزرے دس بارہ سال ہوگئے، لیکن اس نے مجھ سے وہ سب کچھ چھین لیا جن سے میں عبارت تھا اور جن کو حاصلِ حیات جانتا تھا۔ احباب اور اعزا جو میرے اس حال سے واقف ہیں وہ اس حادثے اور مرحومہ کا ذکر اشارتاً بھی میرے سامنے نہیں کرتے۔ اب جو کرتا رہتا ہوں وہ اس مجبوری اور ڈر کی بنا پر ہوتا ہے کہ اپنے اور پرائے لعنت نہ بھیجنے لگیں کہ نفس کے سارے مطالبات تو پورے کرتا ہے صرف کام نہیں کرتا، کیسی بے بسی اور اس سے بڑھی ہوئی بے اختیاری ہے کہ اس وقت اس سانحے کے ذکر سے نہ باز رہتے بن پڑتا ہے، نہ بیان کرنے کی ہمت ہوتی ہے۔ فانؔی کا یہ شعر فانی ہی کی زبان سے سنا ہے، لیکن اس وقت وہ اثر نہیں ہوا تھا جواب ہے ؂

جگ سُونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
دنیا جب بھی بستی تھی دنیا اب بھی بستی ہے

خیال ہے کہ یہ شعر میری حالت کو پہنچ کر فانؔی نے نہ کہا ہوگا۔ اب دعا ہے کہ کوئی دوسرا دو ہیں پہنچ کر اسے پڑھنے پر مجبور نہ ہو۔

روم کے درمیان حائل پردے کو ہٹوا دیا اور اپنی چارپائی کھانے کے کمرے کے سامنے کرالی۔ لیٹے لیٹے ہاتھوں کے اشارے اور تبسّم چہرے سے اپنی خوشی اور شفقت کی پھوہاریں بکھیرتے رہے کبھی کبھی دو ایک فقرے خوش طبعی کے اس لطف سے کہہ دیتے کہ فضا لہک جاتی اور مہمان نہال ہو جاتے۔ کھانا ختم ہو جانے کے بعد جب تک مہمان رخصت نہیں ہو گئے ان کے اس انداز دل نوازی سے سب سرفراز و شاد کام ہوتے رہے۔ جس تکلیف اور خطرے میں وہ مبتلا تھے، ڈاکٹروں کی جیسی ممانعت تھی اور رات جتنی گزر چکی تھی اس میں ذاکر صاحب کی یہ دوست داری اور نوازش اس وقت جس طرح یاد آرہی ہے اور جن بدلے ہوئے اور پھر کبھی نہ بدلنے والے حالات میں آرہی ہے، کیا بتاؤں اس وقت اس نے دل کا کیا حال کر دیا ہے۔

وائس پریسیڈنٹ شپ کے زمانے میں ایک بار زیادہ بیمار ہو گئے تھے۔ دو ہی ایک دن بعد یوم جمہوریہ کی تقریب تھی۔ صدر جمہوریہ خود علیل ہونے کے سبب سے تقریب میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک سلسلے میں دہلی جانا ہوا۔ ذاکر صاحب کو غیر معمولی حد تک کمزور پایا، لیکن مسکرا کر پذیرائی اس طور پر کی جیسے وہ نہیں میں بیمار اور تشفی و دل آسائی کا مستحق تھا۔ فرمایا، ڈاکٹروں نے چند طبعی تقاضوں کو پورا کرنے کے علاوہ دوسرے تمام شریفانہ تقاضے ممنوع قرار دے دیے ہیں۔ عرض کیا اس حال میں یومِ جمہوریہ کے طرح طرح کے آداب پورے کیے جاسکیں گے۔ جلوس کے مقررہ ضوابط کے ساتھ مسافت فوجی طریقے پر دیر تک کھڑے رہ کر سلامی لیتے اور دیتے رہنا تندرست آدمی کے لیے بھی مشکل ہے چہ جائیکہ آپ جس توانائی کا یہ عالم ہو۔ بولے ٹھیک ہے، لیکن حکومت نے اتنے دنوں تک اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کے مطابق مجھ سے جو سلوک کیا ہے وہ اس مقصد کے پیش نظر کیا ہے کہ صدر جب کبھی علیل ہوں یا کوئی اور اتفاق آن پڑے تو نائب صدر کی حیثیت سے ان کی ذمہ داری کو پورا کرنا میرا اوّلین فرض ہوگا۔ موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے میں نے موضوع گفتگو بدلنے کی کوشش کی اور کہا، آپ کا فرمانا درست لیکن جانا اتنا درست نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ واقعہ سخت ہو تو میں جان کو ہمیشہ عزیز رکھنے والوں میں رہا، اپنی ہی جان کو نہیں دوسروں کی بھی جان کو! ہنس پڑے پھر مدارات کا پروگرام شروع ہو گیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد رخصت ہو کر علی گڑھ واپس آ گیا، لیکن یہ تشویش برابر پیچھا کرتی

رہی کہ موقع اتنا اہم، صحت کا حال، پروگرام اتنا صبر آزما۔ خدا اپنا فضل رکھے، تقریب کی روئداد ریڈیو پر سُنی ۔ اخبار میں تصویر دیکھی تو ذاکر صاحب کو حسب حال ذاکر صاحب ہی پایا۔ جیسے نہ بیمار تھے نہ کمزور اور نہ کچھ اور۔ نہایت اعتماد و وقار کے ساتھ تیر کی مانند سیدھے کھڑے ہوئے سلامی لے رہے تھے۔ میرے لیے یہ تعجب کی بات نہ تھی لیکن خوشی کی بہت زیادہ رہی ہے۔ اندیشہ یا آزمائش کا موقع آن پڑا تو ذاکر صاحب کی کچھ باطنی طاقتیں بیدار ہو جاتیں اس لیے کہ ایسے مواقع پر اور یوں بھی میں نے ان کو مطلق کسی تردد یا تذبذب میں مبتلا نہ پایا۔ ان کو کسی اعلیٰ قوت پر کامل یقین تھا جس سے وہ ہر حال میں خیر و فلاح کی اُمید رکھتے تھے اور میں نے تو کچھ ایسا ہی دیکھا کہ ایک اعلیٰ قوت نے ذاکر صاحب کی ہمیشہ مدد کی۔ کرائسس کتنا ہی سنگین ہوتا ذاکر صاحب اس کا سامنا کھلے میدان، انتہائی امید و اعتماد کے ساتھ کرتے۔

مسلمان ہوں لیکن ایسا نہیں جس کی تقلید کی جائے۔ اسلام کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی بہت کم توفیق ہوئی۔ اس کے باوجود مسلمان ہونے کو بڑا شرف اور ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ خدا اور اس کے بندے دونوں کی طرف سے۔ اس سے اپنی ذہنی صلاحیتوں اور آرزو و عمل کو ہمہ وقت پرکھتے رہنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ اس نے اعلیٰ اور عظیم کا احساس دیا۔ اعلیٰ اور عظیم تک رسائی نہیں ہوئی لیکن ان کو کبھی اپنی پہنچ سے باہر نہیں سمجھا۔ مجھے عبادت پیشہ مسلمان زیادہ ملے ۔ عبادت شناس اور عبادت گزار بہت کم۔ عبادت کا مفہوم یا مقصد یہ نہیں کہ خدا سے مزدوری، خیرات، انعام، تاوان وصول کرنے یا دوسروں پر فضیلت اور تقویٰ جتانے یا ان کو سنگ سار کرنے کا حق اور اختیار حاصل ہو گیا ہو ہر پندار بدمذاقی ہے، لیکن عبادت کا پندار لعنت ہے۔ ایسی عبادت کی سزا مقرر ہے جو گناہ کی سزا سے زیادہ سخت اور عبرت انگیز ہو تو عجب نہیں۔ عبادت پیشہ عبادت کو وقتی فریضہ سمجھتا ہے۔ حالاں کہ عبادت ہمہ وقتی وظیفہ ہے، زندگی کے ہر شعوری فعل میں جاری و ساری۔ اس عبادت سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے۔ عبادت زندگی کو قبول کرنے کا اقرار و اقبال اور سعیِ عمل ہے۔ عبادت پیشہ اور عبادت گزار کا فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر اپنی عبادت اور اپنے احسانات سے ہر وقت ہر کس و ناکس کو مطلع کرتا رہے گا۔ جیسے ان کو چیلنج دے رہا ہو، عبادت گزار اپنی خدمات کو نہ کبھی ظاہر کرے گا نہ ظاہر ہونے دے گا بلکہ اس پر شرمندہ رہے گا

اور شکر گزار کہ خدا کی دی ہوئی زندگی جیسی نعمت اور سرفرازی کے مقابلے میں اس کی خدمات کتنی ناچیز ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں نے اسے قبول کرلیا تو اس کے لیے کتنا بڑا شرف ہوگا۔ خدا کی صفات کو جانتے اور مانتے ہوئے اس کو دھوکا دینے کی کوشش ایسی حماقت ہے جس کے ارتکاب کی ایک عبادت پیشہ ہی جرأت کرسکتا ہے۔

یہ جو بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن ہی گناہوں کو معاف کرے گا جو حق اللہ کے ادا کرنے میں غفلت سے سرزد ہوئے ہوں گے، دوسری طرف حق العباد کو پورا کرنے میں جو تقصیر ہوئی ہوگی اس کو اپنی طرف سے معاف نہ کرے گا بلکہ معاف کرنے کا تمام تر حق یا اختیار اس کو ہوگا جس کی حق تلفی کی گئی ہوگی۔ مجھے نہیں معلوم اسلام کے خدا کے علاوہ دوسرے مذاہب کے خداؤں نے بھی یہ حق اپنے بندوں کو دیا ہے یا نہیں اس سے ان لوگوں کو متنبہ ہونا اور رہنا چاہیے جو اللہ کی عبادت کی خانہ پُری کر کے اس کے بندوں کو اپنی طاقت، ہوس یا کینہ کا شکار بناتے ہیں۔ اللہ کی حکومت کو وہ ان زمین داروں کے تسلط کی مانند سمجھتے ہیں جو محصل یا اجارہ دار سے مقررہ رقم وصول کر کے اپنی رعایا کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے کہ جو چاہیں سلوک کریں۔ اس سلسلے میں شفیع المذنبین کے درجے کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔ شفاعت کا نکتہ اس میں پوشیدہ ہے کہ خدا نے انسان کی شفاعت انسان ہی کے ہاتھ میں نہیں تو انسان کے بھی ہاتھ میں کچھ رکھی ہے۔ اور انسان کا ارفع و اقدس نمونہ و نمائندہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ بات مشکل سے تصوّر میں آسکتی ہے کہ حضور اکرم خدا سے اس شخص کی شفاعت فرمائیں گے جس نے ساتھی انسانوں کا حق چھینا اور ان پر ظلم کیا ہوگا۔ ظالم کو سزا خدا دے گا یا دنیا کا مقررہ قانون اور عدالت۔ ظالم کو معاف صرف مظلوم کرسکتا ہے۔ یہ بات اس لیے عرض کرنی پڑی کہ عبادت پیشہ حضرات عبادت پر زیادہ بھروسا نہ فرمائیں۔ خلق کی خدمت و خیر خواہی سے خالی ہے تو ایسی عبادت وادیِ غیر ذی زرع ہے جہاں نہ پانی ہے نہ پودا نہ پٹرول!

گفتگو طویل ہوگئی۔ بظاہر بے محل بھی، لیکن ذاکر صاحب کے کردار اور شخصیت کو اس بیان کی روشنی میں پرکھنے سے یہ معلوم کرنے میں مدد ملے گی کہ مذہب جو سرچشمہ ہوتا ہے، ایمان، عقیدہ، عبادت اور خدمت کا، اس کا ذاکر صاحب کا تصوّر کتنا بلند تھا اور کس طرح

انھوں نے اپنی زندگی کے معمولات کو ان معظمات سے مستحکم ومزین کیا تھا۔ ذاکر صاحب جہاں ہوتے صدر انجمن ہوتے۔ شکل وشمائل، ذہن وذکاوت، شفقت وشائستگی، حفظ مراتب، تہذیب و اخلاق کی گراں مائیگی اور فکر وفن میں بصیرت کے اعتبار سے اقدار عالیہ کی عظمت اور فنون لطیفہ کی اہمیت کا براہِ راست تذکرہ ذاکر صاحب کی گفتگو میں معمولاً فلسفہ وحکمت کے دقائق، شعروادب کی عبارت واشارت یا حکما اور ائمہ کے اقوال میں نہیں ہوتا تھا۔ وہ مجرد اقوال یا نظریات کا شاید ہی حوالہ دیتے۔ ایسے مواقع اور موضوع پر وہ بالعموم بڑے اچھے لوگوں کے اعمال صالح اور نفسِ انسان کی سعادت وشرافت کو اس انداز واحترام سے پیش کرتے جیسے ان اچھے اور بڑے لوگوں کو ان کے حسنات کے ساتھ ہم ذاکر صاحب میں سُن ودیکھ یا چھُو رہے ہوں۔ وہ ہر مذہب ومسلک کی اعلیٰ اور عظیم شخصیتوں کا حوالہ دیتے۔ انھوں نے خدمت کو عبادت اور عبادت کو خدمت کا درجہ دے یا تھا اور دونوں کو حسن بینی اور حسن آفرینی کا وسیلہ بنا دیا تھا۔

ذاکر صاحب کسی کے کام کی تعریف خواہ وہ عالم ہو یا عامی نہ بندھے ٹکے الفاظ میں کرتے تھے نہ دیر تک اور زیادہ سے زیادہ الفاظ میں کرتے لیکن دو ہی ایک فقرے میں ایسی دل نوازی اور بالغ نظری سے کر دیتے کہ مصنف کو اس کی ساری محن ومحنت کا صلہ مل جاتا۔ اوروں کی مانند وہ کبھی ایسا انداز اختیار نہ کرتے جس سے اکثر اپنی بڑائی مقصود ہوتی ہے، مصنف کی دلجوئی یا ہمت افزائی نہیں۔ ان کی وفات پر ایک برطانوی ہائی کمشنر اور دانش ور نے کہا تھا کہ ذاکر صاحب کو دنیا کے کتنے زیادہ شعروادب سے واقفیت تھی کم کسی کو اندازہ ہوسکتا ہے۔ ایک انگریز کا جو کسی کی تعریف کرنے میں تمام دوسری قوموں سے زیادہ محتاط اور کفایت شعار ہوتا ہے، یہ رائے رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ اس نے ذاکر صاحب سے وقتاً فوقتاً علوم وفنون پر تبادلۂ خیال کرنے کے بعد ہی یہ رائے قائم کی ہوگی، اور تو نہیں اُردو مطبوعات کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ شاید ہی کوئی ایسی کتاب شائع ہوتی جو ذاکر صاحب کے یہاں نہ پہنچ جاتی۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ وہ سب ان کے مطالعہ سے گزرتیں، اور ہر ایک کے بارے میں رائے قائم کر چکے ہوتے اور کیسی رائے جو صرف ذاکر صاحب ہی کا حصہ ہوتی۔ شب خوابی کے کمرے سے ملحق کمرے میں ایک لمبی چوڑی میز پر ان مطبوعات کا انبار ہوتا۔ ایک

بار میں ساتھ تھا۔ میز کے قریب سے گزرے تو کچھ مطبوعات اُٹھالیں۔ پوچھا ان کو پڑھا ہے۔ میں نے کہا، نہیں۔ وہیں ایک کتاب ایسی دکھائی دی جو میری نظر سے گزر چکی تھی۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے زبان سے نکل گیا، یہ کتاب بھی ملاحظہ سے گزری ہے۔ فرمایا، ہاں۔ پھر اس پر اپنے خیالات کا اظہار ایسے فی البدیہ، ترشے اور تلے ہوئے فقرے میں کیا جو صرف ذاکر صاحب کا حصہ تھا! شاید بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ مصوری، شاعری اور تنقید کے جدید ترین معیار و موقف، ہیئت و مواد و اظہار و ابلاغ نیز اُن کے معروف ترین دانش وروں کے افکار کا ذاکر صاحب کو کتنا واضح علم تھا! بات دراصل وہی تھی جس کا اظہار ان کی وفات پر ایک مقتدر کمیونسٹ ممبر پارلیمنٹ نے کیا تھا کہ ذاکر صاحب اپوزیشن کے تحفظ کو بھی پورے طور پر ملحوظ رکھتے تھے اور کیسے معتبر محافظ! ذاکر صاحب کے یہاں قدیم اور جدید جدا جدا خانوں میں نہیں بنٹے ہوئے تھے بلکہ دونوں کے کسر و انکسار کا حاصل ملتا تھا۔ جو ذاکر صاحب کے تصرّف سے ایک نئے اور ترقی پذیر معیار کا پیام ہوتا اور نشان دہی کرتا۔ یہی وہ باتیں تھیں جن کے سبب سے ذاکر صاحب کبھی آؤٹ آف ڈیٹ نہ ہو سکے اور آؤٹ آف ڈیٹ نہ ہونے کا امتیاز و اختیار ہر شخص کے حصے میں نہیں آتا۔

ائمہ کے ملفوظات کے مطالعے کا موقع ملا ہے۔ وہ جن امور کی تلقین کرتے ہیں ان میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن زمانے کے بدل جانے اور جلد جلد بدلتے رہنے سے انسان کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کے طریقے اور عوامل بھی وہ نہیں رہے جو پہلے کبھی موثر اور مقبول تھے۔ اب تشبیہ، استعارہ، تمثیل، اشارہ، کنایہ اور کشف و کرامات کے حوالے اور جنت و دوزخ کا ذکر عام لوگوں کو بھی اتنا متاثر نہیں کر پاتے جتنا پہلے کرتے تھے۔ اس لیے کہ ہر طرح کے علوم، معلومات، مشاہدات و تجربات عام ہو گئے ہیں۔ ہر شخص ہمہ وقت ان کی قدر و قیمت جانتا رہتا ہے۔ سائنس اور میکانکی امور سے قطع نظر جہاں اعتقاد و اخلاق کو زیادہ دخل نہیں، مذہب اور اخلاق، اہمیت و افادیت کا تمام تر دار و مدار شخص کے صالح و صحت مند کردار پر ہے یعنی وہ خارج کے عناصر و عوامل پر نہیں بلکہ باطن کے ان واردات اور احوال پر کیسی نظر اور کتنی گرفت رکھتا ہے جو خارج پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ تسخیر فطرت انسان کا جتنا قابلِ فخر کارنامہ ہے، اتنا ہی اپنے پر تسخیر پانے میں ناکامی اس کا المیہ ہے۔ امریکہ نے چاند پر پاؤں رکھ دیا۔ لیکن کالے پر اس کا

پاؤں جہاں کا تہاں ہے! انسانیت فاتح عالم کی منتظر کبھی نہیں رہی، رحمت عالم کے لیے ہمیشہ چشم براہ رہے گی!

ذاکر صاحب میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو کسی درماندہ متشکک یا برہم و بیزار کو طمانیت خاطر سے بہرہ اندوز کرسکتی تھیں۔ وہ آرٹ اور علوم پر وسیع اور گہری نظر رکھتے تھے۔ سیرت کی بلندی، پختگی اور پاکیزگی کے لحاظ سے معتبر و محبوب تھے۔ ان میں مذہب کا جو خصوصی احترام ملتا تھا وہ کچھ تو خاندان سے ورثہ میں آیا تھا، کچھ بزرگوں کے فیض سے اور بہت کچھ انھوں نے اپنے کو تربیت دے کر حاصل کیا تھا۔ اس تربیت نفس کے لیے انھوں نے کتنا ریاض کیا ہوگا اس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو نہ صرف اس منزل سے گزرے ہیں بلکہ مسلسل گزرتے رہتے ہیں۔ وہ صوفی اور آرٹسٹ دونوں تھے۔ اسکالر بھی تھے عارف بھی۔ بقول ڈاکٹر سید عابد حسین ان میں اقبال کے مردِ مومن اور گاندھی کے مردِ حق کی شان ملتی تھی۔ یہ وہ صفات ہیں جو معلّم کو پیغمبر کے قریب کرتی اور رکھتی ہیں۔ ہر مصلح یا مصلحِ اعظم بنیادی طور پر معلّم اور ہر معلّم امکانی اعتبار سے مصلح یا مصلح اعظم ہوتا ہے، اس ایک فرق کے ساتھ کہ رسول اور پیغمبر خدا کی طرف سے مامور ہوتا ہے اور معلّم اس کے بندوں کا منتخب کردہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب مزاج، فن اور فکر کے اعتبار سے معلّم تھے۔ وہ ہر دیار و دربار کے لیے متفقہ طور پر اخلاق و انسانیت، صلح و سلامتی، آرٹ، ادب اور تہذیب کے سفیرِ اعظم منتخب کیے جاسکتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں اقدار و اشخاص ہی نہیں ملکوں اور ملتوں کے ناموس محفوظ تھے!

سیاست سے مجھے دلچسپی نہیں۔ جس مشغلے میں فریقین ایک دوسرے کا اعتبار کرنے سے ڈرتے ہوں اس میں حصہ لینا میری جیسی واجبی عقل و ہمت والے کے لیے نہ ممکن تھا نہ مناسب۔ مذہب اور اعتقاد کے بارے میں بھی تجسّس کی جرأت نہ ہوئی۔ اس لیے کہ دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ مذہب دیے ہوئے اعتقاد و احکام میں تفتیش و تفحص کے معنی، استثنا کی اتنی گنجائش رکھتے ہوئے جتنی عموماً رکھی جاتی ہے، بدنیتی کے ہیں۔ یعنی مذہب و اعتقاد میں کرید بالعموم اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب دل میں اوامر سے گریز اور نواہی کا مرتکب ہونے کے لیے چور دروازوں کی تلاش کرنے اور پانے کی خواہش سر اٹھاتی ہے۔ اس قماش کے لوگ ہر جگہ نظر

آ ئیں گے۔ ذاکرصاحب سے ان موضوعات پر گفتگو کرنے کا کبھی موقع مل جاتا تو محسوس ہوتا کہ سیاست اور مذہب پر ایمان داری کے ساتھ یکجا سوچنے سے جو بصیرت حاصل ہوتی ہے وہ بڑا دل افروز اور اخلاقی تجربہ ہوتا ہے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہر طرف سے منہ موڑ کر اور سیاق و سباق سے علاحدہ کر کے کسی مسئلہ بالخصوص سیاست اور مذہب پر سوچنے سے نتیجہ اکثر غلط اندیشی اور غلط روی ہوا ہے۔

ذاکرصاحب کو معلوم نہیں کب اور کیسے کتنا موقع مل جاتا کہ وہ ضروری اور مفید معلومات جلد سے جلد فراہم کر لیتے اور ان کو برمحل کام میں لاتے تھے جیسے یہ معلومات ان کے ذہن میں از خود جاگزیں ہوتی رہتی ہوں اور وہ بھی اتنی جتنی کہ کار آمد ہوتیں۔ اتنا مرتب اور حشو و زوائد سے کلیتہً پاک ذہن دیکھنے میں کم آیا ہے۔ کیسی غمیں یاد طالب علمی کے دنوں کی اس وقت ذہن میں آ رہی ہے تمام دن کبھی کبھی رات گئے تک یونین کلب، کالج کی لائبریری، احباب کے کمروں اور معلوم نہیں کہاں کہاں کا چکّر لگاتے ہوئے کسی وقت نمودار ہو جاتے، گنگناتے، مسکراتے، شاداب و شادماں جیسے اپنے ہی سے نہیں ساری دنیا سے مطمئن و مسرور ہوں۔ سب یک زبان ہو کر پوچھتے ذاکرصاحب کہاں رہے حسب معمول کیسے تفریحی اور گدگدانے والے انداز میں جس میں ذہانت و ذکاوت کی بڑی دلکش جھلک ملتی ہے کہتے ''معلومات فراہم کرتا رہا'' اب کیا بتاؤں اس زمانے میں ''معلومات فراہم'' کرنے کا فقرہ کیسے کیسے دلچسپ مفہوم میں استعمال ہوتا تھا۔ علم وفن سے قطع نظر، اشخاص واحوال سے بھی ان کی واقفیت کتنی حیرت انگیز تھی! کبھی کبھی ان پر گفتگو کرنے کا موقع آ جاتا۔ بعض نزاکتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی طرف تامّل و تذبذب سے اشارہ کرتا تو مسکراتے اور کس مزے سے کہتے۔ نہیں نہیں کہہ ڈالیے؛ پھر طالب علمی کے زمانے کا فقرہ ''معلومات میں اضافہ ہوگا۔'' دُہرا کر ہنس پڑتے۔ یک لخت ایسا محسوس ہونے لگتا، جیسے 60-50 برس پہلے کے کالج کے شب و روز، بام و در، ہائے وہُو اور اخلاص واعتبار کے دریچے کھل گئے ہوں۔ دلجوئی و ہمدمی کا اس طرح اظہار کرنے والا اب کہاں ملے گا۔ کہنا ختم کر لیتا تو اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ اس وقت معلوم ہوتا کہ صورت حال واقعتاً کیا تھی۔ کتنی ایسی باتیں ہوتیں جن کا مجھے علم نہ ہوتا یا غلط علم ہوتا۔ میرا

تجربہ یہ ہے کہ ذاکر صاحب کی معلومات شاید ہی، کبھی نامکمل یا غلط ہوتیں یا وہ کبھی کسی غلط فہمی میں مبتلا پائے گئے ہوں۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ذاکر صاحب سیاسی آدمی نہ تھے۔ اس اعتبار سے یقیناً نہ تھے کہ ان کی کوئی پارٹی ہوئی، وہ جس کا کوئی سیاسی مقصد یا موقف ہوتا اور اس پارٹی کے وہ باضابطہ لیڈر یا پیرو ہوتے۔ ذاکر صاحب عملی سیاست سے بلند و برکراں رہے لیکن انھوں نے سیاسی شخصیتوں اور سیاسی اسالیب فکر کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ حکومت کے اعلیٰ مناصب پر رہے۔ اپنی دانش مندی، منصفی، ہمدردی اور وسیع النظری سے سیاست کی ساحری اور شاطری کو حتی الوسع حدود سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ منصب کی پابندی اور سیاست کی غیر ذمہ داری کو انھوں نے جام وسنداں باختن کے معیار تک پہنچا دیا تھا۔ جن اعلیٰ عہدوں کی ذمہ داری انھوں نے سنبھالی اس کے غیر تحریر شدہ قانون اور روایت یہی تھی جس کو ذاکر صاحب نے قائم ہی نہیں رکھا بلکہ اس کو مزید اہمیت وحریّت بخشی۔ جامعہ ملیہ کی پہلی جوبلی کے موقع پر ذاکر صاحب نے عملی سیاست کے مختلف نہیں بلکہ متضاد اندازِ فکر وعمل کے دو ممتاز ترین سربراہوں کو جیسے خونیں و آتشیں دور میں جامعہ کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کر لیا تھا وہ اس زمانے میں کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ یاد آتا ہے کہ کریس مشن کی گفتگو ایک موقع پر ناکام ہوتی نظر آنے لگی تھی۔ ہز ہائنس نواب حمید اللہ خاں (بھوپال) بیچ میں پڑے تھے اور گفت وشنید کے آگے بڑھنے کا امکان پیدا ہو گیا۔ اس وقت یہ نواب صاحب کا کارنامہ سمجھا گیا۔ لیکن خود نواب صاحب کو اس مہم میں ذاکر صاحب سے کتنی قیمتی رہنمائی اور تائید حاصل ہوئی تھی، اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے!

تقسیمِ ملک کے بعد سے تاریخ وفات تک انھوں نے وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، گورنر بہار، نائب صدر اور صدر جمہوریہ ہند کے فرائض انجام دیے۔ مسلم یونیورسٹی اس حالت کو پہنچ گئی تھی کہ خود یہاں کے سربرآوردہ حضرات میں سے ایک نے چیف منسٹر یو پی کو آفر دیا تھا کہ وہ اس یونیورسٹی کو کلیتہً حکومت کے تصرّف میں لے لیں۔ دہلی کے بعض نیم سرکاری اکابر کی طرف سے یہ پیش کش عام تھی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، حکومت ہند کے حوالے کر دی

جائے۔ اس کے بدلے پنجاب کی کوئی درس گاہ پاکستان کو الاٹ کردی جائے۔ ان دنوں یونیورسٹی کے بہی خواہ کس درجہ مایوس و مضطرب تھے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ باہر کا ہر ایراغیرا، صبح وشام یہاں آکر جو کچھ جی میں آتا اور ظاہر ہے جی میں کیا کیا آتا ہوگا، ہم کو سنایا جاتا۔ جس کو کہیں پلیٹ فارم یا سامعین نہ ملتے وہ سیدھا علی گڑھ کا رخ کرتا، اس لیے کہ یہیں سے اس کی ناسزا گفتاری اس کے لیے موجب خیر و برکت ہوتی۔ تاریکی اور تہلکے کے اس عالم میں جب اپنے غیر اور غیر اپنے معلوم ہونے لگے تھے، ذاکر صاحب بھی تشریف لائے۔ اس کے بعد پھر کسی شخص کی مجال نہ تھی کہ علی گڑھ ہی میں نہیں کسی بھی پلیٹ فارم سے ہمارے بارے میں کوئی ناسزا کلمہ کہنے کی جرأت کرسکتا۔ پھر جس دل سوزی، دانش مندی اور حوصلہ و ہمت سے انھوں نے اس ادارہ کو اس سیاسی جبر وقہر سے نجات دلائی جن سے وہ دوچار تھا، اس کو کون نہیں جانتا۔ ذاکر صاحب نے رفتہ رفتہ یونیورسٹی میں اطمینان، آسودگی، امن اور اُمید کی ایسی فضا پیدا کردی جیسے اس سے پہلے یونیورسٹی ہی پر نہیں سارے ملک پر کوئی حادثہ نہیں گزرا تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد یونیورسٹی کیسے کیسے نرغے میں آئی۔ کیا کیا نہ ہوا، کہاں پہنچی اور ایک بار پھر اس کے بہی خواہ اس کے مستقبل کی طرف سے کتنے بددل یا بےقرار رہنے لگے ہیں وہ بھی کوئی راز نہیں ہے۔

علی گڑھ سے رخصت ہوکر بہار کے گورنر ہوئے۔ اس زمانے میں بہار کے شرفا، اہل علم اور دوسرے دانش وروں سے جو حالات سُننے میں آئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب وہاں کتنے محبوب و مقبول تھے جس طرح کسی جگہ کا پھل یا شیرینی مشہور ہو اور وہاں سے گزرنے والے اس کو خرید کر عزیزوں اور دوستوں کے لیے نہایت شوق سے بطور تحفہ لے جاتے ہوں اسی طرح ان دنوں جو شخص بہار سے آتا وہ ہم سب کو ذاکر صاحب کی شرافت، قابلیت اور منزلت کے قصے سناتا، ان دنوں فکر و فن کے اکابر کی سب سے زیادہ مان دان گورنر ہاؤس میں تھی۔ طالب علموں کو ذاکر صاحب کے سایۂ شفقت میں اپنی سیرت و شخصیت کو سدھارنے، سنوارنے کا شوق پیدا ہوتا۔ ان کی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے ممکن و مناسب تدبیریں عمل میں لائی جاتیں۔ بہار کی اچھی قیمتی اور تاریخی یادگاروں کو محفوظ کرانے

کے انتظامات کیے گئے۔ بہار کے احباب بتاتے تھے کہ جہاں تک علم وفن کی سرپرستی اور عالموں کی قدر افزائی کا تعلق تھا؛ بہار میں ذاکر صاحب کی گورنری امرائے پیشیں کے عہد کی یاد تازہ کرتی تھی۔

سیاست کے بیوپار اور بازار میں جنس اور نرخ کو بیوپاری جس طرح پلٹے دیتے اور خود پلٹے کھاتے رہتے ہیں، ان سے واقف بھی ہوں نفوذ بھی۔ ان بیوپاریوں کے ہاتھ اور دیدے کی صفائی کس نے نہ دیکھی ہوگی۔ ذاکر صاحب جب تک بہار کے گورنر رہے، وہاں کی سیاسی پارٹیوں کی ہر سطح پر ہر طرح کے جوڑ توڑ اور اُتار چڑھاؤ دیکھتے رہے اور ان کو اس طرح نظر میں رکھا کہ کسی فرد یا جماعت کو کھل کھیلنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ذاکر صاحب کا یہ اثر منصبی ہرگز نہ تھا اور نہ ہوسکتا تھا۔ یہ صرف ان کی ہر داغ سے پاک اور ہر برتری سے آراستہ ومحکم شخصیت تھی جس کے سامنے کسی نالائقی کو سر اُٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی اور بہار کی سیاسی ہوا کو باوجود ہر طرح کی ناسازگاریوں کے صحت مند نہیں تو اعتدال پر قابو میں رکھ سکی۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ سیاسی مناقشوں کے سبب سے اکثر صوبوں میں گورنر حکومت کی نوبت آتی رہتی ہے، لیکن ذاکر صاحب جب تک بہار کے گورنر رہے وہاں کی وزارت یا پارٹی کے توازن میں کوئی قابلِ لحاظ انتشار یا اختلال رونما نہیں ہوا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی اس لیے کہ گورنری سے سبک دوش ہوکر نائب صدر کے فرائض سنبھالنے دہلی آگئے تو کچھ ہی دنوں بعد بہار کی وزارتی حکومت اس طرح زیروزبر ہونے لگی اور ایسی ایسی ناشدنی اور ناگفتنی منظر عام پر آئیں کہ تعجب ہوتا تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب نے کیسے مزبلے پر قدم جمار کھے تھے کہ قدم اُٹھاتے ہی ایسا معلوم ہونے لگا جیسے آگ ہی اُگلنے والے پہاڑ نہیں ہوتے، گراوٹ اور گندگی اُگلنے والے پہاڑ بھی ہوتے ہیں۔

پنڈت جواہر لعل نہرو کی وفات پر اپنے ایک مضمون میں عرض کیا تھا کہ دہلی اتنا بڑا اور بے قابو شہر ہوگیا ہے اور اس میں ایسے ایسے غیر متوقع حالات وحادثات ہر وقت پیش آتے رہتے ہیں کہ وہاں جانے میں خاصا پس وپیش ہوتا ہے جیسے کسی ڈراؤنے بے کراں جنگل میں گم ہوگیا ہوں۔ جہاں جمال کوئی نہیں، جان و مال وآبرو سب خطرے میں! لیکن اس وقت حکومت کے

اعلیٰ ترین مناصب پر فائز تین ایسی عظیم ہستیاں ہیں جن کے ہوتے ہوئے دل کو ڈھارس رہتی تھی کہ کوئی حادثہ پیش نہ آئے گا۔ دوسرے یہ کہ اس وقت دنیا کی زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقت ور حکومت یا ملک کی عنان بھی ایسے بے داغ، بے لوث اور معتبر ہاتھوں میں نہ تھی جیسے کہ جمہوریہ ہند کے ان اکابر کے ہاتھوں میں جیسے کہ ڈاکٹر رادھاکرشنن صدر، پنڈت جواہر لعل نہرو وزیر اعظم اور ذاکر صاحب نائب صدر! تمام اُمور کو پیش نظر رکھتے ہوئے کون نہیں جانتا کہ ذاکر صاحب کے صدر حکومت رہنے سے ملک حکومت اور دارالخلافہ تینوں کی کیسی غیر متزلزل ساکھ تھی۔ سیاسی پالیسی کے تعین اور نظم و نسق کے تقاضوں کے اعتبار سے صدر مملکت محض آئینی صدر ہوتا ہے اور نارمل حالات میں وہ کوئی غیر معمولی اقدام نہیں کرتا۔ ایسے صدر کا بڑا اہم رول یہ ہے کہ اس کی ذہنی اور اخلاقی برتری ایسی ہو کہ وہ ملک کے اندر اور باہر حکومت کا ضمیر سمجھا جائے۔ ذاکر صاحب میں یہ صفت بیش از بیش تھی جہاں تک اُمور مملکت یا سیاسی پارٹیوں کے مزاج و مصلحت کا تعلق ہے۔ میری معلومات کتنی ہی ناقص یا نامکمل کیوں نہ ہوں، لیکن ذاکر صاحب کے بارے میں اتنا جانتا ہوں کہ پارٹیوں، اعیانِ حکومت اور عامتہ الناس کو ذاکر صاحب کے علمی و اخلاقی فضائل و دیانت و امانت، ہوش مندی، ہمدردی اور شرافت و انسانیت کا جیسا صحیح اور براہِ راست احساس و اعتراف تھا وہ اپنی نظیر آپ ہے!

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے صدر مملکت کی حیثیت سے اپنے یا کسی اور ملک کے اندرونی یا سیاسی مسائل میں دخل دینا یا ان پر گفتگو کرنا ذاکر صاحب کے لیے نامناسب تھا نہ ممکن، لیکن سیاست کا دائرہ یا مفہوم اتنا ہی نہیں جتنا بالعموم سیاسی پارٹیوں کے کارنامے میں کم، ان کے کرتوت میں زیادہ، ہر روز دیکھنے میں آتا رہتا ہے۔ سیاست کا ایک پہلو وہ بھی ہے جہاں ملک کے وقار و استواری کو نظر میں رکھتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سیاست اور دین راستی و اخلاق کو یکجا یا ایک دوسرے سے قریب رکھنے یا نہ رکھنے کا مرحلہ آتا ہے، اور یہ بڑا مشکل مقام ہے۔ جہاں تک میرے سمجھانے اور آپ کے ماننے کا تعلق ہے ذاکر صاحب کا سیاست سے براہِ راست لگاؤ نہ تھا۔ لیکن اس کے پیچ و خم اور داؤں پیچ سے بخوبی واقف تھے۔ بیش تر بڑے آدمی ایسے ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ ایک اعلیٰ شخص اور معلّم (مصلح) ہونے کے سبب سے وہ سیاست اور

سیاست گری کے رُخ و رفتار اور وسیلہ و مقصد کو متوازن اور صحت مند رکھنے کا اپنے کو ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اس ذمہ داری کو وہ خارجی وسائل سے نہیں صرف اپنی شخصیت کی بڑائی سے پوری کرتے رہتے تھے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ غیر ذمہ دار اشخاص شحنہ کی اتنی پروا نہیں کرتے جتنی شخصیت کی، تاوقتِ کہ وہ کسی نفسیاتی علّت کا شکار نہ ہوں۔ صدر مملکت کی حیثیت آئینی طور پر کچھ بھی ہو، اخلاقی اعتبار سے وہ ملک اور قوم اور ان سے آگے بڑھ کر ضمیر انسانی کا امین و آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس رول کو اسے ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ اپنے کسی علم کے زور پر نہیں کہہ رہا ہوں اس لیے کہ علم اور زور دونوں اعتبار سے نیاز مند واقع ہوا ہوں بلکہ ذاکر صاحب کے سانحۂ رحلت کے بعد کانگریس کے ڈسپلن میں جیسی المناک ابتری آئی اور حکومت کو جس طرح کی نزاکتوں کا سامنا ہوا اس کے پیش نظر خیال آتا ہے جیسے ذاکر صاحب اپنی جگہ پر موجود ہوتے تو اس کی نوبت نہ آتی۔ بہار کا قصہ سنا چکا ہوں۔

کسی محکمے، کارخانے یا ادارے کی کامیابی اور نیک نامی کا مدار، اس کے قانون، ضابطہ یا عملے کی تعداد اور اختیارات پر اتنا نہیں ہے جتنا کہ اس کے اراکین کی دیانت داری، فرض شناسی، دل سوزی، محنت اور قابلیت پر ہے۔ آج کل کے اداروں، محکموں اور دفتروں کو دیکھئے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ان میں کام کرنے والوں اور حاصل کار کا تناسب کیا ہے۔ ہر طرف، ہر سطح پر ہر مواخذے سے بے نیاز جیسا کرپشن و رشوت، چوری، گراوٹ، گندگی، حرام خوری جس شدت سے جس پیمانے پر پھیلا ہوا ہے اس نے زندگی کو ایک اعلیٰ درجے کی ذمہ داری ہونے کے بجائے کرب و کراہت کی علامت بنا دیا ہے۔ پاکی دامن کی حکایت کون چھیڑے اور کون آگے بڑھائے، جب بڑا گنہ گار اپنے بند قبا کو دیکھ کر چھوٹے گنہ گار کے دامن کو دیکھنے کی جرأت نہ کرسکتا ہو، کوئی مانے یا نہ مانے جب ابتری عام ہو اس وقت ایک اچھا اور بڑا شخص تنہا وہ کرسکتا ہے، جو فوج، پولیس، الیکشن، کانفرنس، یوتھ فسٹول، طالب علم اور سادھو علاحدہ علاحدہ اور مل کر بھی نہیں انجام دے سکتے۔ اصلاح و امن کے کاموں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ایک پیغمبر بھیجا ہے، افواج کبھی نہیں بھیجیں۔ ملک کے اعتبار و وقار کی بازیافت کے لیے ابھی ذاکر صاحب کی ضرورت تھی۔ شاید ایک سے زائد کی۔

ملک ہو،قوم ہو،ادارہ یا انجمن ہو ان سب کی وقعت و اہمیت کا اندازہ بالعموم اس کے سربراہ کی وقعت اور اہمیت سے لگاتے ہیں جو وقت آنے پر بڑی سے بڑی آزمائش یا بڑے سے بڑے شخص کے سامنے اپنے اخلاقی، علمی اور تہذیبی فضائل کی بنیاد اور بلندی پر کھڑا ہو سکتا ہو اور ملاقاتی یا مہمان واضح طور پر محسوس کرے کہ وہ میزبان کی بڑائی کا اعتراف کیے بغیر اپنی بڑائی نہ خود محسوس کر سکتا ہے نہ کرا سکتا ہے۔اس طرح کے مواقع بالعموم اعلیٰ دانش گاہوں میں پیش آتے ہیں جہاں طلبا اور اساتذہ دونوں اپنے سردار کے قد و قامت کو مختلف پہلوؤں سے برابر پرکھتے رہتے ہیں۔ ان دونوں سے زیادہ شخصیت کا بے لاگ اکثر بے رحم پارکھ کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ ذاکر صاحب جہاں رہے اس مرحلے و منزل سے گزرتے رہے اور ہمیشہ ہر جگہ اس کا اعتراف کیا گیا کہ ہر محفل میں اور ہر لحاظ پر ان کا قد سب سے نکلتا ہوا پایا گیا۔ ساکھ کا مدار شخص پر ہوتا ہے، منصب پر نہیں۔ ذاکر صاحب کے عہد میں بڑے بڑے مواقع پر باہر سے آنے والے خواہ وہ کتنے ہی ممتاز کیوں نہ ہوں، سب سے پہلے ذاکر صاحب کی خدمت میں اپنا ہدیۂ عزت و عقیدت پیش کرتے۔ طلبا کا اچھے سے اچھے الفاظ میں ذکر کرتے اور برابر اس کا لحاظ رکھتے کہ وہ ہندوستان کی ایسی تاریخی مرکزی دانش گاہ میں آئے ہیں جو ہر اعتبار سے قابلِ لحاظ اقلیت کے تعمیری و تہذیبی حوصلوں، دوست داری اور وسیع المشربی کا بڑا مبارک و مقبول نمونہ ہے۔ یوں بھی اصطلاحاً ہم پر اقلیت کا چاہے جتنا اطلاق ہوتا جہاں تک اس اقلیت کے علمی، تمدنی، تہذیبی اور انسان دوستی کا تعلق ہے وہ اکثریت سے پیچھے نہیں ہے۔ شاید ہندوستان سے باہر کی اکثریت سے بھی۔

یہاں مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ذاکر صاحب کی جامع حیثیات شخصیت ایسی تھی کہ وہ حکومت کے ان مسائل مہمہ کو بھی سلجھا، یا ان کو صحیح خطوط پر رکھ سکتے تھے جو آئین کی رو سے ان کے اختیارات سے باہر تھے۔ قوم اور ملک کے سب سے بڑے سربراہ میں یہ صفت موجود ہو تو ہر تعصب و تنگ نظری سے بلند ہو کر فخر کرنا چاہیے۔ ایک مشہور قول ہے ''مرنے سے پہلے مر جاؤ'' اس کی ایجابی و تعمیری تعبیر یہ ہے کہ ''پانے سے پہلے پالو۔'' ذاکر صاحب نے یہی راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ ہر منصب پر فائز ہونے سے پہلے اس پر فائز ہو چکے تھے۔ یعنی اس عہدے کے لیے جیسے

اخلاقی، علمی اور تہذیبی اوصاف کی ضرورت ہوتی اسے مدتوں کے ریاض سے اپنا چکے ہوتے تھے۔ نظر برآں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ صدر مملکت ہونے سے پہلے وہ صدر مملکت بن چکے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ زندگی نے وفا کی ہوتی تو وہ صدارت کے منصب سے سبک دوش ہو کر بھی صدر رہتے۔ ذاکر صاحب کے ان اوصاف کو مدنظر رکھیں تو یہ سمجھنا دشوار نہیں رہتا کہ وہ محض اپنے کردار سے ملک کے وسیع اور بہترین مقاصد کو روبراہ کرنے اور رکھنے میں معین ہوتے تھے۔ ہندوستان جیسے اخلاقی اقدار و روایات اور تاریخی و تہذیبی تنوع و تضاد کے ملک میں صدر مملکت کا کردار ایسا ہی ہونا چاہیے جس کے آگے ہر کرتوت کو جھکنا پڑے۔

نائب صدر اور صدر مملکت ہونے کی حیثیت سے انھوں نے بہت سے بیرونی ممالک کا دورہ کیا تھا اور وہاں کے عظام و اکابر سے متعارف ہوئے تھے۔ ظاہر ہے اس طرح کی دید و باز دید معینہ ضوابط کے تحت ہوتی تھی۔ عقل اس کو باور نہیں کرتی کہ ملکوں اور حکومتوں کے صنادید عظام اعلیٰ ترین سطح پر ایک دوسرے سے ملتے ہوں اور بقول سرسید صرف یہ کہہ یا سُن کر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہوں۔ ''کیوں صاحب آپ منگل کو انڈے کھاتے ہیں یا نہیں؟'' اتنے بڑے لوگ ملتے ہوں گے تو معرض بحث میں نہیں تو معرض گفتگو میں کچھ بڑی باتیں بھی ہوتی ہوں گی۔ یہ اور بات ہے کہ معرض تحریر میں نہ لاتے ہوں۔ زندگی اور زمانہ جس شدائد سے گزر رہا ہے اور جیسی جیسی نزاکتوں اور ہلاکتوں کا انسان اور انسانیت کو سامنا ہے ان پر کچھ نہ کچھ گفتگو آتی ہوگی چاہے ان کی حیثیت تمام تر علمی اور انفرادی ہو۔ ذاکر صاحب جیسے صاحبِ اخلاق و کردار، دانش ور، ذہین و ذکی، بیش از بیش علوم سے باخبر راستی، پاکیزگی اور خوب صورتی کے دوست دار، خیر و خدمت کے نمائندہ اور پیغامبر، تحریر و تقریر میں بے مثل، گفتگو میں شائستہ و شگفتہ، مباحثہ و مذاکرہ میں ناقابلِ تسخیر، زندگی اور زمانے کے خیر و شر سے خبردار، ہر محفل میں مقبول، ہر محاذ پر محترم، جس کی دردمندی ہر زخم کا مرہم اور جس کی دلجوئی ہر مایوسی و مظلومی کا مداوا تھی، ان کا سامنا کسی مسئلے یا محاذ پر دنیا کے ائمہ و اکابر سے ہوتا ہوگا تو کیسا محسوس کرتے ہوں گے جب ان کو رفتہ رفتہ معلوم ہوتا ہوگا کہ جو بات معرض گفتگو میں ہے اس پر آخری لفظ کہنے والے ذاکر صاحب ہی ہوں گے! ذاکر صاحب اور علم و فن کے بڑے بڑے ماہرین کو

بارہا سرگرم گفتگو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اوروں کو بھی ہوا ہے۔ سب کا فیصلہ یہی ہے کہ قول فیصل ذاکر صاحب ہی کے حصہ میں آتا تھا۔ یہی نہیں جہاں ذاکر صاحب ہوتے وہاں پر مباحثہ و مذاکرہ کا افتتاح و اختتام شادمانی و شگفتگی کی فضا پر ہوتا۔

ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر تھے۔ اسی زمانے میں مجھ پر قلب کا دورہ پڑا۔ میں نے بڑی بڑی بیماریاں اُٹھائی ہیں۔ ایک سے ایک نازک اور تکلیف دہ آپریشن کرائے اور مدتوں ان کے عذاب جھیلے ہیں، لیکن اس قدرت سے اور راضی بہ رضا رہ کر جیسے زندگی کے سفر میں یہ مرحلے خوش و ناخوش گزار دیے یا گزر جانے ہی کے لیے آتے ہیں۔ لیکن کس قیامت کے درد و کرب کا یہ قلب کا دورہ تھا! بارے وہ درد اور دَورہ دونوں دور ہوئے لیکن کیا چھوڑ گئے وہ بھی ناقابلِ بیان ہے۔ ذاکر صاحب دیکھنے آیا کرتے تھے۔ میرے کمرے کا دروازہ اس رُخ سے ہے کہ چارپائی پر لیٹے ہوئے بیرونی دروازے تک تقریباً ڈیڑھ سو فٹ تک آتے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں۔

ذاکر صاحب حسبِ معمول سپید کھدر کے نہایت ستھرے اور خوش قطع لباس میں باغ پر نظر ڈالتے ہوئے، ہموار مضبوط قدموں سے نہ جلد جلد نہ آہستہ آہستہ بالکل اسی طرح جیسے ہمیشہ چلتے تھے آتے ہوئے نظر آتے۔ کتنا مردانہ دل کش شریفانہ سراپا تھا اور کیسی اُمید، وقار اور ہمدردی کی فضا اور دعوت بکھیرتے ہوئے آتے تھے! ان میں انسانیت، علم، ذہن، فطرت سب کا حسن اکٹھا ہو گیا تھا۔ ان کی موجودگی میں تمام دوسرے حسن اضافی معلوم ہونے لگتے تھے۔ یوں بھی انسان سے زیادہ خوب صورت کون ہوا ہے۔

عام تیمارداروں سے ان کا انداز جداگانہ تھا۔ بالکل شخصی اور انفرادی جیسا کہ ذاکر صاحب ہی کا ہو سکتا تھا۔ نہ خواہ مخواہ ہنستے بولتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے نہ تسکین و تشفی یا تفریح و تماشے کے بندھے ٹکے کلمے زبان پر لاتے۔ علاج معالجہ، ڈاکٹروں کی آمد و رفت یا کھانے پینے کے بارے میں کوئی گفتگو نہ کرتے۔ چہرے کو نہ متفکر بناتے نہ ہونے دیتے۔ بس آتے اور بغیر کسی تکلیف یا تصنّع کے چارپائی سے متصل تخت پر گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ جاتے جیسے تیمارداری کا فریضہ ادا کرنے کے لیے نہیں بلکہ تمام کاموں سے فارغ ہو کر خوش

وقت ہونے اور خوش وقت کرنے کے لیے آئے ہوں۔ بالکل جس طرح نارمل حالات میں تشریف لایا کرتے تھے۔ بہت بے قرار پاتے تو تخت چھوڑ کر چار پائی کی پٹی پر بیٹھ جاتے اور میرا ہاتھ اپنی دونوں ہتھیلیوں میں لے کر دھیرے دھیرے دبانے لگتے۔ ایک لفظ نہ کہتے لیکن چہرے سے ایسا معلوم ہوتا جیسے اُمید اور آرام کی بشارت دے رہے ہوں۔ اس سے اسی طرح کی تسکین ملتی جیسے کوئی زود اثر مسکن دوا (Tranquillser) دی گئی ہو۔ خدا کے جس اچھے بندے کو اپنے رب کا کلام سُن کر بیماری کی شدت میں تسکین مل جاتی ہو اور جس نے اپنے قاتلوں کے جمِ غفیر میں اللہ اور اسلام کا برملا اقرار کر کے جامِ شہادت پینے کا حوصلہ دکھایا، اسی کی ہتھیلی کے لمس میں یہ تاثیر مل سکتی تھی۔ جب تک وہ زندہ رہے یہ بات یاد نہ آئی۔ آج جب کہ وہ آسودۂ رحمت ہیں پچھلا سماں آنکھوں کے سامنے ہے۔ گریہ اُٹھتا ہے، آنسو اُمنڈ آتے ہیں اور سانس میں گرہیں لگتی معلوم ہوتی ہیں اور سوچنا اور لکھنا ناممکن معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسی دوران میں عید آ گئی، طبیعت اب سنبھل گئی تھی نماز پڑھ کر سیدھے میرے یہاں پہنچے، اور تخت کے بجائے چار پائی ہی پر بیٹھ گئے۔ اس وقت ان کے چہرے پر شادمانی کی وہ شبنم تھی جس میں صبح کی تازگی اور سورج کی اوّلین کرنوں کی الماس پاشی ملتی ہے۔ جیب سے ایک لفافہ نکالا۔ اس میں سے ہاتھی دانت کا بڑا خوب صورت ورق تراش، کتاب میں رکھنے کا نشان چھوٹے چھوٹے نازک ترشے ہوئے پھول پتیاں اور چند رنگین کارڈ پر مشہور عالم مصوّروں کے شاہ کار چھپے ہوئے تھے۔ ایک ایک کر کے اس انداز اور ایسے الفاظ کے ساتھ جن میں محبت، تفریح اور تکریم کی ناقابلِ بیان کیفیت تھی نکال کر دیے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے عید کے دن ان تحائف کے ساتھ یہ مژدہ بھی دے رہے ہوں جیسے دُکھ اور درماندگی کے دن دور ہوئے اور خدا نے مشکل آسان کر دی۔

ذاکر صاحب کو بیش تر چھوٹے بڑے لوگوں نے ہر حال میں دیکھا ہے۔ قرول باغ سے لے کر راشٹر پتی بھون تک کا ان کا رہن سہن سب کے سامنے ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کو ایسے سیدھے اور سچے راستے پر ڈال دیا تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں بھی ان پر نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی بلکہ بدلے ہوئے حالات ہی کو ذاکر صاحب کے اختیار کیے

ہوئے راستے پر آنا پڑا۔ عام طور پر لوگ ہوا کے رُخ کو دیکھتے ہیں اور اسی کو اختیار کر لیتے ہیں۔ ذاکر صاحب ان عظیم شخصیتوں میں تھے جن کو دیکھ کر کبھی کبھی ہوا کو اپنا رُخ بدلنا پڑتا تھا۔ وہ جن اعلیٰ صفات سے متصف تھے وہ ان میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ وہ جہاں ہوتے جس حال میں ہوتے، ہمیشہ علم، عافیت اور عزّت کے پیامبر نظر آتے۔ زندگی کے حسن و قبح کے پرکھنے میں زیادہ تر شخص کا رہن سہن، کھانے پینے، اوڑھنے پہننے، میل ملاپ، فکر و نظر اور خیر و خدمت کے طور طریقوں کو مدّ نظر رکھتے ہیں۔ ذاکر صاحب قرول باغ کے جس معمولی مختصر مکان میں رہتے تھے وہ کسی اعتبار سے قابلِ لحاظ نہ تھا، اور آبادو آبادکاری کے فشار میں اب تک گھس نہ گیا ہو تو کیا عجب۔ لیکن اس کو اندر سے ایسا بنا رکھا تھا جس میں ضرورت، آرام اور خوب صورتی ہر چیز اندر کی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی جو بہ مشکل کہیں نظر آئے گی کہ کوئی چیز بے قرینہ نہیں تھی۔ ایسے مکان میں بے تکلّف کسی وقت بھی بڑے سے بڑے آدمی کی پذیرائی کی جاسکتی تھی۔ قرینہ اور بے قرینہ کا صحیح تصوّر مہاتما گاندھی کے اس قول سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ ہر چیز کوڑا یا گندگی (Dirt) ہے جو اپنی جگہ پر نہ ہو یعنی بے قرینہ رکھی ہو۔ میں نے ذاکر صاحب کے یہاں قرول باغ اور جامعہ نگر میں جتنا خوش ذائقہ اور ستھرا کھانا کھایا ویسا ان کے سرکاری دستر خوان پر نہ ملا۔ برتن، دستر خوان اور آس پاس کی صفائی اور خوش نمائی کا التزام اس سے کچھ زیادہ ہی دیکھا جتنا ان حالات میں کوئی بھی قرول باغ یا جامعہ نگر میں رکھ سکتا تھا۔ پھر اسی دستر خوان پر خلوص، خوش دلی اور خوش وقتی کی وہ فضا جسے ذاکر صاحب ہی جیسا میزبان فراہم کر سکتا تھا۔

کسی کو کھانا کھاتے دیکھ کر آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ شخص کس قماش کا ہے اس لیے کہ کھانے کے آداب، زندگی کے دوسرے آداب سے جداگانہ نہیں ہوتے۔ زندگی کے ڈھکے چھپے جتنے وظائف ہیں وہ سب ایک دوسرے سے مکمل طور پر مربوط ہیں۔ ایک میں بھی جھول ہوگا تو اونٹ ہی نہیں اس شخص کی بھی کوئی کل سیدھی نہ ملے گی۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص دستر خوان پر پھوہڑ ہو اور جانماز پر نہ ہو۔ کھیل کے میدان میں کھوٹا ہو اور کاروبار میں کھرا ہو۔ علی گڑھ میں کچھ لوگوں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ چند مہمان باہر سے آئے ہوئے تھے۔

کچھ یونیورسٹی کے اور دو تین حکام ضلع تھے۔ اتفاق سے مجھے جن صاحب کے قریب جگہ ملی وہ کھانے پینے کے تمام وظائف بالجبر ادا کرتے تھے اور اس ندیدے پن سے کھا رہے تھے جیسے زندگی میں ایسا موقع نہ پہلے کبھی ملا تھا نہ آئندہ ملے گا۔ کھانے پینے میں چپڑ چپڑ کرنا، پینے میں سڑ پنا، پانی غٹ غٹ پینا، ڈکار لینا اور چاول اور شوربا یا سالن کو ملا کر ہاتھ سے کھانا اور سَنی ہوئی اُنگلیوں کو پلیٹ میں بار بار چھڑکنے اور چاٹنے یا ہڈی کی نلی میں سے گودا نکالنے کے لیے ہاتھ پر ہاتھ مارنا یا بار بار منہ میں ڈالنے نکالنے سے مجھے بڑی گھن آتی ہے اور کھانے کی تقریب عذاب بن جاتی ہے۔ میرے ہم نشین یہ سب کر رہے تھے۔ کسی طرح کھانے اور کافی کا دور ختم ہوا۔ میز پر سے لوگ اُٹھ گئے تو ٹہلتے ہوئے آئے اور میرے بازو پر ہلکے سے ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر بولے۔ ''آپ کو کھانا اچھا ملا ہو یا نہیں ساتھی اچھا ملا تھا۔''

ذاکر صاحب کھانے کے آداب جس طرح ملحوظ رکھتے تھے اور جس نفاست سے اس کو ادا کرتے تھے وہ بالکل ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی بڑا فن کار مثلاً مصوّر، مغنّی یا سرجن اپنے فن کا حق ادا کر رہا ہو۔ راشٹر پتی بھون میں ذاکر صاحب کے دستر خوان پر کھانا کھانے اور ایک آدھ دن وہاں بسر کرنے کا اتفاق ہوا۔ قصر حکومت کی شان و شوکت، امارت و اقتدار کی فضا، خورد و نوش کے ساز و سامان، دستر خوان سے متعلق عملہ اور ان کے آداب کا ایک عالم ہوتا۔ بہ ایں ہمہ محسوس ہوتا کہ یہ سب اپنی قدر و قیمت صاحبِ محفل کی شخصیت سے اکتساب کر رہے ہیں۔ یہاں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہر صاحبِ محفل صاحبِ محفل نہیں ہوتا۔ ہر خوبی و زیبائی منصب نہیں، شخص اور شخصیت کی خوبی و زیبائی کی محتاج ہوتی ہے۔ جو شخص یا شخصیت اپنے امتیاز و اعتبار کے لیے کسی عہدہ یا منصب کی محتاج ہو وہ ساقط الاعتبار ہے۔ جہاں ذاکر صاحب کا بیچ ہو وہاں سے ان کو جدا کر کے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ باقی کیا رہ جاتا ہے۔ مجنوں کے نکل جانے سے جنگل ہی نہیں اُداس ہو جاتا بستی اور بھی زیادہ اُداس ہو جاتی ہے۔ لعل و گوہر کی قیمت اور وقعت گوہر فروش کی دُکان میں نہیں عقدِ گردنِ خوباں میں کھلتی ہے۔

نئی دہلی اور وائسرائے ہاؤس (راشٹر پتی بھون) سر ایڈورڈ لیٹینس (Sir Edward Lutyens) اور جین ٹیلر (Jane Taylor) کے خونِ جگر کی نمود ہیں۔ وہ خونِ جگر جس کی

طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی ''فن کار کے ہنر و حوصلہ، جسم و جان، ذہن و ذوق اور عبادت و ریاضت کا افشردہ یا کشید، ان شاہ کاروں کو جو دیکھے گا ہمیشہ اور غیر شعوری طور پر ان کو ظہور و وجود میں لانے والے کے حضور میں اپنی عقیدت کا ہدیہ پیش کرے گا۔ لیکن جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے مکاں کو شرف مکیں سے ہے۔ سینا اور صلیب کی تمام تر منزلت موسیٰ اور مسیح سے ہے۔ جامعہ کے ابتدائی دور کا نقشہ قرول باغ کے خرابے یا مزبلے میں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اسی طرح قصر سلطانی (راشٹر پتی بھون) بام و در، شان و شوکت، گل و گلزار، ساز و سامان، نقش و نگار اور خدام و حشم بھی نظر میں ہیں۔ دونوں مقامات پر ذاکر صاحب کی شخصیت کے تصرف کا عالم جدا تھا۔ کتنا واضح، کتنا بامعنی و بامقصد کتنا قیمتی و عجیب! شاید اسی طرح کی کیفیت نے اصغر گونڈوی سے یہ شعر کہلوایا تھا۔

فروغِ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے

ادائے رسمِ بلالی و طرزِ بولہبی

ذاکر صاحب بڑے فکرمند اور کوشاں رہتے تھے کہ جامعہ کے ہائی اسکول کے امتحانات کو سرکاری محکمۂ تعلیم تسلیم کرلے۔ اسی زمانے میں یا اس کے آس پاس سارجنٹ اسکیم شائع ہوئی تھی جس کا بڑا شہرہ تھا اور جا بہ جا اس کی تبلیغ کی جا رہی تھی۔ اس سے پہلے واردھا تعلیمی رپورٹ منظر عام پر آچکی تھی۔ مسٹر سارجنٹ اور ان کے رفقا جامعہ ملیہ کو قریب اور تفصیل سے دیکھنے گئے۔ ہفتہ عشرہ بعد ذاکر صاحب علی گڑھ تشریف لائے۔ نہایت خوش و خرم۔ ان کی شادمانی بھی دیکھنے کی چیز ہوتی تھی۔ بالخصوص جامعہ سے اور جامعہ کے ابتدائی دور سے متعلق، جیسے ان میں فنون لطیفہ کی تمام رعنائی اور تہذیب و اخلاق کی گراں مائیگی سمو دی گئی ہو۔ پوچھا، ذاکر صاحب جامعہ میں سارجنٹ صاحب پر کیا گزری۔ خوش ہو کر کہا۔ وہ جامعہ کے مقاصد، نظم و نسق، نصاب، معیار اور پروگرام سے بہت مطمئن اور خوش ہوئے۔ میں نے دریافت کیا، یہ تو بتایئے سارجنٹ صاحب کو جامعہ سے متعلق تمام باتیں دکھانے سمجھانے کے لیے ساتھ کون تھا۔ بولے، ''کیا مطلب، میں تھا!'' میں چپ ہو گیا۔ چونک کر بولے۔ ''نہیں نہیں کچھ فرمایئے۔'' ذاکر صاحب کا چیلنج کا یہ انداز بڑا پُر لطف ہوتا تھا۔ ان کے بعض قریب ترین عزیزوں میں بھی

یہ جھلک ملتی ہے۔ عرض کیا جب آپ ہی دکھانے بتانے والے تھے تو ظاہر ہے غریب کو اپنی قوت ممیزہ اور قدرتِ فیصلہ کو کام میں لانے کی کہاں تک سکت رہی ہوگی۔ آپ تو اسے قرول باغ (اس وقت کا) دکھا کر بتا دیتے کہ یہ از ہر یا آکسفورڈ ہے تو وہ کہتا آمنّا و صدقنا! ذاکر صاحب ہنس دیے۔ یہ مبالغہ نہیں ہے۔ جہاں ذاکر صاحب معرض گفتار میں آئیں وہاں باطل تھا دعویٰ ہوشیاری کا۔

بے داغ اور بے شکن کھدّر کی ٹوپی، شیروانی اور پائجامہ میں ملبوس ذاکر صاحب دل کش نظر آتے تھے۔ یوں بھی بڑے خوش شمائل اور جامہ زیب تھے۔ جہاں ہوتے خوشی اور خلوص کی فضا پیدا ہو جاتی اور پھیلنے لگتی۔ کھدّر کے اوصاف کے بہت سے لوگ ہیں۔ میں اس کو اس لحاظ سے خاص طور پر قابلِ احترام سمجھتا ہوں کہ یہ ایک عظیم روایت اور عظیم تر شخصیت کا نشان یا سمبل ہے جس نے ہندوستان کو اس کی اخلاقی روایات، ملکی اور قومی ذمہ داریوں اور عالمی تقاضوں سے آشنا کرایا۔ مجھے کھدّر کی شیروانی اور پائجامہ زیادہ خوش نما معلوم ہوتا ہے۔ کھدّر کا لباس دیر تک صاف ستھرا رکھا جا سکتا ہو یا نہیں، دیر تک صاف ستھرا نظر نہیں آتا۔ صاف و نا صاف سے قطع نظر ذاکر صاحب ہر روز کپڑے تبدیل کر دیتے تھے۔ ان کے لباس میں کبھی سلوٹ یا شکن نظر نہ آئی۔ میرا خیال ہے کہ ایسے لوگوں کو کھدّر پہننے میں عجلت سے کام نہیں لینا چاہیے جن کی شکل اچھی ہو نہ اطوار!

کیا دن تھے اور کیسی باتیں جو اس وقت بغیر ارادے کے یاد آ رہی ہیں۔ ذاکر صاحب اور ان کے بھائیوں کی جائداد اور تعلیم کا انتظام مدتوں ان کے خالو صاحب کرتے رہے۔ ذاکر صاحب کہتے تھے کہ سال کے شروع میں وہ سفید موٹے کپڑے کے چھ سات کُرتے پائجامے سِلوا کر ایک خاص اسٹائل سے بھائیوں میں تقسیم کر دیتے۔ کالج کھلنے پر علی گڑھ آنے والے ہوتے تو بلاتے اور سامنے رکھے ہوئے کُرتے پائجاموں کو ایک ایک کر کے گنتے اور دیتے جاتے۔ مقررہ تعداد پوری ہو جاتی تو کہتے اُٹھا لو۔ ذاکر صاحب کہتے تھے کہ دینے کا یہ انداز خالو ہونے کا کم پٹھان ہونے کا زیادہ ہوتا تھا۔ یہ کوٹا کبھی نہیں بدلتا تھا البتہ ہم کو اختیار تھا کہ جب چاہیں اور جتنا خالص گھی منگا سکتے تھے۔ اس کی شہادت اس وقت کے سارے ساتھی دے سکتے

ہیں کہ ذاکر صاحب اس رعایت کا فائدہ جی بھر کے اُٹھاتے تھے جاڑوں میں صبح کے ناشتے میں ماش کی کھچڑی کے لیے، جس کی دعوت عام تھی۔ وہ خالو صاحب سے گھی ضرور منگاتے جو سیروں آتا۔ جلد سے جلد آتا، اور بذریعہ ڈاک آتا۔ اس زمانے میں کچھ اور نہیں تو خالص گھی خارج از قیاس نہ تھا۔ محصول ڈاک منصفانہ اور شریفانہ تھا اور ذاکر صاحب ہی نہیں دوسروں کے خالو بھی بات کے دھنی ہوتے تھے۔

ذاکر صاحب کو تمام عمر کُرتا ہی پہنتے دیکھا، قمیص کبھی نہیں۔ ان ہی روایتی آستینوں گریبان اور جیب و دامن کے ساتھ جو اُردو شاعری بالخصوص غزل کی ہزار شیوگی میں مسلسل اضافے کرتے رہتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے اپنے کُرتوں کی آستین گریبان اور دامن کے ساتھ چاہے جیسا سلوک کیا ہو، اپنی جیب کی حرمت کا ہمیشہ خیال رکھا۔ داہنی طرف لٹکتا ہوا جیب، جس میں انھوں نے کبھی ہاتھ نہ ڈالا، نہ رومال رکھا نہ کنجی نہ کاغذ نہ پیسے نہ ریوڑی! ظاہر ہے ایسی جیب میں کسی دوسرے کے ہاتھ کے لیے کیا ترغیب، اشارہ یا گنجائش ہوسکتی تھی۔ اتنے حصے سے دھوبی کو بھی تعرض نہ ہوتا ہو تو کیا عجب۔ ایم اے او کالج کا یونی فارم سیاہ ترکش کوٹ، ترکی ٹوپی، اوسط مہری کا سپید پائجامہ اور انگریزی جوتا تھا۔ انگریز اساتذہ یونی فارم کی پابندی پر بہت زور دیتے تھے۔ خاص طور سے اس پر کہ جوتے پر تازہ پالش ہو۔ اوپر سے نیچے تک کوٹ کے سارے بٹن لگے ہوں اور لباس ملگجا نہ ہو۔ کوٹ میں پورے بٹن نہ لگے ہوتے تو انگریز فوراً ٹوک دیتے۔ کالج سے یونیورسٹی ہوئی۔ پھر یہ پابندیاں رفتہ رفتہ اُٹھ گئیں اور ایسی اُٹھیں کہ یونی فارم کی پابندی درکنار ہر پابندی کا تصوّر عدم پابندی رہ گیا ہے۔ ذاکر صاحب نے اس پابندی کو آخر تک نباہا۔ ان کی شیروانی کا ایک بٹن بھی کھلا ہوا نہیں پایا گیا۔ شیروانی اور ٹوپی بغیر ان کو شاید ہی کسی نے دیکھا ہو۔ ان کے جوتوں پر ہمیشہ تازہ پالش ملی۔ وائس چانسلری کا عہد تھا۔ لکھنؤ سے ایک صاحب ملنے آئے۔ شیروانی کے سارے بٹن کھلے ہوئے، صرف آخری نچلا بٹن لگا ہوا تھا۔ اودھ میں شیروانی پہننے کا اسٹائل بھی شاید یہی ہے۔ ملاقاتی رخصت ہوگئے تو مسکرا کر بولے:

"کیسی اوریجنل طبیعت پائی ہے۔ شیروانی کے تمام بٹنوں کا کام صرف ایک ناف سے لے لیا۔"

ذاکر صاحب کی وفات پر کسی نے رائے عامہ کا سروے تو نہیں کیا۔ لیکن بڑے سے بڑے اور معمولی سے معمولی اشخاص سے پہلی بات جو سننے میں آئی وہ یہ تھی کہ اب مصیبت میں دلجوئی کون کرے گا اور دشواری میں صحیح مشورہ کون دے گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ہمدردی اور دانش مندی پر لوگوں کو کتنا بھروسا تھا اور اس کا حلقہ کتنا وسیع تھا۔ بڑے ذی حیثیت اصحاب کو یہی کہتے سنا کہ ذاکر صاحب کی موجودگی سے بڑی تقویت تھی۔ کوئی مشکل آن پڑتی اور فیصلہ کرنے میں دشواری ہوتی تو ذاکر صاحب سے رجوع کرتے وہ اس ہمدردی سے ایسی صائب رائے دیتے کہ مشکل آسان ہو جاتی۔ گورنر، وائس پریسیڈنٹ اور پریسیڈنٹ رہنے کے زمانے کے حالات مجھے زیادہ نہیں معلوم ہیں، لیکن سننے میں یہی آتا رہا کہ ان اعلیٰ مناصب پر فائز ہوتے ہوئے اور ان کی پابندیوں کے باوجود وہ ملنے والوں کے لیے سہل یاب تھے۔ ان میں اتنی خوبیاں مجتمع ہو گئی تھیں کہ وہ مرجعِ خواص نہیں مرجع خلائق ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کی مثال اس زمانے میں دیکھنے میں آئی تھی جب وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ جتنی جلد اور غیر متوقع طور پر حالات بدلتے ہیں روایات نہیں بدلتیں۔ مسلم یونیورسٹی کی ہیئت حیثیت جیسی کچھ رہ گئی ہو، اس کی حرمت کا احساس اس کی اعلیٰ روایات سے وابستگی اور اس سے ہماری بہترین توقعات کا وابستہ ہونا وہی ہیں جو پہلے کبھی تھیں۔ ان تمام لوگوں نے جو ذاکر صاحب اور علی گڑھ دونوں کو عزیز رکھتے تھے اور مایۂ افتخار جانتے تھے، ذاکر صاحب کو وہی جگہ دی جو ایم اے او کالج کے آنریری سکریٹری کو حاصل تھی۔ کسی کو کوئی دشواری کہیں پیش آتی وہ ذاکر صاحب سے رجوع کرتا۔ یہ مشکلات طرح طرح کی ہوتیں، ذاتی، سیاسی، علمی، نفسیاتی اور کبھی کبھی نفسانی بھی اسٹاف طلبا، چھوٹے بڑے ملازمین جب تک اپنی مشکلات لے کر ذاکر صاحب تک نہ پہنچ لیتے ان کی تشفی نہ ہوتی۔ اس میں وہ حق بجانب ہوتے اس لیے کہ بالآخر ذاکر صاحب ان کی تشفی کا کوئی نہ کوئی سامان کر دیتے۔

ذاکر صاحب کو جس طویل مدت تک جتنا قریب سے میں نے دیکھا، سمجھا اور ان کا معترف اور مدّاح رہا، شاید دوسروں کو ایسا اتفاق نہ ہوا ہو۔ لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جن لوگوں کو رفاقت مجھ سے کم میسّر رہی وہ بھی میری طرح ان کو عزیز و محترم رکھتے تھے۔ جیسے ان سے مل لینا

اور اعتبار وعزّت کرنے لگنا ایک ہی بات ہو جس کے لیے زمان و مکان کی تخصیص وتجدید کی بالکل ضرورت نہ ہو۔ وہ ساتھی بندگانِ خدا کا حق اسی شوق، پابندی اور احساس ذمہ داری سے ادا کرتے تھے جس طرح سے وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے فرائض روزہ نماز وغیرہ ادا کرتے تھے۔ نماز روزہ کو میں نے یہاں شرعی یا اصطلاحی معنوں میں نہیں لیا ہے، بلکہ اس کو ایک مکمل ڈسپلن سے تعبیر کیا ہے۔ انسانی زندگی کے تقاضوں کو اقدارِ اعلیٰ کی روشنی میں سمجھنے اور پورا کرنے میں جتنے واضح اور مکمل آداب و ہدایات نماز میں ملتے ہیں وہ بہ مشکل کہیں اور ملیں گے۔ مقررہ نماز پنج وقتہ ہوتی ہے، لیکن اس کی ڈسپلن ہمہ وقتی، ہمہ جہتی اور ہمہ گیر ہوتی ہے۔ ہماری تہذیب نفس اسی ڈسپلن کا عطیہ ہے۔ اگر یہ ڈسپلن پوری نہیں ہوتی تو نمازی کو سمجھ لینا چاہیے کہ احکام شرعیہ کے تقاضے پورے ہوئے نہ منشائے الٰہی کی تعمیل ہوئی۔ یہ باتیں میں نے نماز کے ماہرین نہیں بلکہ نماز کے محرومین کی طرف سے پیش کی ہیں۔ اگر ان سے اتفاق نہ کیا جا سکے تو مجھے گردن زدنی نہیں بلکہ ناقابلِ التفات قرار دے کر بخش دینا چاہیے۔ ذاکر صاحب میں اس تہذیب نفس کی بڑی اچھی جلوہ گری ملتی تھی۔ وہ عالم، عامی، بوڑھا، بچہ، نوجوان، ذی حیثیت، کم حیثیت، امیر وغریب، سب سے اس کی صلاحیتوں اور اس کے ذرائع اور وسائل کے مناسب حال ہمدردی کرتے اور جن تکالیف اور دشواریوں میں وہ مبتلا ہوتا اس کو اپنی تکلیف و دشواری سمجھ کر مشورے یا مدد سے حتی الوسع دور، ورنہ ان کو کم کرنے کی فکر کرتے۔ غرض کیسی ہی ہو، کسی کی ہو اس کو پوری توجہ اور ہمدردی سے سننے اور مشورہ یا مدد دینے سے ذاکر صاحب کبھی نہیں اُکتاتے۔ زیادہ سے زیادہ غرض مندوں کی صرف سنتے رہنا اور نہ اُکتانا میرے نزدیک کسی کے گور کے اندر خلد کا ایک در کھلنے کا موجب ہو سکتا ہے۔

ممکن ہے بعض اصحاب جو ذاکر صاحب سے اچھی طرح واقف نہ ہوں یہ خیال کرنے لگے ہوں کہ وہ زاہد خشک یا سادھو سنت قسم کے لوگوں میں سے تھے۔ اس کے بالکل برعکس ان جیسا ذہین طبّاع، فریس وفہیم، شگفتہ رو اور شگفتہ خاطر، بے تکلف، رفیق وشفیق کم ملے گا۔ کبھی اور کہیں ایک بات آج سے بہت پہلے کہی تھی۔ اسے آج یہاں دُہرانا چاہتا ہوں کہ سفر ہو یا حضر، معرکہ ہو یا محفل، رنج ہو یا راحت، تنہا ذاکر صاحب ساتھ ہوں تو پھر کسی دوسرے ساتھی کی ضرورت نہیں۔

خوبی اور خوب صورتی کا وہ ایسا مجموعہ تھے۔ عمداً یا سہواً کسی نے ان کی طنز وطباعی کی رگ کو چھو یا چھیڑ دیا اور ذاکر صاحب نے اسے قابلِ التفات سمجھا تو پھر مخاطب کو ایسا جھٹکا لگتا جیسے اس نے بجلی کا کھلا ہوا تار چھو لیا ہو۔ طنز وطباعی کے جیسے بروقت و بے خطا حربے، انداز ولب ولہجہ کے اختلاف کے ساتھ، مولانا محمد علی، عبدالرحمٰن صدیقی اور ذاکر صاحب کام میں لاتے تھے وہ میں نے کہیں اور نہیں دیکھے۔ گو جن کو میں نے دیکھا اور سنا ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ذاکر صاحب کی یہ خصوصیت طالب علمی کے عہد سے لے کر آخر تک قائم رہی۔ ورنہ بالعموم وہ نہایت دوستانہ اور شگفتہ موڈ میں رہتے۔ شاید ہی کبھی کبیدہ خاطر یا مایوس نظر آئے ہوں۔ ایک لطیفہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

1947 کا زمانہ تھا۔ دہلی میں خوں ریزی اور سفا کی کا جو عالم تھا وہ کس کو بھولا ہوگا۔ مصیبت زدہ اور پناہ گزینوں کی خدمت اور خبر گیری کے لیے دن رات ذاکر صاحب دوا دوش میں رہتے۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے روزانہ کے پروگرام میں یہ بھی تھا کہ ذاکر صاحب کو ہمراہ لے کر غیر مسلم حلقوں میں بھی دریافت حال کے لیے جانکلتیں۔ ذاکر صاحب ہی ترجمان ہوتے۔ کچھ دن بعد ملاقات ہوئی تو میں نے بڑے تردّد سے پوچھا۔ ذاکر صاحب دہلی میں جو قیامت برپا تھی اس میں آپ کہاں کہاں پہنچتے رہے کچھ نہ کچھ آپ کی جان کا بھی آپ پر حق تھا۔ بڑے لطف سے فرمایا۔ ''کیا کرتا، بعد میں.... کہتے خواتین کا حق نہیں پہچانتا اور مولانا... فرماتے خدا پر بھروسا نہیں کرتا!'' اس میں جان سخن وہ دو نام تھے جو لیے تھے۔ جان ہی کے خیال سے یہاں ان کا اظہار نہیں کرتا۔

میری آرزو یہ رہی ہے جو اب عادت بن چکی ہے کہ اچھی سے اچھی شے یا شخص علی گڑھ کا ہو، اچھی سے اچھی چیز علی گڑھ میں ملے اور ایسے ہی اشخاص علی گڑھ آئیں اور علی گڑھ کے ہو جائیں۔ کسی معقول اجنبی شخص بالخصوص نوجوان طالب علم سے ملاقات ہوتی تو اسے مشورہ دیتا جو کبھی کبھی اصرار کی حد تک پہنچتا کہ وہ ذاکر صاحب سے مل آئے۔ یہ اس بنا پر ہوتا کہ جب اس نوجوان نے مجھے اس درجہ خوش کیا ہے تو اپنی طرف سے ویسا ہی تحفہ بھی پیش کروں گا۔ یہ تحفہ اس کی ذاکر صاحب کی رہنمائی کی طرف ہوتا۔ آگے چل کر ان اشخاص کو بھی مشورہ دینے لگا جو

مذہب، معاشرہ، سیاست ہی سے نہیں خود ذاکر صاحب سے برہم و بیزار ہوتے۔ یہ لوگ ذاکر صاحب سے مل کر آتے تو بالکل بدلے ہوئے ہوتے جیسے انھوں نے ذاکر صاحب ہی کو نہیں اپنی اچھی صلاحیتوں کو بھی پالیا ہو۔ لیکن یہ مشورہ جتنا نوجوانوں پر کارگر ہوتا اتنا ہی ان لوگوں پر بے اثر ہوتا جن کو اعلیٰ اقدار کو ادنیٰ اغراض پر قربان کر دینے کے لیے نفس کا ادنیٰ سے ادنیٰ مطالبہ کافی ہوتا ہے، کبھی یہ اور اتنا بھی نہیں۔ عموماً وہ لوگ ہوتے جو اپنے کو مذہب سے جتنا قریب جتاتے مذہب ان سے اتنا ہی دور تر ہوتا۔ مذہب کی بڑائی کا ہمیشہ قائل رہا، ایسا نہ کروں تو اپنی کس خوبی پر بھروسا یا فخر کر سکوں گا، لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مذہب دراصل اتنا کسی کو بناتا یا بگاڑتا نہیں جتنا اس کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ کم از کم آج کل کے مسلمانوں میں تو یہی دیکھنے میں آرہا ہے۔ بالخصوص ایسے مسلمانوں میں جو مذہب کے کاروبار نفع و نقصان کے خطوط پر کرتے ہیں۔ نفع اپنا نقصان مذہب کا یا چاہے جس کا!

مجھے کسی خاص علم میں درک نہیں۔ اس علم و فن میں بھی جس کے طفیل اب تک روٹی اور عزّت کمائی ہے، لیکن کسی علم کے اسرار و غوامض سے قطع نظر اس کے بارے میں اتنا اندازہ لگا سکتا ہوں کہ عملاً وہ زندگی اور ذہن کے کن امور سے متعلق ہے۔ مثلاً کیمسٹری کے بارے میں موٹی سی ایک بات یہ جانتا ہوں کہ اس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر لینے کا کام لیا جاتا ہے۔ یعنی ہر مرکب سے اس کے مفردات یا مشمولات کس طرح علاحدہ کیے جا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مذہب یا شخصیت بھی یہی کام انجام دیتی ہے۔ یعنی اگر کسی کی طبیعت اور طینت کا پتا لگانا ہو تو اس کا سامنا کسی ایسے شخص سے کرا دیا جائے جو اقتدار اعلیٰ کا امین و آئینہ دار (مرد مومن یا مرد حق) ہو بڑی آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ شخص مذکور اپنی نہاد کے اعتبار سے اخلاقی فضائل سے ممتاز یا نفسیاتی اسقام میں مبتلا ہے۔ موخر الذکر ہر عبرت و عذاب کو جھیل سکتا ہے، نہیں برداشت کر سکتا ہے تو اچھے اور نیک نام شخص کو۔ اس طرح مردانِ حق کیمسٹری یا کسوٹی ہوتے ہیں جس سے دوسرے پہچان لیے جاتے ہیں۔ اخلاقیات سے بھی علوم طبعی، علومِ عمرانی اور کل پرزوں کا علم ہوتا ہے۔

ذاکر صاحب کی رحلت کے بعد اندازہ ہوا کہ کس کس سطح اور طبقے کے کتنے بے شمار لوگ تھے جو اُن سے محبت اور اُن کا احترام اس بنا پر کرتے ہیں کہ ایسا کرنے سے وہ خود اپنے کو

شایانِ شان اور قابلِ احترام سمجھنے لگتے تھے۔ ذاکر صاحب قرول باغ میں جس معمولی حیثیت سے اپنے رفیقوں کے ساتھ جامعہ کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے بعد جن مراحل سے گزرتے ہوئے صدر مملکت کے درجے پر پہنچے وہ کسے نہیں معلوم۔ لیکن جب وہ قرول باغ میں تھے اس وقت جتنے چھوٹے بڑے ان کی طرف بے اختیار کھنچتے اور جھکتے تھے اسی طرح آخری اور بلند ترین منصب تک وہ مرجعِ خواص وعوام رہے۔ ہر شخص ہر اعتبار سے ان کو معظّم ومکرّم جان کر ملتا تھا اور اس طرح اور اس لیے ملتا تھا جیسے ملے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ نہ یہ کہ ذاکر صاحب ان کے آقا یا حاکم تھے جس سے ان کی روزی، مرتبہ یا آبرو وابستہ تھی۔ کچھ اس طرح کی بات ہوگی کہ ان کی دفعتاً رحلت کی خبر سن کر راشٹر پتی بھون کا مالی روتے روتے بے ہوش ہو گیا اور ان کے سکریٹریٹ کے ایک عہدے دار پر قلب کا دورہ پڑا۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ذاکر صاحب ایک منصب سے دوسرے منصب پر فائز ہوتے تو ان کے اسٹاف کے افراد دل میں خواستگار ہوتے کہ ذاکر صاحب ان کو اپنے عملے میں لے لیں۔ ان میں سے بعض دوڑ دھوپ کرکے اس میں کامیاب ہو جاتے، ذاکر صاحب اپنی مرضی یا مصلحت کی بنا پر کسی کا انتخاب کر لیتے تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی۔ اس لیے کہ بڑے بڑے عہدے دار ایسا کیا کرتے ہیں اور ایک طور پر یہ حاکم کا حق سمجھا جاتا ہے۔ غیر معمولی بات یہ ہوتی کہ عملہ اس کا متمنّی ہو کہ ذاکر صاحب کی شفقت میں کام کرنے اور زندگی بسر کرنے کا موقع نصیب ہو۔

گذشتہ 22-20 سال سے تادمِ واپسیں ذاکر صاحب کی خدمت بہر صورت و بہر حال جتنی یہاں اسحاق نے کی وہ کسی اور نے نہیں کی، خلوص کی، خاموش، شبانہ روز، غیر منقطع خدمت جو نہ اعزا و احباب کے بس کی تھی نہ دولت و اقتدار کی نہ کسی اور کے۔ یہ شغف اور سپردگی ائمہ دین کے مریدانِ باصفا یا خادمانِ خاص میں البتہ سُنی اور دیکھی گئی ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن مالٹا میں اسیر تھے تو سردی کے دنوں میں تہجد کی نماز ادا کرنے کے لیے مولانا حسین احمد مدنی لوٹے میں پانی بھر کر اپنی گود میں لے لیتے تھے۔ جب گرم ہو جاتا تو مرشد کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ اس واقعہ کی شیخ الہند کو شاید کبھی خبر نہیں ہوئی۔ کچھ اسی طرح کا حال میاں اسحاق کا ذاکر صاحب کے ساتھ رہا۔ یہ 1948 میں ذاکر صاحب کو من جملہ اسباب وائس چانسلری

علی گڑھ میں دستیاب ہوئے۔ اس سے پہلے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی خدمت میں تھے اور اپنے فرائض اس لگن سے بجالاتے تھے کہ ذاکر صاحب نے ایک بار کہا تھا کہ اسحاق جس طرح ڈاکٹر ضیاء الدین کی خدمت کرتے ہیں صرف اسی کے صلے میں ان کی بخشائش مسلّم ہے۔ ان کو کسی اور عبادت کی یا کارِ خیر کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں عموماً یہ ہوتا کہ کم سے کم نوٹس پر اور کبھی کبھی ایسا کرنا بھی بھول جاتے دعوت یا پارٹی دے ڈالتے اور مہمان چاہے جتنے ہوں خورد و نوش کا سامان کم سے کم ہوتا۔ اسی طرح وہ ہندوستان کے اندر یا باہر کے سفر پر جلد سے جلد بغیر کسی اہتمام کے بے سان و گمان روانہ ہوجاتے۔ اس زمانے میں مشہور تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے زیادہ اور اچانک سفر کرنے والا ان کے درجے کا دوسرا کوئی نہ تھا۔ یہ ذمہ داری میاں اسحاق کی تھی کہ پارٹی بھی کامیاب رہے اور سفر میں بھی کوئی خلل نہ آئے۔ اسحاق نے کبھی ان تقریبوں کو حادثے میں تبدیل ہونے نہ دیا وہ جتنا کام کرتے اتنا ہی خاموش اور پُرسکون رہتے۔ دوسروں سے کام کم لیتے تھے خود زیادہ کرتے تھے۔ ان کو کام کرتے ہوئے دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی بڑے کارخانے میں کوئی بڑی مشین پورے طور پر برسرِ کار ہو اور کہیں سے بے آہنگ نہ ہو۔ مشیّت الٰہی کی کسے خبر، کیا عجب میاں اسحاق کو خلوص و خدمت کی جو تربیت ڈاکٹر ضیاء الدین کے ہاں ملی ہو وہ بالآخر ذاکر صاحب کی آسائش صحت و سلامتی کے لیے تقدیر تھی۔

علی گڑھ آتے ہی کچھ دنوں بعد ذاکر صاحب پر دل کا دورہ پڑا۔ اس زمانے میں اپنے آرام یا تکلیف اور نفع و نقصان سب سے منہ موڑ کر میاں اسحاق نے ذاکر صاحب کو ہر زحمت سے بچانے اور ہر راحت کے پہنچانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ ہمہ وقت ذاکر صاحب کے سامنے یا آس پاس موجود ہوتے۔ معالج کہتے کہ دوا علاج سے زیادہ میاں اسحاق کی خدمت اور تیمارداری ذاکر صاحب کے لیے مفید و مبارک ثابت ہوئی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کو وہم سا ہوگیا تھا کہ ذاکر صاحب کی دیکھ بھال کو کسی دوسرے پر چھوڑ دیا گیا تو اُن کو نقصان پہنچ جائے گا جس کے لیے وہ (میاں اسحاق) ذمہ دار ٹھہریں گے۔ ذاکر صاحب کے بعض ملنے والوں نے اس پر آزردگی کا بھی اظہار کیا کہ ان کو دیکھنے یا ان سے ملنے کے لیے

معالج کی نہیں بلکہ اسحاق کی اجازت لینی پڑتی تھی۔ دوا اور غذا منٹ منٹ کی پابندی سے دیتے۔ ناشتہ اور کھانا اپنے ہاتھ سے تیار کرتے۔ کمرے کی صفائی، بستر کی درستی، گلدان میں پھولوں کا ردّوبدل، ذاکر صاحب کو سہارا دے کر اُٹھانا بٹھانا، غسل خانے سے متعلق تمام امور کا انصرام کلیتہً اپنے ہاتھ میں رکھتے، ذاکر صاحب کو نیند نہیں آتی تھی۔ سونے کا وقت آتا تو تلووں پر مالش کرنے کے لیے تیل لے کر پہنچ جاتے اور جب تک اطمینان نہ ہو جاتا کہ نیند آگئی اپنا شغل جاری رکھتے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ معمولی آہٹ پر نمودار نہ ہو جاتے ہوں ذاکر صاحب کو شکر آتی تھی۔ میاں اسحاق نے اس کو جانچنے کا طریقہ سیکھ لیا تھا۔ ہر صبح قارورے کی رپورٹ، دواؤں کے نسخے، تشخیص کے تمام چارٹ پیش کر دیتے اور رات بھر کی کیفیت معالج کو سُنا دیتے، اور اس کی ہدایات کے مطابق دن کا پروگرام مرتب کرتے۔ خود بیمار ہوں یا بیوی بچے، ان کے اپنے گھر کے جھگڑے جھمیلے ہوں یا کچھ اور میاں اسحاق شاید ہی کبھی ذاکر صاحب سے علاحدہ ہوئے ہوں۔ وہ اس طور سے ذاکر صاحب سے وابستہ ہو گئے تھے کہ ان کو دیکھ کر معلوم ہو جاتا کہ ذاکر صاحب کس حال میں ہیں۔ بارے خدا نے شفا دی اور ذاکر صاحب یونیورسٹی کے کاموں میں اس طرح منہمک ہو گئے جیسے اس سے پہلے ایسے خطرناک مرض میں مبتلا ہی نہیں ہوئے تھے۔ ذاکر صاحب کے زمانے میں وائس چانسلر کی کوٹھی پھوس کی تھی، جو سرسید سے پہلے عہد کی یاد دلاتی تھی۔ مئی، جون میں علی گڑھ مسلسل پیلی آندھیوں کی زد میں ہوتا تو اس کوٹھی کے اندرون اور بیرون میں بہت کم فرق رہ جاتا۔ ایک رات ذاکر صاحب کے یہاں ڈنر تھا۔ کھانا ختم ہی ہوا تھا کہ ٹیلی فون آیا کہ کچھ اکابر دوسرے دن صبح سات بجے علی گڑھ پہنچیں گے، اور بریک فاسٹ کھانے کے بعد آگے بڑھ جائیں گے۔ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ گرد و غبار کا شدید طوفان آیا اور دو گھنٹے تک وہ سب ہوتا رہا جس کی زد میں کوئی شخص دیر تک نارمل نہیں رہ سکتا تھا۔ میاں اسحاق کو بریک فاسٹ کی اطلاع دے دی گئی۔ انھوں نے اسی خاموشی، اطمینان اور غیر جانب داری کے انداز سے سُنا جو اُن کا اسٹائل تھا۔ تھوڑی دیر بعد سائیکل اور جھولا سنبھالا اور شہر کو روانہ ہو گئے۔ رات گئے معلوم نہیں کب تک کہاں کہاں کی خاک چھانی اور کن دُکان داروں سے رابطہ قائم کیا، اور ضروری اشیا لے کر واپس آ گئے۔ جو چیزیں باورچی خانے میں تیار کرنی تھیں

وہ کیں، تمام رات کمرے جھاڑتے صاف کرتے رہے۔ سب کچھ بہ ذاتِ خود اور بہ دست خود۔ صبح دیکھا گیا تو ایسا معلوم ہوا جیسے رات طوفان نہیں بادِ صبا آئی تھی اور اپنے ہمراہ صفائی، ستھرائی، خوش گوار فضا اور بریک فاسٹ ساتھ لائی تھی۔ سارا سماں دیکھ کر ایک صاحب نے فرمایا۔ ''ذاکر صاحب، معلوم ہوتا ہے رات آپ کی کوٹھی طوفان کی زد میں نہیں آئی۔'' ذاکر صاحب نے فرمایا۔ ''کوٹھی تو زد میں آئی لیکن طوفان کی بد نصیبی کہ وہ خود اسحاق کی زد میں آ گیا۔''

دہلی میں ذاکر صاحب سے کبھی ملنا ہوتا تو یہ کسی طرف سے نمودار ہو جاتے۔ ذاکر صاحب کے کہے بغیر لیکن ان کی خواہش اور خوشی کے عین مطابق، فواکہات لا کر سامنے رکھ دیتے۔ اسی ادب اور آداب سے، جس میں مزید آمیزش خلوص و محبت کی ہوتی جو بڑے سے بڑے سرکاری اور غیر سرکاری مہمان کی مدارات کے پیش نظر ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔ اس پر خوش کہ ذاکر صاحب سے ملنے آیا اور ذاکر صاحب کو ان کی حفاظت و امانت میں پایا۔ میرے لیے اچھی سے اچھی کھانے کی چیزیں ایک ٹوکری میں پیک کر کے ساتھ کر دیتے، اس فخر سے ذاکر صاحب کو جیسے میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا چاہیے تھا۔ تحفہ پانے کی مجھے کیسی خوشی ہو گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ذاکر صاحب نے یہ سلوک مجھ سے اُن کی معرفت کرایا۔

ذاکر صاحب نے علی گڑھ سے باہر ملک اور حکومت کی دوسری اہم ترین ذمہ داریاں سنبھالیں۔ کتنے دور دراز کے ملکوں کا آئے دن سفر کرتے رہنا، کتنے نئے مسائل اور ان کے نازک و مشکل تقاضوں سے دوچار ہوتے رہتے ہوں گے۔ جن کا اثر ان کی کمزور صحت پر پڑتا ہو گا۔ ان کی غیر معمولی، اخلاقی، علمی، ذہنی اور دوسری اعلیٰ صلاحیتوں کی عالم گیر شہرت نے ان پر طرح طرح کی ذمہ داریاں عائد کر رکھی ہیں۔ وہ محض صاحب منصب نہ تھے جس کے چھوٹے بڑے بندھے ٹکے فرائض سکریٹریٹ کے کمپیوٹرس کرتے رہتے ہیں اور روزنہ کے کاموں کی خانہ پُری ہوتی رہتی ہے۔ میاں اسحاق ذاکر صاحب کے اس تمام سفر و سیاحت میں سایہ کی طرح ساتھ ہوتے، اور ان کی راحت اور کلفت کو اس طرح بانٹتے رہنے کی فکر میں رہتے کہ ذاکر صاحب کے حصہ میں صرف راحت آئے اور ان کی ساری کلفتیں یہ جھیلتے رہیں۔ ذاکر صاحب سفر میں

ہوتے تو متعلقین اور مخلصین کو اس کا یقین اور اطمینان رہتا کہ صدر مملکت کے شایانِ شان شروع سے آخر تک ہر منزل اور موقع پر حفاظت، منزلت اور راحت کے تمام ممکنہ انتظامات اپنی نیز میزبان حکومتوں کی طرف سے مکمل ہوں گے۔ لیکن میاں اسحاق کے ساتھ ہونے سے گھر والوں کو اس کی بھی تقویت رہتی اور یہ کوئی معمولی تقویت نہ تھی کہ ذاکر صاحب کی خدمت اور رفاقت کے لیے ان کا اور سارے گھر کا معتمد خاص بھی ساتھ ہے جو کسی رشتہ دار سے کم نہ تھا۔ بعض اعتبار سے زیادہ ہو تو عجب نہیں۔

مصالح مملکت کے پیش نظر، پہلے زمانے کے سلاطین و صنادید کی علالت، کبھی کبھی رحلت تک کی خبر حتی الوسع راز میں رکھی جاتی تھی۔ آج کل کے ڈکٹیٹر اس کی بھی شاید اسی روایت کا لحاظ رکھتے ہوئے میاں اسحاق نے کبھی نہیں بتایا کہ ذاکر صاحب کی طبیعت خراب ہے ناساز بھی ہوئی تو یہی بتاتے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ ذاکر صاحب کے متعلقین، راشٹر پتی بھون کے عمال، وہاں کی تقریبوں کی تفصیل ملاقاتیوں کی آمد و رفت، صدر مملکت کے ایوان کے کسی چھوٹے بڑے واقعہ کا ذکر شاید ہی کبھی کرتے ہوں۔ ایسی نزاکت کا سامنا ہوتا تو ''بخو دخلید و ہیچ نہ گفت'' پر عمل کرتے۔ ان کی عام خاموشی، ایک طرح کا مستقبل رکھ رکھاؤ اور اپنے کاموں میں مسلسل مشغولیت ان کو زبان اور کان کے ہر طرح کے فتنے سے محفوظ رکھتی۔ آج تک وہ کسی اسکینڈل کے راوی ہوئے نہ ریویوار۔ ان میں یہ اتنی بڑی فضیلت ہے کہ کتنے فضیلت مآب ان سے آنکھ نہیں ملا سکتے!

آخر وہ دن اور وقت آ گیا جو سب کو پیش آنے والا ہے۔ سوا اس کے جس کے ہاں زمان ہے نہ مکان، صرف اختیار ہے اور اقتدار جان آفرین کو اپنی امانت واپس لینے کا ذاکر صاحب کو دفعتاً پیغام آیا۔ اس وقت بھی میاں اسحاق غسل خانے سے لگے باہر کھڑے تھے۔ ان کو اس کا احساس تھا کہ معلوم نہیں کب اور کہاں ذاکر صاحب کو ان کی ضرورت پڑے۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہوتا وہ محافظ فرشتے کی مانند ذاکر صاحب کے پاس ہی رہتے۔ چنانچہ سب سے پہلے روح سے جدا جسد و جسم کو اسحاق ہی نے دیکھا، چھوا اور بے قراری و محرومی کے بے اماں احساس کے ساتھ دعائے مغفرت کی چادر میں لپیٹ لیا۔ جب تک میت گھر پر رہی اور

تیسرے دن جب سپرد خاک کی گئی۔ حاضر و غائب لحظہ بہ لحظہ دیکھ بھال کرتے اور اس پر نثار ہوتے رہے۔ جیسے ابھی ابھی ان کے تلووں پر تیل کی مالش کر کے اُٹھے ہوں اور ذاکر صاحب کی آنکھ لگ گئی ہو۔ راشٹرپتی بھون سے قبر کے کنارے تک پھولوں سے ڈھکے ہوئے جسم اور کھلے ہوئے چہرے پر مسلسل کئی گھنٹے کھڑے کھڑے پنکھا جھلتے اور مٹی کو گرد اور گرمی سے بچاتے ہوئے پہنچے۔ یہاں تک کہ ذاکر صاحب کو ہر طبقے کے بے شمار ماتم گساروں کے یاس والم اور دعائے مغفرت کے ہجوم میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ میاں اسحاق کے اعصاب نے تین دن تک اس مسلسل فشار کو بالخصوص راشٹرپتی بھون سے جامعہ ملیہ تک جہاں تدفین عمل میں آئی کس طرح برداشت کیا، کتنا عجیب کرشمہ ہے۔ کون جانے احساسات کے تانے بانے پر بُنے ہوئے انسان میں یہ توانائی کہاں سے آئی!

جب سے اسحاق[1] ذاکر صاحب سے وابستہ ہوئے میں نے ان سے زیادہ کسی اور کو ذاکر صاحب کے ساتھ اور ان کے قریب نہیں پایا۔ چنانچہ ذاکر صاحب کے نزدیک ترین عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے تو اتنا خیال ذاکر صاحب کی طرف نہیں جاتا، جتنا اسحاق کو دیکھتے ہی ذاکر صاحب یاد آ جاتے ہیں اور ایک بار پھر پچھلی یادیں دور تک جگمگاتی چلی جاتی ہیں۔ جیسے ماضی کے ستونوں کی طویل قطار پر بجلی کے قمقمے سرِشام یکے بعد دیگرے چشم زدن سے بھی کم وقفوں کے ساتھ روشن ہوتے ہوئے ماضی کی تاریک اور پُر اسرار خاموشیوں میں غروب ہو جاتے ہوں۔ خدمت اور خلوص کا یہ فیضان تمام دوسرے رشتوں سے کتنا عجیب، کتنا مختلف اور کتنا گراں بہا ہوتا ہے اس کا اندازہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کا قد و قامت خود ان کے بالشت سے بھی کم ہوتا ہے!

اسحاق نے ذاکر صاحب کی خدمت گزاری میں ماں، بہن بھائی اولاد سب کی شفقت، محبت، حمیّت اور جاں نثاری کا حق ادا کر دیا۔ آج وہ اس احساس محرومی و مفارقت میں بھی برابر کے شریک ہیں جن سے اراکینِ خاندان دوچار ہیں۔ شب و روز کی اپنی مسلسل خاموشی خیر خواہی اور احساس ذمہ داری سے، کون کہتا ہے دنیا سے رسمِ وفاداری اُٹھ گئی۔

---

1 (م1979)

ذاکر صاحب کی تصانیف، تراجم اور لکچرز پر ارباب فکر وفن نے شرح و بسط سے اظہار خیال کیا ہے۔ ان گراں قدر خیالات پر میں کوئی اضافہ نہیں کرسکتا۔ یہاں اس کی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ ذاکر صاحب سے اکثر فرمائش کرتا کہ اپنی زندگی اور ہم عصروں اور ہم سفروں کے بارے میں کچھ لکھ ڈالیں۔ یہ بھی عرض کرتا کہ اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ اس سے آپ کی شہرت میں اضافہ ہوگا۔ البتہ اس کا یقین ہے کہ اُردو میں جو چیز آپ لکھ دیں گے وہ اس صنف ادب میں بے نظیر ہوگی اور علی گڑھ کی طرح میں اُردو کو بھی بے نظیر دیکھنا چاہتا ہوں۔ بات کچھ آگے چلی تو عرض کیا کہ اُردو جس حال کو پہنچ گئی یا پہنچا دی گئی ہے۔ اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ جو چیز بے نظیر ہوگی وہ دنیا کے کسی اچھے شعر و ادب میں کم بے نظیر نہ ہوگی۔ میری اس طرح کی گرم گفتاری یا بے اختیاری پر ذاکر صاحب بالعموم مسکرا دیتے یہ مسکرانا اس طرح کا ہوتا جیسے میرا کہنا بھی درست تھا اور اس کا نہ مانا جانا بھی درست نہ تھا۔ یہ فرمائش پوری نہیں ہوئی۔ ذاکر صاحب چاہتے بھی تو شاید نہ کرسکتے۔ جس منصب عالیہ پر وہ فائز تھے اور جن پر وہ رہ چکے تھے اور طرح طرح کی جن ذمہ داریوں کا سامنا تھا، اس میں کوئی ایسا بیان دینا جس سے کسی فتنے کے اُٹھ کھڑے ہونے کا امکان ہو قرین مصلحت نہ تھا۔ وہ اپنے بے شمار ملنے والوں اور رفقا میں سب کو قابلِ اعتبار و احترام نہیں سمجھتے تھے۔ شاید کوئی بھی نہیں سمجھتا۔ سرگزشت لکھنے میں اس طرح کی نزاکتیں قدم قدم پر پیش آتی ہیں۔ چنانچہ ذاکر صاحب نے وہی کیا جو ہمیشہ سے کرتے آئے تھے۔ یعنی جھگڑنے سے جھیلنے کو بہتر سمجھا۔ یوں بھی جب ہر طرف بارود بچھی ہو اس وقت شرر یا شریر دونوں سے دور رہنا اور دوسروں کو دور رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہر شخص بہ قدرِ استعداد و ظرف قدرتی طور پر اس کا اظہار کسی نہ کسی شکل میں کسی نہ کسی وسیلے سے کرے اور اس کے تاثرات و تجربات میں اس کا کوئی شریک ہو اور ان کی تصدیق کرے۔ جو لوگ خلوص و خدمت کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ ایک طور پر مامور من اللہ ہوتے ہیں۔ ان کی پیروی و تصدیق خیر و برکت کی محرک و موجب ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کی پوری زندگی ایسی ہی تھی۔ ان کی سرگزشت اچھے اور بڑے لوگوں کے اچھے اور بڑے کاموں میں ہمیشہ تصنیف ہوتی رہے گی۔

ذاکر صاحب نے اپنی سرگزشت نہیں لکھی، لیکن جس کام کے لیے وہ شعوری طور پر آمادہ نہیں ہوئے۔ ان کے اعلیٰ فکر و عمل کے تقاضوں نے ان سے غیر شعوری طور پر کرالیا۔ انھوں نے ایک قصہ لکھ ڈالا۔ کچھ دن ہوئے اس کا مسودہ میں نے پڑھا تھا تفصیل یاد نہیں رہی، لیکن اس کے تاثرات ذہن کے پردوں پر طرح طرح کے نقش و نغمے میں اُبھرتے رہتے ہیں۔ قصہ کچھوے اور خرگوش کی دوڑ اور فتح و شکست کا ہے۔ جس کو معلوم نہیں کب سے ہم اپنے اب وجد سے سُنتے چلے آرہے ہیں اور آنے والی نسلیں رہتی دنیا تک سُنتی اور سُناتی رہیں گی۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہ قصہ بچوں کے لیے تھا۔ ذاکر صاحب نے اس کا رُخ بچوں کے بزرگوں کی طرف پھیر دیا ہے۔ پرانی شراب کو نئی بوتلوں میں نہیں پیش کیا ہے جیسا کہ ایسے موقع پر کہہ کر فارغ ہو جایا کرتے ہیں، بلکہ پُرانی شراب کو نیا نشہ اور نئے مے کش و مے خانے دیے۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نئی نسل کو نئی نگاہ بخشی گئی ہے۔ ذاکر صاحب نے اس قصے کا جو قصہ لکھا ہے اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جس تصنیف کا تعارف کراتے ہیں۔ اس سے اس کی کتنی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ اکثر یہ طے کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ذاکر صاحب کا یہ احسان کس پر زیادہ ہے، مصنف پر یا اس کے پڑھنے والے پر جمہوریہ افلاطون کا انھوں نے جو اُردو ترجمہ کیا ہے۔ اس کے مقدمے کو پڑھ کر یہی احساس ہوتا ہے۔ زیرِ نظر تصنیف کو تمثیل، افسانہ، کہانی جو چاہے کہہ لیجیے بہتر اور صحیح تر یہ کہنا ہوگا کہ یہ ''آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری'' کی مصداق ہے۔ بڑا فن کار دراصل وہ ہے جس کے فن پارے میں ہر فن کے حاصل اور حسن کی جلوہ گری ملے۔ اسی کو ''فن کارِ اعظم'' اور اس کی قدرت کے قریب ہونا کہتے ہیں جو ہر فن کار کا منتہائے نظر اور مقصدِ اعظم ہوتا ہے۔

قصے کا مکان و مقام نواح جامعہ ملیہ ہے۔ اس سے متصل دور تک پھیلی ہوئی جمنا کی آبِ رواں کی صاف و شفاف چادر اور ریت کا لہریے دار رقبہ ہے۔ جگہ بڑی سکوت افزا، خوب صورت اور صحت بخش ہے یہاں جامعہ کے اساتذہ اور طلبا صبح و شام سیر کو جایا کرتے تھے۔ دہلی سے بھی لوگ فرصت منانے اور خوش وقت ہونے کے لیے آیا کرتے ہیں۔ ایک دن جامعہ کے ایک مولوی صاحب کی ملاقات ایک سال خوردہ کچھوے سے ہوئی جو ریتی پر ایک طرف کسی

گہری سوچ اور حیرانی میں بیٹھا ہوا تھا۔ مولوی صاحب سے صاحب سلامت ہوتی ہے، مولوی صاحب کی تپاک وتوجہ سے ہمت افزائی ہوئی تو کچھوا ڈرتے ڈرتے پوچھتا ہے۔ مولوی صاحب بہت دنوں سے ایک کرید پیدا ہوگئی ہے جس سے نہ دن کو چین ہے نہ رات کو بس۔ آپ بڑے وِدّوان ہیں کوئی اُپائے بتائیے۔ مولوی صاحب ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں تو بڑے تردّد سے پوچھتا ہے۔ مولبی صاحب پرکھوں سے سُنتا آرہا ہوں کہ کبھی کچھوے اور خرگوش کی دوڑ ہوئی تھی۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ، آپ بتائیے جیت کس کی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب سوچ میں پڑ جاتے ہیں، ایک طرف کچھوے کی مدد کرنا چاہتے ہیں دوسری طرف اس کے سوال کا جواب اپنے بس کا نہیں پاتے۔ لیکن ایک سادہ دل اور بہادر انسان کی مانند مشکلات کو خاطر میں لائے بغیر انھوں نے کچھوے کے دردِسر کو اپنا دردِسر بنالیا۔ پھر جیسے مایوسی کے گھور اندھیرے میں کوئی جگنو چمک گیا ہو۔ بڑے اعتماد وافتخار کے لہجے میں بولے۔ اطمینان رکھو، ہمارے یہاں ایک سے ایک وِدّوان رہتے ہیں۔ کل صبح سویرے یہاں لاؤں گا وہ تمہارا اطمینان کرادیں گے۔ کچھوا مطمئن ہوگیا۔ دوسرے دن صبح کو مولوی صاحب نے اپنے یہاں کے عالموں میں سے ایک کو ساتھ چلنے پر آمادہ کیا، کچھوا اپنی جگہ پر مجسم انتظار وانکسار بیٹھا ہوا ملا۔ مولوی صاحب نے تعارف کرایا۔ کچھوے نے ہاتھ جوڑ کر بڑے ادب اور عاجزی سے اپنا سوال پیش کیا۔ عالم نے کچھوے کے سوال اور اس کی پریشانی کو نظرانداز کرکے اپنے علم کے سمندر اور اپنی شناوری پر خطبۂ صدارت شروع کردیا۔ کچھوے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ موقع پاکر بڑی لجاجت سے اپنا سوال دُہراتا تو عالمِ چراغ پا ہوکر طوفان تکلم کو مہمیز کردیتا۔ کچھ دیر بعد عالم چلے گئے۔ کچھوے نے بڑے دُکھ اور مایوسی سے مولوی صاحب سے پوچھا۔ ''مولبی صاحب کیا یہ وِدّوان مجھ سے یا میری باتوں سے ناراض ہوگئے، مولوی صاحب کو بڑی ندامت اور اتنا ہی غم ہوتا ہے، لیکن کچھوے کو دلاسا دیتے ہوئے کہتے ہیں، مایوس نہ ہو کل دوسرے وِدّوان کو لاؤں گا۔ وہ تمہاری مشکل آسان کردیں گے، صبح کو یہیں ملنا۔ دوسرے دن مولوی صاحب دوسرے علم کے ایک عالم کو لے جاتے ہیں۔ کچھوا بہ دستور اپنی جگہ پر اُمید لگائے بیٹھا ہوا ملا۔ آج بھی وہی حادثہ پیش آتا ہے جو کل آیا تھا۔ کچھوے کی مایوسی بڑھتی جاتی ہے، لیکن مولوی صاحب کی اُمید اور عزم بڑھتا جاتا

ہے۔ وہ ہر شام کچھوے کو دلاسا دیتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ دوسری صبح کوئی شان وشہرت والا وِدْوان لائیں گے۔ صبح ہوتی ہے نئے وِدْوان آتے ہیں۔ مولوی صاحب بڑی اُمید اور ارمانوں کے ساتھ ان کے ہمراہ ہوتے ہیں۔ لیکن کچھوے کی شام کی صبح نہیں ہوتی۔ یہاں تک کے ایک ایک کر کے سارے وِدْوان اور ان کے واکھیان ختم ہو جاتے ہیں۔ یہاں سے اب یاد نہیں رہا ہے[1] کہ کیا ہوا۔ جس کے بعد کچھوے اور خرگوش کی دوڑ ہوئی۔ کچھوا پیچھے رہ گیا اور خرگوش چھلانگیں بھرتا مقررہ نشان پر پہنچ گیا جو ایک زمین دار کا سرسبز و شاداب لہلہاتا ہوا باغ اور کھیت تھا، وہاں پہنچ کر کبھی گھاس کترتا کبھی ترکاری کی کیاری میں تھرکتا اور طرح طرح سے اظہارِ خرمی کرتا۔ دفعتاً ایک طرف سے زمین دار کا لڑکا اپنے شکاری کتے کے ساتھ نمودار ہوا۔ کتے نے جھپٹ کر خرگوش کا گلا دانتوں میں لے کر جھٹکا دیا اور خرگوش بے جان ہو کر کتے کے منہ میں لٹک کر رہ گیا۔ یہ منظر دیکھ کر کچھوا کرب سے بلبلا اُٹھا اور بولا۔ ''ارے یہ کیا ہوا یہ تو میں نے نہیں چاہا تھا!'' ڈراما ختم ہو گیا۔

اس کا اطمینان نہیں ہے کہ ذاکر صاحب نے ڈرامے کے تمام مناسبات اور جزئیات کا لحاظ رکھتے ہوئے جو باتیں جس طرح پیش کی ہیں اور سطر سطر میں ان کی بے مثل قدرتِ تحریر طنز وطباعی اور حقائق کے عرفان واحترام کی جو مثالیں ملتی ہیں اس کا خاطر خواہ تعارف کرا سکا ہوں۔ میرے لیے یہ آسان بھی نہ تھا اس لیے کہ مجھے ڈرامے کی تاریخ سے واقفیت ہے نہ اس کی تکنیک

1۔ ذاکر صاحب کی وفات کے بعد کئی بار کوشش کی کہ اس تصنیف کا اصل مسودہ تھوڑی دیر کے لیے سرسری طور پر دیکھنے کو مل جائے تاکہ جو باتیں یاد رہ گئی ہیں یا یاد آتی رہتی ہیں ان کی صحت یا عدم صحت کی طرف سے اطمینان ہو جائے اور جو یاد نہیں ہیں وہ یاد آ جائیں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اس وجہ سے اگر ان سطور میں کہیں کوئی غلط بیانی یا اخذ نتائج میں کوئی نقص راہ پا گیا ہو تو معاف فرمایا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعد میں وقتاً فوقتاً ذاکر صاحب نے کہیں کہیں طویل یا مختصر حذف اضافے یا ترمیم سے کام لیا ہو جس کی مجھے خبر نہ ہو۔ اس ڈرامے کا ذکر اس لیے کرنا پڑا کہ اس میں اس سرگزشت کی (جو نہیں لکھی گئی) بہت سی باتیں سرِّ دلبراں اور حدیثِ دیگراں کے راستے سے آ گئی ہیں سرگزشت سے ذاکر صاحب کے فضائل پر روشنی پڑتی، اس تصنیف سے ان کے فضائل کی روشنی کا منارہ سامنے آتا ہے۔

اور نزاکتوں کا علم۔ لیکن اس ڈرامے کے مطالعے سے اس کا احساس ہوا کہ یہ فن کتنا اہم، کتنا مشکل اور ممکنات مبہمہ سے کس درجہ لبریز ہے۔ نیز یہ کہ اُردو میں ڈرامے کے اچھے نمونے کتنے کم ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ طربیہ ہو یا المیہ، ڈرامے کا کرائسس بتدریج بڑھتا رہتا ہے۔ اسی اعتبار سے انجام کی خبر اور خطوط واضح ہونے لگتے ہیں۔ ذاکر صاحب کے اس ڈرامے کا امتیاز جو بہت کم ڈراموں میں نظر آئے گا یہ ہے کہ آخر کی دو تین سطروں سے پہلے تک کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بظاہر ایسا ہلکا پھلکا طربیہ ایسے گہرے اور چکرا دینے والے المیہ پر ختم ہوگا۔

جس طرح اس ڈرامے کی جان کچھوے کا یہ فقرہ ہے۔ ''ارے یہ کیا ہوا یہ تو میں نے نہیں چاہا تھا'' اسی طرح اس ڈرامے کا آخر پڑھ کر پڑھنے والا بے اختیار کہہ اُٹھے گا۔ ارے یہ کیا یہ تو میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔ ذاکر صاحب کی اس تصنیف نے اُردو ڈرامے کو اوّل اور آخر ایک ہی کوشش میں اُردو غزل کے معیار تک پہنچا دیا۔ کیا کروں میری طبیعت فن اور فن کار کو اکثر اُردو غزل کی میزان میں تولنے پر مائل رہتی ہے!

سچائی بہت سہل اور سادہ ہوتی ہے۔ ایسی نہ ہوتی تو ہر شخص کو بتایا کیسے جا سکتا اور وہ سمجھ کیوں کر پاتا کہ سچائی کتنی ضروری ہے اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔ لیکن اس کی تلاش و تصدیق اتنی ہی مشکل ہے۔ مثلاً شیان کی تقدیر اسی کی شہادت دیتی ہے۔ ڈرامے کا مرکزی اور بنیادی کردار کچھوے کا ہے۔ کتنا مختصر سیدھا سادہ کیریکٹر ان صفات اور اتنی ہی سی صفات کا ہیرو شاید ہی کسی اور ڈرامے میں نظر آئے۔ وہ اس حقیقت کی تلاش میں ہے کہ مقابلہ کیا ہے، ہار جیت کسے کہتے ہیں، ایسا کیوں ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ کیا ہونا چاہیے۔ تجسس و تفتیش کی اس مہم کا آغاز وہ بڑی مسکنت اور انکسار سے کرتا ہے۔ اس کا بڑا خیال رکھتا ہے کہ اس سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے، کوئی آزردہ نہ ہو۔ اس کا گمان بھی ہوتا ہے تو وہ تلاش حق کو نظر انداز کر کے تالیفِ قلب پر مائل ہو جاتا ہے اور طرح طرح سے معذرت کرتا ہے۔ خرگوش کا المناک حشر دیکھ کر اس پر جو کرب طاری ہوتا ہے اور جو کلمات بے اختیار اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں ان میں کیا اشارے ملتے ہیں، ان مسائل پر بحث کرنے کا حق جن ارباب فکر و نظر کو پہنچتا ہے۔ ان میں مَیں نہیں ہوں، البتہ اس آواز کی گونج سے کان آشنا معلوم ہوتے ہیں، جیسا کہ

فانؔی نے کہا ہے: ع

آواز آ رہی ہے یہ کب کی سُنی ہوئی

فانؔی شاعر تھے وہ غیب کی آواز سُن سکتے تھے اور اس کی تعبیر بھی جرأت سے کرتے تھے۔ مجھ عامی کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ اسی انداز و انتباہ کی آواز تھی جو آج سے 22 سال پہلے دہلی میں شقاوت کی ایک شام کو سُنائی دی تھی۔ کیا عجب کہ زیرِنظر ڈرامے کے ہیرو کی صدائے کرب اسی آواز کی بازگشت ہو جس کی ذاکر صاحب نے اس محبت وحسرت سے یاد دلائی ہو۔

ڈرامے میں ہجوم تو بہتوں کا ہے بالخصوص وِدّوانوں کا لیکن ممتاز صرف دو ہیں، کچھوا اور مولوی صاحب۔ مولوی صاحب کا علم اور عقل دونوں واجبی ہیں جو مسائل ڈرامے میں آئے ہیں ان کا سمجھنا موصوف کے بس کی بات نہیں، لیکن کسی کی تکلیف و تردّد میں کام آنے کے لیے اپنی ساری اچھی صلاحیتیں اور ذرائع و وسائل کو بے دریغ کام میں لانے اور مسلسل ناکامی کے باوجود کوشش جاری رکھنے بلکہ تیز تر کر دینے اور رکھنے کا جیسا ناقابلِ تسخیر جذبہ ان میں ملتا ہے وہ لاجواب و لازوال ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں ان کو کچھوے کا مکمل اعتماد حاصل ہو جاتا ہے۔ کچھوے کی ذہنی خلش ان کی سمجھ میں نہیں آتی، لیکن اس کو دور یا کم کرنے کے لیے ان کی تمام تعمیری و اخلاقی صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ جامعہ میں چوٹی کے جتنے وِدّوان تھے ان سب کو یکے بعد دیگرے کچھوے کے پاس لے جاتے ہیں کہ وہ اپنے علم کے زور سے کچھوے کی مشکل آسان کر دیں۔ لیکن ان علما کا بندھا ٹکا فرسودہ، بے آب و گیاہ بے برگ وثمر، غیر منہضم و غیر مربوط علم جو شخصیت کے فیضان سے دور اور محروم رہا ہو۔ انسانی مسائل کی نہ کبھی تشخیص کر سکا نہ اس کا حل کر سکا۔ صورت حال یہ ہے کہ نہ کچھوے کی تشفی ہوتی ہے نہ مولوی صاحب ہار مانتے ہیں۔ کتنے محدود، ناقابلِ اعتبار و ناقابلِ لحاظ مادّی اور ذہنی وسائل کے ایک فرد کو رفیق اعلیٰ کی طرف کتنی لامحدود رفاقت و ہمدردی کی دولت نصیب ہے!

بے چارے کچھوے اور بے چارہ تر مولوی دونوں کے سامنے وِدّوانوں نے اپنی اپنی فہم و فراست کا جیسا مولویانہ مظاہرہ کیا اس سے پتا چلتا ہے کہ آج کل ہمارے علم و عقل اور عقیدے کا معیار یا سطح کیا ہے اور عالموں میں عطائیت اور سطحیت کہاں تک سرایت کر چکی ہے۔

مغربی شعر وادب کا میں معترف ہی نہیں اس سے مرعوب بھی ہوں۔ لیکن اچھے سے اچھے تنقید نگاروں کو مغربی ادب کے نام سے یا اس کی آڑ لے کر جو کچھ پیش کرتے دیکھتا ہوں اور جس طرح ان کے پس رو اپنے شعر وادب کی عبادت گاہوں پر پتھر پھینکتے ہیں اور طرح طرح کا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اس سے تفریح بھی ہوتی ہے، عبرت بھی! دوسرے اور تیسرے درجے کے تنقید نگاروں سے قطع نظر جو لوگ ہمارے یہاں کے سربرآوردہ تنقید نگار مانے جاتے ہیں، ان کی تحریروں کو بھی دیکھ کر کچھ کم حیرت نہیں ہوتی۔ جب غالبؔ کے زمانے میں پابندی رسم ورہِ عام اتنی بڑھ گئی تھی کہ غالبؔ کو اہلِ خرد کو متنبہ کرنا پڑا تھا کہ وہ کس روشِ خاص پہ نازاں ہیں تو آج ان کی صد سالہ برسی کے عہد میں شعر وادب کا جو معیار رہ گیا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ کبھی کہیں پڑھا یا سُنا تھا کہ ایک من علم کے سمجھنے کے لیے دس من عقل چاہیے۔ اسی طرح کا کوئی فارمولا ہمارے ایسے تنقید نگاروں کے لیے وضع ہونا چاہیے جن کے یہاں دونوں من مانی ہیں۔ آج کل کے علم وعلما کا جو نقشہ اس ڈرامے میں ذاکر صاحب نے کھینچا ہے وہ بڑا دل نشین اور فکر انگیز ہے اس کا اندازہ اس وقت ہوسکتا ہے کہ جب ہم اس امر کو ذہن نشین رکھیں کہ خود ذاکر صاحب کو ان علوم پر کتنا کامل عبور تھا کہ انھوں نے اس خوب صورتی اور مہارت فن سے ان کے عالموں کے مبلغ علم کی نشان دہی کی ہے۔ کسی علم، فن یا فن پارے کی تعریف کرنا آسان ہے اور قابلِ معافی بھی۔ لیکن اس پر نقد وجرح کے لیے اس فن کار سے کافی زیادہ استعداد نہ ہو تو لب کشائی جرم ہے۔ اتنا بڑا جرم جس کو حماقت کہتے ہیں۔

جس طرح فضا میں خلا محال ہے اسی طرح اُردو ڈرامے (افسانوں میں بھی) عورت اور villain (ڈرامے کا بدکردار یا بدخصال) کی عدم موجودگی بھی محال ہے۔ کیسا فن، کیسے فتنے! جیسے عورت اور ویلین قصے کے دو پہیے یا پاور کا کام دیتے ہوں زیرِ نظر ڈرامے میں دونوں میں سے ایک بھی نہیں ہے۔ صرف چھوا اور مولوی صاحب سب کچھ ہیں، لیکن انسانی فضائل کے کیسے کیسے گراں قدر مسائل ومثالیں ان دونوں کے گرد اُبھرتے ہیں اور حل ہوتے ہیں! عورت اور ویلین کی کشش نہ ہونے کے باوجود یہ ڈراما طرح طرح کے ڈرامائی لمحات اور احوال سے لبریز ہے۔ ڈرامے میں شروع سے آخر تک ذاکر صاحب کی پہلودار شخصیت کی بڑی دل کش جلوہ گری

ملتی ہے۔ خفی اور جلی دونوں! اچھے ناول، افسانہ اور ڈرامے میں ہیرو دراصل مصنف خود ہوتا ہے۔ ضابطے کے ہیرو کی حیثیت وجودِ ظلّی کی ہوتی ہے۔ مسودہ پڑھنے کے بعد ذاکر صاحب سے عرض کیا تھا کہ اگر اس کا عمدہ ترجمہ ملک کی ممتاز زبانوں اور انگریزی میں شائع ہو سکے تو بڑا مفید کام ہوگا۔ اپنوں کے علاوہ غیر ممالک کے دانش ور بھی اندازہ کر سکیں گے کہ یہ ڈراما ضمیرِ انسانی کا کتنا سچا اور اچھا ترجمان ہے۔ یہ ایک ایسی تصنیف ہے جو ملک کے ہر اعتبار سے کسی معتبر سفیر کی ہو سکتی ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج تک اچھے سفیر کی ہر ملک کو کتنی ضرورت ہے۔ ذاکر صاحب نے اس کے جواب میں وہی کیا اور جو ایسے موقعوں پر وہ بالعموم کہا یا کیا کرتے تھے۔ جس کی طرف پچھلے سطور میں کہیں اشارہ کر چکا ہوں۔

زندگی کی خوشی اس میں نہیں کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ خوشی اس میں ہے کہ ہم کتنوں کے رنج و راحت میں اور کتنے ہمارے رنج و راحت میں شریک رہے۔ اسی کو عزّت و محبت کی زندگی کہتے ہیں جو صرف انسان کو نصیب ہے۔ زندگی منزل بہ منزل اسی راستے اور روشنی میں ترقی و تہذیب کی اس بلندی تک پہنچی ہے جس سے آج ہم سرفراز بھی ہیں، سرگراں بھی! زندگی کا یہ کارواں کیسی کیسی آزمائشوں سے گزرتا ہوا ہم تک پہنچا ہے اس کا اندازہ ان اچھے اور بڑے لوگوں کی دل سوزی، دانش مندی اور دلیری کی خدمات سے کیا جا سکتا ہے۔ جنھوں نے ہر خطرے کا سامنا کیا اور ہر طرح کے مصائب جھیلے لیکن زندگی کے صحیح اور سیدھے راستے سے منہ نہ موڑا۔ اسی سے یہ اُمید قوی اور قائم ہے اور رہے گی کہ زندگی کیسے ہی تہلکے سے کیوں نہ گزرے تہذیب انسان کا منارہ روشن سے روشن تر ہوتا رہے گا۔

ذاکر صاحب ایسے ہی اچھے اور بڑے لوگوں میں سے تھے۔ ان کی عزّت و محبت زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دلوں میں تھی اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کی محبت و عزّت ذاکر صاحب کے دل میں تھی۔ ان سے تکلیف شاید کسی کو نہیں پہنچی۔ تسلّی، تشفی اور تقویت ان سب کو ملی جو اُن تک پہنچ سکے۔ خدا ایسے بندوں کو پسند کرتا ہے جو اس کے لاچار بندوں کی دلجوئی کرتے ہیں ان کے حوصلے بڑھاتے ہیں، اور اچھی زندگی بسر کرنے میں ان کے معین ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ خدا خود ایسا کرتا رہتا ہے۔ اس رول کو ادا کرنے کی توفیق جن بندگانِ محترم کو نصیب ہوتی ہے وہ

انسانیت کے محسن قرار پاتے ہیں۔ انہی محسنوں کے ساتھ جریدۂ عالم پر ذاکر صاحب کا دوام بھی ثبت ہو چکا ہے۔ ہر مسلمان اور اچھے انسان کا ایمان ہے کہ خدا کسی کے حسن عمل کو ضائع نہیں ہونے دیتا اور وہ خوش اور راضی ہوتا ہے تو اسی کے عطایا کا حدوحساب نہیں رہتا۔ کچھ اور جانتا ہوں یا نہیں۔ اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ذاکر صاحب سے راضی اور خوش رہا!

(سہ ماہی اُردو ادب، جولائی 1969)

●●●

نواب صدر یار جنگ

محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم

(1866-1950)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی 1866 میں بھیکم پور ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد تقی خاں تھا۔ دینی تعلیم گھر پر مختلف علمائے دین سے حاصل کی۔ وہ سرسید کے زمانہ سے ہی کالج کے ٹرسٹی تھے۔ یونیورسٹی کے قائم ہونے کے بعد وہ کورٹ کے ممبر اور ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر چُنے گئے۔ شعبۂ دینیات کے تاحیات ڈین رہے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے 1918 سے 1920 تک جوائنٹ سکریٹری اور بعد میں سکریٹری ہوئے۔ 1918 سے 1930 تک وہ حیدرآباد کے صدر الصدور رہے۔ یونیورسٹی آف حیدرآباد کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

علامہ شبلی اور ندوہ سے خصوصی تعلق تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں 1943 میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی۔ میرس روڈ پر واقع حبیب منزل کوٹھی شروانی مرحوم کے اعلیٰ تعمیری ذوق کا بہترین نمونہ ہے۔ آپ کا ذاتی کتب خانہ جو نادر کتابوں اور مخطوطات پر مشتمل ہے اب مولانا آزاد لائبریری کا حصہ ہے۔

شروانی صاحب کثیر التصانیف مصنف تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے آپ کے خصوصی تعلقات تھے۔ ''غبار خاطر'' کے خطوط کے مخاطب آپ ہی ہیں۔ 1950 میں 84 سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا۔ مرتب

o

1925 کے جاڑے میں مدرستہ العلوم (مسلم یونیورسٹی) کی پچاس سالہ جوبلی بڑی دھوم سے منائی گئی تھی۔ اتنی شان دار تقریب اور ایسا شائستہ اور فخر ومسرّت سے لبریز اجتماع یونیورسٹی کی سرزمین پر پھر دیکھنے میں نہ آیا۔

مسلمانوں کے ہر طبقے کے لوگ جن کا علی گڑھ سے دور یا قریب کا کچھ بھی رشتہ تھا اس طرح شریک ہوئے تھے جیسے خاندان میں شادی کی کوئی تقریب ہو اور سب رسم بجالانے کے لیے نہیں خوشی منانے کے لیے اکٹھا ہوئے ہوں۔ طرح طرح کی خوشی، طرح طرح سے منانے کے لیے، اجتماعی طور پر بھی، اپنے طور پر بھی، بچے نوجوان بوڑھے یگانے بیگانے بھی آئے تھے۔ آج سوچتا ہوں تو کس حسرت سے اس کا احساس ہوتا ہے کہ کیسے کیسے لوگ اپنے تھے، کس طرح ایک دوسرے سے مل کر ہی نہیں ان کو دور سے دیکھ کر خوش ہوتے تھے مجمع ہی میں نہیں تنہائی میں بھی ہوتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے سب ساتھ ہیں۔

اس جوبلی کے محرک اور بانی صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم[1]، مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے کس حوصلے، اعتماد اور عقیدت کے ساتھ اس کی تیاری میں دن رات مصروف رہتے تھے۔ ہر کس و ناکس کو دعوت دیتے کہ جوبلی میں شرکت کرو، اس کے لیے کچھ کرو، یہ یہ باتیں کرنی ہیں، کچھ سوچ کر بتاؤ کہ کس طرح اس کی رونق بڑھائیں اور اس کے مقاصد کو پورا

1 صاحب زادہ آفتاب احمد خاں تاریخ پیدائش: 28/مئی 1867 کنج پورہ (ضلع کرنال) تاریخ وفات: 18/جون 1930 علی گڑھ

کریں۔اسی دوران میں ایک دن فالج کا حملہ ہوااور ایسے گرے کہ پھر نہ اُٹھے، جوبلی میں شرکت نصیب نہ ہوئی!

صاحب زادہ صاحب کو اُردو سے اُلفت تھی اور اُس زمانے میں جب اس سے اُلفت رکھنا معمولی آدمی کے ظرف کی بات نہ تھی۔ مجھ پر کرم کرتے تھے۔ بلا کر فرمایا:

''اردو کا جلسہ دھوم سے کرو۔ خرچ کی پرواہ نہ کرنا۔ اس جوبلی کے منانے میں اُردو کی اہمیت کا اعتراف و اعلان بھی مقصود ہے۔''

میں نے بھی دوستوں اور طلبا کی مدد سے بڑا اہتمام کیا۔ اس زمانے میں اُردو کے جو مسلّمہ طور پر بڑے اور بزرگ سمجھے جاتے تھے ان سے صدارت کی درخواست کی جو قبول کی گئی۔ خوشی میں ایسا محسوس ہوا جیسے اُردو کا یہ جلسہ جوبلی کے سارے جلسوں سے بازی لے جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ صبح آئی جب اُردو کی یہ تقریب منعقد ہوئی۔ خوش خوش جناب صدر کی خدمت میں پہنچا۔

میں نے عرض کیا۔

''کب سواری حاضر کروں؟ سارا انتظام ٹھیک ہے۔ لوگوں میں جلسہ کا بڑا چرچا ہے۔''

دفعتاً موصوف بپھر گئے۔ بولے:

''بھاگ جاؤ۔ صدارت نہیں کرتا۔ آپ اُردو کانفرنس کرنے چلے ہیں۔''

سنّاٹے میں آ گیا، اب کیا کروں کچھ دیر بیٹھا رہا لیکن خشم ناکی بڑھتے دیکھی تو وہاں سے واقعی بھاگا۔ دوستوں اور ساتھی کام کرنے والوں کو اطلاع کی، سب گھبرا گئے۔ اُردو کے کتنے اور اکابر تشریف لائے تھے جلدی جلدی سب کی خدمت میں پہنچا، عرض حال کیا۔ کسی نے اعتنا نہیں کیا، اب معلوم ہوا کہ ایک بزرگ کی سازش کا شکار ہوا۔

کانفرنس کی ناکامیابی اور اپنی نامرادی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ کچھ ہی دن ہوئے اُردو کا لکچرر مقرر ہوا تھا وہ بھی ادنیٰ درجے کے گریڈ پر، شرطیں ایسی کڑی رکھی گئی تھیں جو آج تک پھر کسی پر عائد نہیں کی گئیں۔ اکابر یوں ہی کیا کم مخالف تھے۔ آج کے حادثے سے تو میری نالائقی اور نااہلی پر تصدیق کی مہر لگ جائے گی۔ لوگ کیا کہیں گے، ہم چشموں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ ایسے حادثے پر تو کبھی کبھی مخلصوں کا بھی حسن ظن ڈانواڈول ہو جاتا ہے!

معاً ایک خیال آیا۔ مولانا سلیمان اشرف صاحب مرحوم کی خدمت میں آدم جی پیر بھائی منزل (ممتاز ہاؤس کے سامنے کی دومنزلہ عمارت) پہنچا۔ حسب توقع نواب صدر یار جنگ تشریف فرما تھے۔ پریشان دیکھ کر بڑی دلجوئی سے پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

عرضِ حال کیا اور دبی زبان سے جلسے کی صدارت کی درخواست کی۔ سنتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے، بولے:

فکر کی کیا بات ہے؟ بسم اللہ، چلئے۔

مولانا سے فرمایا:

''چائے کا دوسرا دور ملتوی، انشاءاللہ واپسی پر دیکھا جائے گا۔''

مولانا نے فرمایا:

''ہاں ہاں جلد جاؤ، میں بھی چلتا لیکن جانتے ہو کیا بات مانع ہے۔ اچھا وہاں سے یہیں آنا اور روئداد سنا جانا۔''

بات یہ تھی کہ مولانا اور صاحب زادہ صاحب کے تعلقات دوستانہ نہیں رہ گئے تھے یہاں تک کہ مولانا نے عہد کر لیا تھا کہ صاحب زادہ صاحب کے بلائے ہوئے نہ کسی جلسے میں جائیں گے نہ اُن کا سامنا گوارا کریں گے اس پر تادمِ آخر قائم رہے!

نواب صاحب نے اپنی گاڑی پر مجھے ساتھ لیا اور سیدھے پنڈال تشریف لائے۔ حسب قاعدہ تجویز و تائید کے بعد کرسیِ صدارت پر رونق افروز ہوئے۔ ایک گھنٹے سے اُوپر اُردو کے تہذیبی عوامل پر ادبی محاسن پر مثالیں دے دے کر اس عالمانہ تبحر اور بزرگانہ وقار کے ساتھ صدارتی تقریر فرمائی کہ ساری محفل میں جیسے امید اور اُمنگ کی لہر دوڑ گئی ہو۔ اس کے بعد بقیہ پروگرام پورا کیا گیا۔ نواب صاحب کی اس بروقت دست گیری اور کانفرنس کی غیر متوقع، غیر معمولی کامیابی کی خبر بزرگوں ہی کے دوسرے حلقے میں پہنچی تو موصوف کے بارے میں ایسے کلمات کہے گئے جن کا اعادہ نہیں کیا جا سکتا۔ عملی زندگی کے اوّلین دور میں ''بزرگوں'' ہی کی یہ دو قسمیں دیکھیں جو آج تک نہیں بھولیں!

اُس دن سے اب تک نواب صاحب کی شرافت، دلیری اور بڑائی کا جیسا نقش میرے دل پر ہے اور جس نوازش اور شفقت کا مورد رہا ہوں اس کو بیان کرنے بیٹھوں تو گزٹ کے محدود صفحات ختم ہو جائیں گے اور بہت کچھ کہنے کو باقی رہ جائے گا۔ اس وقت تو صرف کتاب خانہ حبیب گنج کے بارے میں کچھ باتیں عرض کرنی ہیں جسے ان کے لائق فرزند الحاج خان بہادر عبیدالرحمٰن خاں صاحب شیروانی آنریری ٹریژرر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے حال ہی میں مسلم یونیورسٹی کو مرحمت فرمایا ہے۔

اس کتب خانے کے بیش بہا ہونے کا ذکر علما کی زبان سے سنتا اور ان کی تصانیف کے حوالوں میں پڑھتا رہا ہوں۔ شمالی ہند کے تین سب سے ممتاز مشرقی کتب خانوں رام پور، پٹنہ اور حبیب گنج سے کون واقف نہیں ہے۔ حبیب گنج کے کتب خانے کا بڑا امتیاز یہ ہے کہ یہ صرف ایک شخص کے شوق و سعی کا نتیجہ ہے، اس میں کوئی کتاب مشکوک ذرائع سے حاصل نہیں کی گئی جس سے خریدی یا حاصل کی گئی اس کو منہ مانگے دام دیئے گئے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مالک کتاب کی لاعلمی یا تنگ حالی سے فائدہ اُٹھا کر قیمتی نسخے معمولی دام دے کر لے لیے گئے ہوں۔ یہ باتیں نواب صاحب کی اولوالعزمی، فیاضی اور علم کے احترام کی دلیل ہیں۔

سوچنے اور فخر کرنے کی بات ہے کہ ایک شخص باوجود امارت امیری اور شباب کی ترغیبوں کے جن سے لذت یاب ہونے کی اس کو ہر طرح کی سہولت اور آزادی نصیب تھی مسلسل ساٹھ ستر سال تک اچھی کتابیں جمع کرتا رہا تاکہ وہ ضائع نہ ہو جائیں یا دوسروں کے قبضے میں نہ چلی جائیں اور اس طرح علم و فضل کے نام وروں کی میراث سے ان کے نام لیوا محروم نہ ہو جائیں۔ خان بہادر عبیدالرحمٰن خاں صاحب شیروانی نہ صرف ہمارے بلکہ بعد کی آنے والی نسلوں کے بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ انمول خزانہ مسلم یونیورسٹی کے سپرد کر دیا جس سے زیادہ موزوں مستحق اور محفوظ کوئی دوسرا ادارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس گراں بہا کتب خانے کو وجود میں لانے والے کی جتنی بڑائی کی جائے کم ہے لیکن اس کی بڑائی بھی کم نہیں ہے جو اس کو ایک قیمتی امانت سمجھ کر اس کے حق داروں کو پہنچا دے۔ یہ کتب خانہ نوجوان طلبا اور طالبات کو عربی، فارسی، اُردو کے ایسے بیش بہا جواہر پاروں سے آشنا و آراستہ کرے گا جن سے ان کے پیش رو تو بالکل

نا آشنا تھے یا بہت کم تھے۔ کاش وہ لوگ بھی ایسا ہی کرتے جن کے پاس اس طرح کی بیش بہا کتابیں قلمی نسخے یا دوسری تاریخی دستاویزیں موجود ہیں!

علم کی تحقیق، تحفظ اور اشاعت مسلمانوں کے قومی شعائر میں رہی ہے۔ مسلمان جس حالت اور حیثیت میں دنیا کے جس خطّے میں گئے علم کے چرچے، رفاہِ عام کے پروگرام اور زندگی کے بہتر و برتر معیار لے کر گئے۔ علم اور شعروادب کے لوازم، شعرا، حکما اور فضلا کی صحبتوں، کشادہ طویل سیدھی شاہراہوں، کارواں سراؤں، دل کشا باغات، کوئیں، نہریں اور آبشار کے بغیر وہ کہیں رہ نہیں سکتے تھے اسی روایت کا طفیل ہے کہ مسلمانوں کا معمولی سے معمولی گھرانا بھی ایسا نہ ہوگا جہاں کلام پاک، حدیث اور وظائف، حمد ونعت، علاج معالجہ، شعروقصص کی دس کتابیں اور بیاضیں نہ مل جائیں یا مہمان اور طالب علم کے لیے خاطر مدارات کی گنجائش نہ نکالی جاسکے۔

ہندوستان میں بے شمار افراد یا خاندان ایسے ہیں جن کے پاس علمی نوادر ہوں گے۔ ممکن ہے وہ ان کی اہمیت سے نا آشنا ہوں یا ان کی قدر و قیمت جانتے ہوئے کسی نہ کسی سبب سے اُن کو علاحدہ کرنا ضروری نہ سمجھتے ہوں یقیناً یہ ان کی بڑی بھول ہے۔ ایسا کرنے سے یہ سرمایہ تلف ہوجائے گا اور ان کے مالک وقابض قابلِ مواخذہ ہوں گے۔ یہ نوادر اتنی ان کی ملکیت نہیں ہیں جتنی قوم، ملک اور علمی اداروں کی!

اگر ہم اتنا بھی کرسکیں تو غنیمت ہوگا کہ اس کی کھوج لگائیں کہ ایسے نوادر کہاں، کتنے کس حالت میں کن لوگوں کے پاس موجود ہیں۔ اس کا ریکارڈ رکھیں اور وقتاً فوقتاً کوشش کرتے رہیں۔ مناسب اور معقول معاوضہ دے کر یونیورسٹی کے لیے حاصل کریں یا ان کی حفاظت کی تدابیر اختیار کریں۔ نایاب کتب اور قلمی نسخوں کے اور بھی ذخیرے یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں۔ اس کے آثار بھی پیدا ہو چلے ہیں کہ لوگ اس طرح کے نسخے کبھی معاوضہ لے کر کبھی ہدیتہً لائبریری کو نذر کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ زمانہ دور نہیں، جب عربی، فارسی اور اُردو کے نوادر کا سب سے بڑا ذخیرہ ہماری لائبریری میں موجود ہوگا!

سب سے ضروری امر اس وقت یہ دیکھنا ہے کہ یہ ذخیرہ ان لوگوں کے لیے کس طرح مفید بنایا جاسکتا ہے جو اس سے استفادہ کرنا چاہیں گے۔ اس سرمائے کو جوں کا توں پڑا رہنے دینا

یا ایسے لوگوں کی نگرانی میں رکھنا جو اپنی ذمہ داری کا احساس نہ رکھتے ہوں یا لائبریری کی نگرانی و نگہ داشت کے فن یا تقاضوں سے واقف نہ ہوں یا ان نادر مخطوطات، مطبوعات اور دستاویزوں میں بصیرت تامہ نہ رکھتے ہوں یا ان پر کام کرنے والوں کو ہر طرح کی سہولت فراہم کرنے کے لیے وقت بے وقت اپنے اوپر تکلیف گوارہ کرنے کے اہل نہ ہوں اس وقت تک یہ سارا ذخیرہ محض پرانے بوسیدہ کاغذات کا انبار ہے اور ان سے کسی کو فائدہ نہ پہنچے گا۔

عربی، فارسی، اُردو مخطوطات سے استفادہ کرنے والوں کے مسائل لائبریری کی عام مطبوعات سے فائدہ اُٹھانے والوں کے مسائل سے جداگانہ ہوتے ہیں۔ مقصد اور مزاج دونوں اعتبار سے مطبوعات کے سیکشن کا کام ایک طور پر بندھا ٹکا ہوتا ہے۔ مخطوطات کے سیکشن کے کام کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ایک کے جمہان زیادہ تر پڑھنے والے ہوتے ہیں، دوسرے کے صرف تحقیق کرنے والے۔ اس سیکشن کا سربراہ کار ایسا شخص رکھا جائے جو نہ صرف ہمارے یہاں کے نسخوں پر عبور رکھتا ہو بلکہ ان سے متعلق اُن دستاویزوں کا بھی علم رکھتا ہو جو علی گڑھ سے باہر ہوں اور ان صفات سے متصف ہو جن کا ذکر اوپر کی سطروں میں کیا جا چکا ہے۔ مخطوطات کے سیکشن کا مخصوص اسٹاف انتظامی امور میں لائبریری کے عام ضوابط کا پابند اور لائبریرین کا ماتحت ہو لیکن اندرونی معاملات میں ایک مستقل حیثیت رکھتا ہو!

آخر میں اتنا اور عرض کروں گا کہ انگریزی اور مغربی علوم وفنون کی مطبوعات کی تعداد اور سوع کے اعتبار سے ہماری یونیورسٹی کا پلّہ ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں ہمیشہ تھوڑا بہت ہی نیچا اُونچا ہوتا رہے گا لیکن عربی، فارسی، اُردو کتب اور مخطوطات کی حیثیت سے اس کی نظیر کچھ ہی دنوں بعد ہندوستان میں کہیں نہ ملے گی۔ اس لیے اس سیکشن کی تنظیم کے لیے ایسی باتیں کہنا پڑیں جو بظاہر دور از کار معلوم ہوتی ہیں۔ ان پر عمل نہ کیا جا سکا تو کیا تعجب کہ مجھے بھی ایسی ہی معلوم ہونے لگیں!

●●●

یہ خاکہ 'کچھ کتب خانہ حبیب گنج کے بارے میں' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ مرتّبین

(مطبوعہ پندرہ روزہ مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ، جلد نمبر 10، شمارہ نمبر 11، 24 مئی 1961)

کچھ حسرت کے بارے میں

(1880-1951)

فضل الحسن حسرت موہانی 1880 میں پیدا ہوئے۔ مڈل کا امتحان 1894 میں اور انٹرنس 1898 میں امتیاز کے ساتھ پاس کر کے ایم۔اے۔او کالج کے انٹرمیڈیٹ کلاس میں 1899 میں داخل ہوئے۔ 1903 میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔

1903 میں ایک ادبی رسالہ اردوئے معلیٰ نکالا۔اس رسالہ میں ایک مضمون شائع ہوا جو انگریزی حکومت کے خلاف تصوّر کیا گیا۔ 1908 میں حسرت کو دو سال کی قید بامشقت اور جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔ رہائی کے بعد حسرت نے یہ رسالہ دوبارہ جاری کیا۔حسرت علی گڑھ میں محلّہ رسل گنج میں رہتے تھے،ان کی شادی نشاط النساء بیگم کے ساتھ 1903 میں ہو چکی تھی۔

حسرت پر حکومت کے خلاف باغیانہ تحریر و تقریر کے جرم میں مقدمات چلے اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔جیل کی زندگی کی صعوبتوں کا بیان اُن کی آپ بیتی مشاہدات زنداں، میں درج ہے جس کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

حسرت موہانی ایک جنگ آزادی کے صف اوّل کے رہنما، سیاست داں، محقق، شاعر، محبِ وطن اور کھرے انسان تھے۔علی گڑھ کو ان پر ہمیشہ فخر رہے گا۔ 1951 میں حسرت کا انتقال ہوا۔

تصانیف میں مشاہداتِ زنداں، کلیات حسرت، تذکرہ شعرا کے علاوہ کئی اور بھی ہیں! مرتّب o

حیات، شعلہ مزاج و غیور و شورانگیز
سرشت اس کی ہے، مشکل کشی جفا طلبی
(اقبالؔ)

حسرتؔ نے شاعری اختیار کی۔ حسرتؔ ہی تھے، اُن کا کوئی کیا کرسکتا تھا لیکن کوئی شاعری سے پوچھے کہ نیک بخت تجھے کیا پڑی تھی کہ تو نے حسرتؔ کو اختیار کیا۔ حسرتؔ اور غزل بڑی مشکل سے سمجھ میں آنے کی بات ہے۔ حسرتؔ کی کون سی بات غزل سے مناسبت رکھتی تھی!

ایک دفعہ میں نے پوچھا۔ ''کیوں حسرتؔ صاحب آپ کے شعر پڑھ پڑھ کر جو چاہے کسی کے معشوق پر قبضہ کرسکتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مولوی بھی ایسا کرسکتا ہے جو آپ کے اُن اشعار کو بھی پڑھنے سے باز نہ آئے گا جو اولیائے عظام کی شان میں آپ نے لکھے ہیں اور جن میں کہیں کہیں ردیف قافیے مصرعوں میں ناپ سے کچھ ہی کم لیکن تول میں یقیناً زیادہ ہیں اور وہ اس لیے کہ معشوق نہ ملا تو اولیائے کرام ہی مل جائیں گے لیکن یہ تو بتائیے ان اشعار سے آپ خود کسی معشوق پر قبضہ پاسکے یا نہیں اور پا سکے تو کتنے دنوں قبضہ ''فاسقانہ'' رہا اس کے بعد ''عارفانہ'' رہ گیا!''

حسرتؔ صاحب بچوں کی طرح کھل کھلا کر ہنس پڑے اور کہنے لگے۔ ''بھئی آپ نے لطیفہ خوب کہا، خوب، بہت خوب!''

حسرتؔ کی غزلوں میں خواہ مخواہ کے گھپلے نہیں ملتے۔ وہ سسکتے بلکتے نہیں۔ نہ مرثیہ خوانی نہ حُدی خوانی، نہ چھیچھے نہ چخ چخ، نہ پینترے دکھاتے ہیں نہ پُراسرار بننے کی کوشش کرتے ہیں، نہ

خود عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں نہ ہم کو ہونے دیتے ہیں۔ جذبات وتخیل کی بھی کچھ ایسی زیادہ کارفرمائی نہیں ہے شعر کہنے کے لیے نہ خود افیون، شراب یا بھنگ استعمال کرتے ہیں نہ ان کے اشعار ان چیزوں کے استعمال پر اصرار کرتے ہیں۔

حسرتؔ کو زبان پر بڑا عبور ہے، غزل میں زبان کو بڑا دخل ہوتا بھی ہے۔ اس لیے کہ اُردو خود ایک بھرپور غزل ہے۔ غزل اور اُردو ایک دوسرے میں کچھ اس طرح ''من تو شدم تو من شدی'' ہو گئے ہیں کہ ہم غزل سنتے ہیں تو ہمارا ذہن بیک وقت موضوع، اُسلوب، لہجہ، اظہار و ابلاغ ہی کی طرف متوجہ نہیں رہتا بلکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ زبان، ذوق اور ظرف کے بھی تقاضے پورے ہوئے یا نہیں! اتنے سارے تقاضے اکثر بڑی مشکل سے پورے ہوتے ہیں۔ یہ باتیں جاگیردارانہ نظام کی لعنت ہوں یا برکت مجھے اس سے بحث نہیں، میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ یہ باتیں اور اس طرح کی باتیں ریاضت اور رکھ رکھاؤ سے آئیں یا فتنہ وفساد سے، بڑی باتیں اور بڑی شخصیتیں جتنی انسانی عظمت پر گواہ ہوتی ہیں اتنی کسی نظام کی لعنت یا برکت نہیں ہوتیں!

حسرتؔ کے زبان پر عبور رکھنے اور کسی دوسرے کے زبان پر عبور رکھنے میں فرق ہے۔ عام طور پر ہم زبان کا ماہر اس کو قرار دینے کے عادی ہیں جو روزمرہ، محاورہ، ضرب الامثال یا رعایات لفظی وغیرہ کو اُچھالتا بناتا اور کھپاتا رہتا ہے۔ زبان میں مہارت کا یہ تصوّر مولویانہ یا مدرسانہ ہے۔ زبان میں مہارت اسے کہتے ہیں کہ زبان کو بے تکلف استعمال کرے، لیکن زبان کی صحت اور حسن میں فرق نہ آنے پائے اور سننے والے کو یہ محسوس نہ ہو کہ شاعر یا ادیب نے زبان کے کرتب یا اپنے کرتوت دکھائے ہیں۔

حسرتؔ زبان کی نمائش کہیں نہیں کرتے۔ وہ اپنے خیالات اور جذبات کو جن الفاظ اور فقروں میں ظاہر کرتے ہیں انھیں کو ذرا ادھر اُدھر کر کے شعر کی صورت دے دیتے ہیں۔ آپ حسرتؔ کی عبارت کا مطالعہ کر کے بتا سکتے ہیں کہ جن خیالات و جذبات کے وہ حامل ہیں وہ کس شکل وشان سے کب اور کیوں کر نازل ہوئے۔ اکثر شعرا اور ادیب خیالات و جذبات کے اظہار کے لیے اپنے نزدیک بہترین الفاظ و عبارت تلاش کرتے ہیں اور اس کے مانجھنے اور سنوارنے میں بڑی محنت کرتے ہیں۔ یہ کوئی عیب یا کمزوری نہیں ہے۔ لیکن ظاہر ہے، اُس شاعر یا ادیب کا

زیادہ قائل ہونا پڑے گا جو تقریباً اُسی زبان وعبارت میں اپنے خیالات وجذبات کا اظہار وابلاغ خوبی سے کر سکے جس میں وہ وقوع میں آئے ہوں۔ یہاں یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ حقیقی شاعر کے ہاں ہر جذبہ اور ہر خیال اپنی زبان اپنے ساتھ لاتا ہے۔ حسرتؔ کے ہاں اکثر الفاظ اور ترکیبیں غریب سی معلوم ہوں گی۔ لیکن بات بھرپور اور دل نشیں ملے گی اور کچھ ایسا محسوس ہوگا جیسے وہ بات اسی انداز سے انھیں الفاظ میں کہی جاسکتی تھیں یا دل نشیں ہوسکتی تھی!

حسرتؔ جن اکابر شعرا سے جس شد و مد سے اظہار عقیدت کرتے ہیں، مثلاً میرؔ، قائمؔ، مومنؔ، مصحفیؔ، نسیمؔ لکھنوی یا نسیمؔ دہلوی یا مولانا شمس الدین تبریزؔ، نظیریؔ، فغانیؔ، سعدیؔ و جامیؔ اتنا ان اساتذہ کا اثر ان کے کلام پر نظر نہیں آتا۔ اس میں بھی شبہ ہے کہ انھوں نے براہ راست ان سے استفادہ کیا ہو۔ وہ ان کا نام رسماً اور تبرکاً لیتے ہیں اور خود اپنے کلام کی داد دینا چاہتے ہیں تو بجائے کچھ اور کہنے کے ان مشاہیر کا نام لے لیتے ہیں۔

شاعری میں حسرتؔ دہلی کے بہ نسبت لکھنؤ سے زیادہ قریب ہیں۔ لکھنؤ کی روایات شاعری سے ان کو خاصی دلچسپی ہے۔ لکھنؤ کے دبستانِ شاعری میں اتنا عشق نہیں جتنی عیاشی ہے۔ حسن سے اتنا لگاؤ نہیں جتنا حسینہ سے۔ اس عیاشی میں بھی لمس ولذّت کا اتنا دخل نہیں ہے جتنا خرافات کا۔ لکھنوی شعرا رقیب کا بہت کم تذکرہ کرتے ہیں۔ رقیب سے مجھے کوئی عشق نہیں لیکن اس پر تعجب ضرور ہوا ہے کہ لکھنؤ کے شعرا کا محبوب کا تصوّر رقیب کے تصوّر سے اتنا بے نیاز یا رشک کے عنصر سے اتنا پاک کیوں ہے۔ حسرتؔ کے ہاں بھی رقیب کا عمل دخل تقریباً صفر ہے۔

اگر دنیا کے انقلابات کی کبھی ''اندرونِ خانہ'' تاریخ لکھی جا سکی تو عشقِ مجازی کے کرتوت اور کارناموں کے عجیب وغریب کرشمے ملیں گے۔ حسرتؔ کا عشق تمام تر مجازی ہے۔ انھوں نے اولیا اور اتقیا کی شان میں جو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ وہ بھی اسی عشق مجازی کا ردّعمل ہو تو کچھ تعجب نہیں، ایسا ہوتا ہے۔ میں اپنے اس گمان کو حسرتؔ کے حضور میں گستاخی نہیں سمجھتا۔ میں حسرتؔ کے عقیدہ کی پختگی، خیال کی رعنائی، طبیعت کی سادگی اور جذبات کی صحت مندی کا دل سے معترف ہوں ان کی زندگی اور ان کی شاعری کے عوامل ایک دوسرے سے کہیں برسرِ پیکار نہیں ہوتے۔ ان کی شاعری، ان کا عشق، ان کی سیاست، ان کا ائمہ دین سے شغف،

ان کی زندگی کے طور طریقے سب علاحدہ علاحدہ خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہر ایک کا مصرف، ہر ایک کے اوقات اور ہر ایک کا محور اور عالم جدا ہے۔

حسرتؔ نے اپنی عاشقی کے بارے میں جو اعتراف کیا ہے وہ بڑا معنی خیز ہے یعنی:

مجازی عشق بھی اِک شے ہے، لیکن

ہم اس نعمت کے منکر ہیں، نہ عادی

کسی نعمت کا نہ منکر ہونا نہ عادی بالخصوص عشقِ مجازی جیسی نعمت کا جسے حسرتؔ نے وہ زیبائی اور صحت مندی بخشی جو اُن سے پہلے ان سے یقیناً بڑے شعرا کے بھی حصے میں نہ آئی تھی عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا شاید بے محل نہ ہو کہ شاعری میں حسرتؔ کا کوئی محور نہیں۔

کوئی انسان ایسا نہیں جو فطری جذبات سے خالی ہو۔ لیکن جب تک یہ جذبات زندگی کی کسی اعلیٰ قدر کے حصول یا حفاظت یا خدمت میں صَرف نہ کیے جائیں نہ ان جذبات کو کوئی خاص وقعت دی جا سکتی ہے اور نہ ان جذبات کے حامل کو۔ یہی سبب ہے کہ عشقِ مجازی اپنی ساری لذّتوں کے باوجود اور عشقِ مجازی کا شاعر اپنی تمام رنگینی اور دل کشی کے باوجود اچھا شاعر تو ہوتا ہے بڑا شاعر نہیں ہوتا، گویا میں بالکل ضروری نہیں سمجھتا کہ ہر شاعر بڑا شاعر بننے یا کہلانے کے لیے خطبۂ صدارت ہی تصنیف کرتا رہے۔ اچھا شاعر ہونا بھی بہت بڑی بات ہے۔ مزے کی بات کہنا، بڑی بات کہنے سے کبھی کبھی دشوار تر ہوتا ہے۔

بہ ایں ہمہ یہ کہنے میں شاید ہی کسی کو تامّل ہو کہ حسرتؔ کا غزل پر بڑا احسان ہے اور میرے نزدیک جس کا غزل پر احسان ہے اس کا پوری اُردو شاعری اور اُردو زبان پر احسان ہے۔ حسرتؔ نے غزل کی آبرو اس زمانہ میں رکھ لی جب غزل بہت بدنام اور ہر طرف سے نرغہ میں تھی انھوں نے اُردو میں غزل کی اہمیت اور عظمت ایک نامعلوم مدّت تک منوالی۔

حسرتؔ خالص غزل گو تھے۔ ان سے پہلے بڑے جید غزل گو گزرے تھے۔ معاصر غزل گو بھی اپنا اپنا مقام رکھتے تھے پھر بھی حسرتؔ کی غزل گوئی ممتاز و منفرد ہے۔ اس لیے کہ حسرتؔ غزل کا سہارا غزل ہی سے لیتے ہیں کسی اور سے نہیں، غزل گوئی کوئی کرے، غزل کا معیار حسرتؔ ہی رہیں گے۔

حسرتؔ، جرأتؔ اور داغؔ کے قبیلہ سے ہیں لیکن حسرتؔ کی سطح، حسرتؔ کا سلیقہ، حسرتؔ کی شائستگی یا بحیثیت مجموعی حسرتؔ کا ذوق ان دونوں سے زیادہ پاکیزہ اور گوارا ہے۔ حسرتؔ کا محبوب جرأتؔ اور داغؔ کے محبوب سے زیادہ شائستہ اور شُستہ ہے۔ مجازی عشق میں محبوب کی شائستگی شاعر اور عاشق دونوں کے لیے بہت بڑی نعمت ہے ورنہ دونوں ایک دوسرے کے لیے باعث ننگ بن جاتے ہیں اور بالآخر ایک دوسرے کو لے ڈوبتے ہیں۔

حسرتؔ کے ہاں نہ الفاظ اور فقروں کی تام جھام ہے نہ جذبات کی نفخ، وہ اس بارے میں بڑے کفایت شعار، سادگی پسند اور ''براہِ راست'' ہیں۔ اُردو میں شاعری بڑی کثرت سے، بڑی دھوم دھام سے اور بڑی دیر تک ہوتی رہی ہے۔ اب بھی چور بازاری کے بعد اسی کی گرم بازاری ہے۔ اس لیے اُردو لکھنے والوں میں مبالغہ نگاری عام ہے۔ یہاں تک کہ ہم شریفوں میں بیٹھ کر اس طرح Superlatives ''افضل التفضیل'' میں گفتگو کرتے ہیں جیسے کوئی مولوی مذہبی رسالے یا اخبار کی ایڈیٹری کر رہا ہو! حسرتؔ کو خوب صورتی، بے تکلفی اور بھولے پن سے پتہ کی بات مزے سے کہہ جانے کا جو ملکہ ہے وہ دوسرے شعرا کے حصہ میں بہت کم آیا ہے۔

حسرتؔ جہاں تہاں خاصے بے جھجک بھی ہو جاتے ہیں لیکن وہ شُستہ اور شائستہ اتنے ہیں کہ بڑی آسانی اور کامیابی سے ایک طرف داغؔ و جرأتؔ سے اور دوسری طرف آج کل کے نئے انداز کے لکھنے والوں سے علاحدہ اور اُونچے ہو جاتے ہیں۔ حسرتؔ وہ آخری حد متعین کر دیتے ہیں، جہاں تک ہم جنسی جذبات کے اظہار میں جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد جنسی جذبات کا اظہار نہیں رہ جاتا، ارتکاب شروع ہو جاتا ہے! ہمارے نوجوان شعرا شاعری کرتے وقت اظہار، اعلان، ابلاغ اور ارتکاب میں تمیز کرنے کی بہت کم زحمت اُٹھاتے ہیں۔ شاعری کرتے وقت اُردو شاعری میں جہاں تہاں شُہد پن کا عمل دخل اسی زحمت سے بچنے کا نتیجہ ہے۔

حسرتؔ کے یہاں خدا کا تصوّر بہت کم ملتا ہے۔ تقریباً نہیں کے برابر، وہ اصحاب القبور کی خوش نودی پر جتنی توجہ دیتے ہیں اتنا یوم القیامہ کی آزمائش سے عہدہ برآ ہونے کا عزم نہیں دکھاتے۔ یہ باتیں شاعری میں تلاش کرنا یا ان کو شاعری کا معیار قرار دینا کچھ ضروری نہیں بالخصوص کسی غزل گو کے ہاں، لیکن یہ باتیں اتنی رسمی یا مذہبی نہیں ہوتیں جتنی اُن سے ماورا کچھ اور

بڑی شاعری میں انسان کی برتری و بغاوت کا احساس و اہتزاز پایا جانا ضروری ہے۔ایسا احساس و اہتزاز جو ''اصلح و اعظم'' قدروں کا اثبات کرے نہ کہ نفی۔

اب جب کہ بعض غیر متعلق باتیں چھڑ ہی گئیں ان کے بعض ''متوسّلین و متعلّقین'' کے بارے میں بھی کچھ کہہ ڈالنے میں مضائقہ نہیں، میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ بڑی شاعری میں انسان کی برتری و بغاوت کا احساس و اہتزاز پایا جانا ضروری ہے (ہر برتری میں بغاوت مضمر ہوتی ہے) لیکن عام طور پر اس نقطۂ نظر کی خانہ پُری ہمارے بعض نام ور شعرا اور ان کے عقیدت منداس طرح کرتے ہیں کہ وہ انسان نہیں بلکہ شاعر کے احساسِ برتری اور کم تری کو سب کچھ یا بہت کچھ سمجھ کر وجد کرتے ہیں یا ہماری آپ کی آبرو کے درپے ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان شعرا کے ہاں برتری کا اتنا احساس نہیں ہوتا جتنا برتری کی خواہش کے اظہار و اعلان کا ہوگا۔[1]

اُردو شاعری میں احساسِ برتری کا خصوصیت کے ساتھ اظہار سب سے پہلے غالبؔ نے کیا جس پر اقبالؔ نے ایسا قصر تعمیر کر دیا جس کے کنگرے عرش کی بلندیوں میں اُوجھل ہیں، دوسری مثال یگانہؔ چنگیزی اور بعض دوسرے شعرا کی ہے جن کی تلاش آسان ہے۔

یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہے کہ غزل میں سیاسی رنگ کا اضافہ حسرتؔ نے سب سے پہلے کیا لیکن حسرتؔ کے کلام میں جہاں تہاں جو سیاسی باتیں ملتی ہیں اُن کی حیثیت جتنی سیاسی خبروں کی ہے اتنی سیاسی شعور کی نہیں۔تصوّف کا ہماری شاعری میں طرح طرح سے دخل رہا ہے، لیکن جس طرح حسرتؔ کے ہاں عشق کا تصوّر اتنا مجرّد نہیں ہے جتنا مشخّص یا مجازی اسی طرح ان کے ہاں تصوّف سے اتنا لگاؤ نہیں ملتا جتنا صوفیا سے بلکہ یہ کہنا بھی غیر محل نہ ہوگا کہ حسرتؔ جتنے پیر پرست واقع ہوئے ہیں اتنے تصوّف پرست نہیں۔ اولیا اور اتقیا کے حضور میں نذرِ عقیدت پیش کرتے وقت حسرتؔ شاعری، بالخصوص غزل کے تقاضوں کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں۔

---

1. یہ لفظ بہ ظاہر غیر ثقہ معلوم ہوگا لیکن جہاں پر یہ آیا ہے وہاں اس سے زیادہ موزوں لفظ لانا میرے بس کی بات نہ تھی۔

غزل میں ثواب کمانے کا مشغلہ میں کچھ بہت اچھا نہیں سمجھتا۔ شاعری کرنی ہے تو شاعری کا حق ادا کرنا پڑے گا۔ چاہے ثواب کا مقصد پورا ہو یا نہ ہو۔ حسرتؔ نے نعت اور منقبت بھی لکھی ہے لیکن ان کی شاعری میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ نعت لکھنا معمولی بات نہیں ہے، مولود خوانوں اور قوالوں کے لیے نعت لکھ دینا تو آسان ہے، لیکن حضور آیۂ رحمت میں لب کشائی آسان نہیں۔ شرف وسعادت کی یہ متاع گراں مایہ حالیؔ اور اقبالؔ کے حصہ میں آئی اور ہمارے ہی کیا دوسرے شعروادب میں بھی حالیؔ اور اقبالؔ روز روز نہیں پیدا ہوتے۔

حسرتؔ شخص کے اعتبار سے خاصے انتہا پسند واقع ہوئے تھے لیکن ان کی شاعری میں جو توازن تازگی اور ترنم ملتا ہے وہ دوسرے شعرا کے ہاں نہیں ملتا، خواہ وہ حسرتؔ سے زیادہ انتہا پسند ہوں خواہ بہت کم یا بالکل نہیں، کم شعرا ایسے ہوں گے جن کو اپنے جذبات یا تخیل پر اتنی قدرت ہو جتنی حسرتؔ کو۔ حسرتؔ شاید ہی کبھی افضل التفصیل کا صیغہ استعمال کرتے ہوں۔ ان کی شاعری میں نہ جھٹکے ہیں، نہ کچوکے، نہ دھماکے، نہ کہنگی، نہ کمینہ پن، ہم نے عاشقی کی ہو یا نہ کی ہو ہم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس کوچہ سے گزرے ہیں اور اسی طرح سے گزرے ہیں جس طرح حسرتؔ۔ حسرتؔ کا عشق گھریلو ہے بازاری نہیں، انسانی ہے خانقاہی نہیں، مجازی ہے ماورائی نہیں۔ حسرتؔ اپنی شاعری میں صرف اپنی خوبیوں کا اظہار کرتے ہیں۔ نفسیاتی الجھنوں یا خامیوں میں شاعری کا ملمع نہیں چڑھاتے۔ حسرتؔ کی جو بات مجھے بہت زیادہ تعجب انگیز اور اتنی ہی قابل تعریف نظر آئی وہ یہ کہ مذہب اور سیاست میں اس درجہ کٹر ہونے کے باوجود شاعری میں حسرتؔ کس درجہ شیریں نوا اور شریف النفس اور زندگی میں کیسے درویش صفت اور تیغ اصیل تھے!

....

یہ باتیں تو ہوئیں حسرتؔ کی شعروشاعری سے متعلق لیکن حسرتؔ کی جو حیثیت میرے لیے حیرت انگیز ہے اور جس سے میں متاثر ہوں وہ ان کی عجیب وغریب شخصیت ہے! ان کی شکل وصورت وضع قطع، رہن سہن، طور طریقے بات چیت ان کی مشکل کشی، جفا طلبی! اور ان سب پر فوق ان کی غزل سرائی!

کون جانے اور کون کہہ سکتا ہے کہ انھوں نے جب سے ہوش سنبھالا اور جب تک اس جہان سے اُٹھ نہ گئے وہ زندگی کے جہنم میں رہے یا جنت میں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ انھوں نے شاید اسی دنیا کے جہنم میں اپنے لیے کوئی جنت تعمیر کر لی تھی اور کبھی یہ گمان ہوتا ہے کہ انھوں نے اسی دنیا کی جنت میں کوئی جہنم بنا لیا تھا جس میں وہ سوتے جاگتے تھے، کھاتے پیتے تھے، لڑتے جھگڑتے تھے، خلوص برتتے تھے، شاعری کرتے تھے، خود خوش ہوتے تھے اور ہم کو آپ کو سب کو خوش رکھتے تھے۔ پھر سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ کہیں ایسا نہیں کہ حسرتؔ کی نہ کوئی جنت تھی نہ جہنم وہ اپنی درویشی میں ہر جنت و جہنم سے بے نیاز مست اور مگن تھے نہ اپنے سے باہر کسی بات کی خوشی یا غم مناتے تھے نہ اپنے اندر رنج و راحت کے لیے کوئی جگہ رکھتے تھے!

شادی اور غم کی ان کے ہاں شاید کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ ان کو فطرت کے ان مظاہر سے زیادہ وقعت نہ دیتے تھے جو حلقۂ شام و سحر میں اسیر تھے۔ آئے اور چلے گئے۔ آتے رہیں گے اور جاتے رہیں گے نہ ان کو معلوم نہ ہم کو کہ وہ کیا ہیں، کیوں ہیں، کیوں کر کہاں کے اور کب تک رہیں گے؟ جس طرح حلقۂ شام و سحر میں ہم اسیر ہیں حلقۂ حسرتؔ میں شاید رنج و راحت نفع و ضرر اور خیر و شر اسیر تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ حسرتؔ کی دنیا و عقبیٰ حسرتؔ خود تھے اور کون اپنی دنیا و عقبیٰ خود نہیں ہے!

ان کی گول چھدری داڑھی ان کی باریک آواز، ان کی چھوٹی تال کی عینک، بغیر پھندنے کی پرانی ترکی ٹوپی، گھسی پسی چپل، موزہ سے کوئی سروکار نہیں، موٹے کھدر کی پیوند لگی کاواک سی شیروانی جس کے اکثر بٹن ٹوٹے یا غائب، ہاتھ میں بدرنگ سا جوٹ کا ایک جھولا، دری تکیہ اور موٹی ملگجی چادر کا مختصر بستر، ٹیڑھا میڑھا پرانا چھوٹا سا ایک ٹرنک، یہ تھے حسرتؔ!

لیکن کس قیامت کا یہ آدمی تھا محشرِ خیال نہیں محشرِ عمل! جس بات کو اپنے نزدیک حق سمجھتا تھا اس کو بغیر کسی تامل کے بغیر گھٹائے بڑھائے بغیر ہم وار کیے بغیر مصلحت یا موقع کا انتظار کیے، بے ضغطۂ زبان، بغیر پلک جھپکائے، مخاطب فلاطون ہو یا فرعون اس کے سامنے کہہ ڈالنا حسرتؔ کے لیے معمولی بات تھی۔ ایسا نڈر، سچا، محبت کرنے والا اور محبت کا گیت گانے والا اب کہاں سے آئے گا! کسی سے نہ دبنے والا، ہر شخص پر شفقت کرنے والا، زبان کا نبّاض، شاعروں

تھے آج تک علی گڑھ کی خدمت میں برابر مصروف و منہمک رہے اور اس وقت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر[1] کی حیثیت سے ہمارے لیے ''ترکش مارا خدنگ آفریں'' کی حیثیت رکھتے ہیں!

اُردو پی ایچ۔ڈی کا زبانی امتحان لینے حسرؔت علی گڑھ تشریف لائے تھے۔اُسی سج دھج سے جس کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔سفر خرچ کا بل فارم دستخط کے لیے پیش کیا گیا تو بولے۔''یہ فرسٹ کلاس کا کرایہ کیسا؟ میں تو تھرڈ کلاس میں سفر کیا کرتا ہوں اور دراصل میں دہلی جارہا ہوں پروگرام ایسا تھا کہ یہاں اُتر پڑوں اور امتحان لے کر آگے بڑھ جاؤں پھر یہ کرایہ کیسا اور ٹھہرنے کا الاؤنس کیوں؟ طعام و قیام تو آپ کے یاں رہا۔'' بڑی دیر تک بڑے مزے کی ردوقدح ہوتی رہی اور علی گڑھ سے اپنی اُلفت کا اظہار کرتے رہے۔حسرؔت بڑے زندہ دل اور خوش گفتار تھے میں نے کہا۔''مولانا یہ روپیہ تو آپ میری خاطر سے لے ہی لیں،اور میرے ہی اوپر اپنے ہاتھ سے صرف کردیں۔'' بولے۔''ہاں یہ ہوسکتا ہے، بتایئے کیسے؟'' میں نے کہا۔''میرے لیے ایک ویسا ہی یونی فارم بنوادیجیے جیسا کہ آپ پہنے رہتے ہیں۔'' بے اختیار ہنس پڑے پھر بولے۔''یہ یونی فارم کیا کیجیے گا۔''میں نے کہا۔''دشمنوں کا خیال ہے کہ آپ اپنے بعد اپنا خلیفہ مجھی کو نامزد کریں گے۔اس وقت یہ سجادہ میرے کام آئے گا۔''بولے۔''خرقہ یا سجادہ۔''میں نے کہا۔''نہ خرقہ نہ سجادہ،ان کا کاروبار تو سبھی کرتے ہیں۔آپ کے یونی فارم میں تو آپ کا خلیفہ خانقاہ بردوش نظر آئے گا!'' بہت محظوظ ہوئے رہ رہ کر ہنستے اور داد دیتے رہے۔

حسرؔت ہندستانی پارلیمنٹ کے ممبر تھے،لیکن ان کے اپنے انداز درویشانہ میں کوئی فرق نہ آیا نہ ممبروں کی آرام دہ کشادہ اور پُر فضا قیام گاہ،نہ ٹیلی فون،نہ موٹر،نہ تفریح،نہ دعوت، نہ دید و باز دید،نئی دہلی کے ایک غیر معروف شکستہ مسجد میں چٹائی پر قیام رہتا تھا فرش پر آس پاس اخبارات،کاغذات اور فائلیں!وقت آیا تو کسی دُوکان پر جاکر کھانا کھالیا۔کاغذات جھولے میں ڈالے اور پارلیمنٹ پہنچ گئے۔راستہ اکثر پیدل ہی طے کرتے اور موقع آن پڑتا تو پارلیمنٹ میں

---

1 ذاکر صاحب 1948 تا 1959 مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے ان کے دور میں یونیورسٹی میں ہمہ جہتی ترقی ہوئی۔

ایسی دوٹوک اور بے لاگ تقریر کرتے کہ در و بام گونج اُٹھتے۔

تنم می بہ لرزد چو یاد آورم

پاکستان اور ہندوستان کے بڑے بڑے عہدہ داروں کا دہلی میں ایک سرکاری اجتماع تھا بعض اہم اور نازک مسائل زیر بحث تھے شام کو عصرانہ تھا۔ اعیان و اکابر جمع تھے۔ حسرتؔ بھی مدعو تھے۔ ایسے مواقع پر ایسی پارٹیاں صرف چائے پینے پلانے کے لیے نہیں ہوتیں اور باتیں بھی مدّنظر ہوتی ہیں آرائش و زیبائش، جاہ و حشم، ساز و سامان، تکلف و تواضع، صاحبانِ ثروت، ماہرین سیاست، اکابر علم و حکمت اپنے اپنے وزن و وقار کے ساتھ اور خواتین معہ اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے موجود تھیں ''فضا آراستہ چمن پیراستہ'' اتنے میں ایک طرف سے حسرتؔ نمودار ہوئے اسی سج دھج سے جو صرف اُن کی تھی۔ اُسی وقارِ درویشی اور اندازِ قلندری سے جو اُن کا مسلک تھا اور اسی شعلہ سامانی و شبنم افشانی کے ساتھ جو اُن کی زندگی تھی۔ مجمع میں ایک لہر سی دوڑ گئی ہر شخص نے بڑے لطف واحترام سے حسرتؔ کی پذیرائی کی اور دیکھتے دیکھتے وہ سب کی توجہ اور تپاک کا مرکز بن گئے۔ شائستہ فقرے، لطف کی باتیں، عقیدت اور محبت کی پیش کش ایسا معلوم ہونے لگا جیسے یہ تقریب حسرتؔ کے خیر مقدم کے لیے منعقد ہوئی تھی۔ فرمائش شروع ہو گئی۔ حسرتؔ نے شعر سنانے شروع کر دیے۔ حسرتؔ زیادہ تر اپنا کلام تحت اللفظ سناتے تھے بالکل جیسے باتیں کرتے ہوں مگر معلوم نہیں کیوں کبھی کبھی ترنم بھی فرمانے لگتے اس پر مجھے ہمیشہ ہنسی آجاتی ان کا ترنم ایسا ہوتا جیسے کوئی معصوم بچہ ترنم کے ہر اصول سے بے گانہ محض ترنم کی نقل کر رہا ہو یا کوئی ملاّ ہو جسے ترنم سے کوئی واسطہ نہ ہو لیکن اس کے بغیر رہا بھی نہ جاتا ہو۔ ساتھ ہی ساتھ اس کوشش سے بھی باز نہ آتا ہو کہ نیکی یا بدی لکھنے والے فرشتے یہ طے نہ کر پائیں کہ ملاّ صاحب ترنم میں مبتلا ہیں یا تلاوت میں مصروف! مجھے معلوم نہیں حشر کے دن خود گناہ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں فریاد کرنے کی اجازت ملے گی یا نہیں ورنہ میرا خیال ہے کہ اُس دن سب سے زیادہ مجمع وہاں ہوگا جہاں بے چارہ گناہ کسی ملاّ کے خلاف اللہ تعالیٰ کے حضور میں فریاد کرتا ہوگا!

ہاں تو ذکر اس پارٹی کا تھا جہاں حسرتؔ اپنا کلام سنا رہے تھے سارے اکابر حسرتؔ کے گرد جمع ہو گئے اور محفل کا رنگ ہی بدل گیا تھوڑی دیر تک ذہن میں کچھ اور باتیں آتی رہیں اور

اپنا اپنا نقش چھوڑتی چلی گئیں سارا گردوپیش جو دولت، امارت اور نفاست کا ترجمان اور آئینہ دار تھا ایک ''شخص'' کی موجودگی سے کیا سے کیا ہو گیا اور اس مردِ درویش کے جلال اور اس کی شاعری کے جمال میں گردوپیش کا سارا اہتمام کس درجہ سطحی اور ضمنی معلوم ہونے لگا۔ کتنی ایسی باتیں ذہن میں آئیں جن کو باضابطہ و بامعنی تحریر کا جامہ پہنانا ناممکن معلوم ہونے لگا۔ ایک اقبالؔ کی مسجد قرطبہ کے نقوش تصور میں اُبھرنے لگے اور بے اختیار یاد آنے لگا۔

تجھ سے ہوا آشکار، بندۂ مومن کا راز — اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم — اس کا سرور، اس کا شوق اس کا نیاز، اس کا ناز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دل بے نیاز
اس کی اُمیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکار حق، مردِ خدا کا یقیں — اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں، گرمیِ محفل ہے وہ

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار — حاملِ 'خلقِ عظیم' صاحبِ صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب — سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں!
جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب — ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

(سال نامہ نگار، جنوری-فروری 1952، حسرت نمبر)

●●●

قاضی عزیز الدین احمد بلگرامی

(1890-1953)

قاضی عزیز الدین احمد بلگرامی قاضی عبدالوالی بلگرامی کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے، اور بچپن سے ہی نہایت ذہین تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ہردوئی سے انٹرنس پاس کرکے 1904 میں ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ پکی بارک (موجودہ) میں رہائش تھی۔ 1909 میں امتیاز کے ساتھ بی۔اے کیا۔ اس وقت کالج کا الحاق الہ آباد یونیورسٹی تھا۔ اگست 1910 میں ڈپٹی کلکٹر ہوکر سہارن پور میں تعینات ہوئے۔ 1911 میں سندیلہ کے چودھری خاندان میں شادی ہوئی۔ تیرہ سال کی ملازمت کرنے کے بعد رخصت لے کر علی گڑھ سے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری لی۔

1927 میں سول لائن علی گڑھ میں ایک شان دار کوٹھی تعمیر کی جو آج بھی موجود ہے اور ان کے ورثا اس میں قیام پذیر ہیں۔ یہ اللہ والی کوٹھی کہلاتی ہے۔ اس کوٹھی کا نام بیت الحبیب رکھا۔ خان بہادر حبیب اللہ خاں ان کے جگری دوست تھے، ان کے نام پر اس کوٹھی کا نام بیت الحبیب رکھا۔ قاضی صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد علی گڑھ آ گئے۔ 1948 سے وفات جولائی 1953 تک وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ٹریزرر رہے۔ تقسیم ہند کے پُرآشوب دور سے اس وقت یونیورسٹی سخت مرحلے سے گزر رہی تھی۔ قاضی صاحب نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے اسے مالی مشکلوں سے نکالا۔ قاضی صاحب نے 63 سال کی عمر میں وفات پائی۔ مرتب c

قاضی صاحب یکم اگست 1953 کو 3 بجے صبح بعارضۂ قلب نہایت مختصر علالت کے بعد جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ اِنّــاللّٰهِ و اِنّــا اِلَیــهِ راجِعُون ، خدا اُن سے محبت کرنے والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مرحوم 2/نومبر 1904ء کو ایم۔اے۔او کالج کے فرسٹ ایر میں داخل ہوئے۔ 1909ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ بی۔اے پاس کیا۔ایل۔ایل۔بی میں داخلہ لیا اور لیکچر پورے کر لیے۔سب سے پہلے سہارن پور میں ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے مامور ہوئے۔ قانون کا امتحان ملازمت کے دوران میں دس بارہ سال بعد دو ماہ کی رُخصت لے کر علی گڑھ میں قیام کر کے درجۂ اوّل میں پاس کیا۔اضلاع مظفر نگر اور بلند شہر میں بندوبست کے کام پر تعینات ہوئے اور مال کے کام میں اُن کی شہرت تمام صوبہ میں پھیل گئی۔متھرا، اٹاوہ، علی گڑھ (میں دوبارہ) ڈپٹی کلکٹر رہے اور کان پور میں عرصہ تک اسسٹنٹ ڈائرکٹر آف انڈسٹریز کے فرائض انجام دیے۔وہاں سے فرلو لے کر اپنی والدہ محترمہ کو حج کرانے لے گئے۔

ریاست بھرت پور میں دو سال تک جوڈیشل ممبر رہے۔اُسی زمانے میں حکومت صوبۂ متحدہ نے اُن کو امپریل لیجسلیٹو اسمبلی کے لیے نام زد کر کے بھیجا۔صوبۂ متحدہ میں پہلے پہل کانگریس حکومت قائم ہوئی تو اس نے قاضی صاحب کو ہیڈ کوارٹر لکھنؤ میں بہ کارِ خاص متعین کیا اور قانونِ لگان کی ترمیم کا مسودہ انھیں سے مرتب کرایا۔قاضی صاحب نے قانونِ مال گزاری کے صیغہ داخل خارج پر ایک کتاب اور دوسری قانونِ لگان پر بڑی مفصل و مشرح لکھی۔ یہ

تصانیف اس درجہ مستند مانی گئیں کہ قاضی صاحب قانونِ مال کے مسلّم الثبوت ماہر تسلیم کر لیے گئے اور Tenancy پر اُن کی کتاب حرفِ آخر سمجھی گئی۔

لکھنؤ کے دوران قیام میں قاضی صاحب مستقل کلکٹر اور مجسٹریٹ ضلع ہوئے وہیں کارِ خاص پر تعینات رہے۔ اسپیشل ڈیوٹی کے ختم ہونے کے بعد میرٹھ اور الہ آباد کی کمشنریوں میں ایڈیشنل کمشنر رہے۔ 1939 میں پنشن کے بعد اُن کو ایسٹرن ایجنسی میں پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ سے ایک بڑی اَسامی دی گئی لیکن گورنمنٹ آف انڈیا نے اُن کو صوبۂ اجمیر میں اسپیشل ڈیوٹی پر بھیجا جہاں مدّت دراز سے استمرارداروں کا معاملہ چل رہا تھا اور کئی بار بعض کار آزمودہ سویلین ممبروں کی تعیناتی کے باوجود معاملہ روبراہ نہ ہوا۔ قاضی صاحب نے نہایت قابلیت و محنت سے اس کام کو انجام دیا جس کے بعد اجمیر کا نیا قانون لیجسلیٹو اسمبلی سے پاس ہوا۔ اس قانون کے مسودہ کی تیاری کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا نے اُن کو دہلی میں اسپیشل ڈیوٹی پر رکھا۔ قانون کے مکمل ہو جانے کے بعد گورنمنٹ قاضی صاحب کو مزید پانچ سال تک رکھنا چاہتی تھی لیکن اسی دوران میں مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ٹریژری کا عہدہ پیش ہوا۔

اُس زمانہ میں یونیورسٹی بڑے نازک اور حوصلہ فرسا دور سے گزر رہی تھی اور ایک ایسے ٹریژرر کی ضرورت تھی جس کی قابلیت اور دیانت، امانت مسلّم ہو۔ قاضی صاحب بالاتفاق مسلم یونیورسٹی کے ٹریژرر مقرر ہوئے۔ اب مرحوم نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اپنے عہدہ کا کام سنبھالا اور گورنمنٹ کی پیش کش کو شکریہ کے ساتھ نامنظور کر دیا۔ حکومت ہند کے توسل سے حکومت پاکستان نے بھی مرحوم کی خدمات کو گراں قدر مشاہرہ پر مستعار لینا چاہا لیکن مرحوم نے یونیورسٹی کے نفع کی خاطر ہر دوسرے نفع کو قربان کر دیا اور پاکستان کی پیش کش کو بھی نظر انداز کر دیا۔ اب تک شاید ہی کسی اور کے بارہ میں وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس یونیورسٹی کے نفع اور نیک نامی کی خاطر باہتمام استغنا اور بے جگری کے ساتھ اپنے نفع کو چھوڑا ہو۔

مسلم یونیورسٹی سے پانچ سو روپے ماہوار کا آنریریم (صلۂ اعزازی) دیا جانا منظور ہوا تھا لیکن قاضی صاحب نے یہ کہہ کر اُسے ٹال دیا کہ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ بغیر مشاہرہ کے اُن کی گزر

بسر ہوسکتی تھی یا نہیں یہی نہیں بلکہ وقف کرنال سے اُن کو تین سو روپے ماہانہ کی جو رقم ملتی تھی اُس کو بھی یونیورسٹی کے نادار و ہونہار طلبا کی مدد کے لیے وائس چانسلرز فنڈ میں دے دیا، مدتوں اس طرح بسر کی۔ یہاں تک کہ جب مالی حالت زیادہ گرگئی تو ڈائننگ ہال سے کھانے خرید کر اہلِ و عیال کی کفالت کی!

مرحوم سچے ساتھی اور پکے مسلمان تھے، نماز روزہ کے بڑے پابند اور سال کے بیش تر ایام میں روزے رکھتے تھے۔ کوئی سال بھر ہوا مسلمان بچوں کے لیے ریڈروں کا ایک سلسلہ مرتب کیا جس میں بڑی چھان بین کے بعد نہایت آسان زبان اور سلیس و شگفتہ طرزِ بیاں میں مذہب کی تمام ضروری اور بنیادی باتیں درج کردی ہیں، اور یہ کام وہ اپنے عہدہ کے فرائض سے بالکل علاحدہ اوقات میں رات کے 2 / بجے سے نمازِ فجر تک کرتے تھے۔ ان کی صحت اچھی نہ تھی اور ڈاکٹر مسلسل تاکید کرتے رہتے کہ اگر انھوں نے احتیاط نہ برتی اور آرام نہ کیا تو عواقب کا سامنا ہوگا۔ لیکن وہ اس تنبیہ کو مطلق خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اور ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ موت کا جو وقت اللہ نے مقرر کر دیا ہے وہ ایک پل ادھر اُدھر نہیں ہوسکتا اس لیے فکرمند ہونا عبث ہے۔ کہتے تھے آدمی کے فرائض میں کام کرتے رہنا ہے مرنا جینا اُس کے فرائض میں نہیں ہے۔ قاضی صاحب پر امراض کے حملے ہوتے رہتے تھے طبیعت کبھی اچھی نہ رہتی تھی، لیکن شاید ہی کوئی آدمی ایسا ہو جو یہ کہہ سکے قاضی صاحب نے اپنی تکالیف کا کبھی ذکر کیا ہو۔ کبھی کبھی صاحبِ فراموش بھی ہوتے، کوئی دیکھنے جاتا تو ہمیشہ بڑے شگفتہ لہجہ میں کہتے کہ وہ بالکل چنگے تھے صرف ڈاکٹروں نے مقید کر رکھا تھا!

یہ بات بغیر خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ یونیورسٹی میں ان جیسا کام میں جان کھپانے والا اپنی صحت و عافیت کو خاطر میں نہ لانے والا پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل سے دوچار ہونے والا اور طرح طرح کی نزاکتوں کو سنبھالنے والا یونیورسٹی میں اگر کوئی اور تھا تو وہ ذاکر صاحب تھے۔ اس سلسلہ میں مرحوم نے اپنے اُوپر کتنا ظلم اور زیادتی کی، کیسی کیسی ناملائم باتیں سُنیں اور ناروا سلوک سہے اُن کا خیال آتا ہے تو دل بھر آتا ہے۔ نازیبا کلمات سنتے تو خاموش ہوجاتے۔ کہا کرتے ایسے مواقع پر خاموش ہوجانا دفاع بھی ہے اور دلیل بھی!

ضابطہ کے بڑے پابند تھے۔ لیکن لکیر کے فقیر ہرگز نہ تھے۔ وہ ہمیشہ لوگوں کو اُن کی مشکلات کا حل بتاتے تھے اور ان کو بے ضابطگی کے الزام سے بچانا چاہتے تھے۔ انھوں نے کسی کی مشکلات میں کبھی اضافہ نہیں کیا بلکہ مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی تدابیر بتاتے تھے جس پر لوگ زحمت سے بچنے کے لیے عمل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ امانت کے مال میں بے ضابطگی کو راہ دینا بے ایمانی اور بزدلی تھی، جو ایسا کرتا ہے وہ مسلمان نہیں۔ مرحوم کی طرف سے کتنے لوگ غلط فہمی میں مبتلا رہے لیکن ان کو برتنے کے بعد رفتہ رفتہ اُن کے مخالف بھی اُن کی خوبیوں کے معترف ہونے لگے تھے۔ اس لیے کہ وہ اُن کو رُسوا ہونے سے بچانے کی فکر کرتے تھے اور اس کوشش میں اس کی بھی پروا نہ کرتے تھے کہ وہ خود رُسوا ہو جائیں گے جن پر گزری ہے وہ جانتے ہیں کہ موقع آیا ہے تو ان کے سارے گناہ قاضی صاحب نے اوڑھ لیے! قاضی صاحب نے یونیورسٹی املاک کی کتنی ڈوبی ہوئی اسامیوں کو پھر سے ترایا اور بڑی زیرکی و جاں فشانی سے یونیورسٹی کی عمارات اور ساز و سامان کی برقراری و بازیابی کا علاحدہ ایک فنڈ قائم کیا۔

قاضی صاحب بڑی خوبیوں کے مالک تھے لیکن وہ ان خوبیوں کو کس کس طرح سے چھپاتے تھے وہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے وہ باتیں اس طرح کرتے تھے اور لوگوں سے پیش اس طرح آتے تھے کہ پہلی نظر میں یہ دھوکا ہوتا تھا کہ وہ بڑے کھرّے اور اِکل کھرے ہیں اُن کے اندازِ گفتگو میں ایک طرح کی ملی جلی طنز و ظرافت تھی۔ ان کو دیکھ کر وکٹر ہیوگو کا مردم بیزار ارسس مین یاد آجاتا تھا، جو لافنگ مین (Laughing Man) کا ہیرو ہے۔ وہ اپنی دردمندی اور شفقت کا اظہار بھی خشک بے تعلق اور بے بہری کے انداز میں کرتے تھے۔ کھلانے پلانے کے بڑے شائق تھے۔ عمدہ سے عمدہ کھانے پینے کی چیزیں وافر مقدار میں بڑے نفیس خوان میں نہایت سپید ستھرے دسترخوان پر طرح طرح سے اپنی خوشی اور محبت کا اظہار کر کے کھلاتے تھے اور اس طرح کی گفتگو کرتے تھے جیسے انھوں نے کوئی تکلف نہیں کیا تھا اور جیسے یہ کھانے مہمانوں کے ہاں ہر روز کھائے جاتے تھے، کھانے سے متعلق دسترخوان پر نہ خود گفتگو کرتے نہ دوسرے کو کرنے دیتے ایسا موقع آتا تو بڑی خوب صورتی سے ٹال جاتے اور کوئی دوسری بات چھیڑ دیتے۔ اس بات کا بڑا التزام رکھتے تھے کہ مہمان یہ محسوس نہ کرنے پائے کہ وہ پرائی جگہ کھانا کھا رہا تھا۔ یہ

بات بڑے سلیقہ اور شرافت کی ہے جسے اکثر میزبان نظرانداز کر جاتے ہیں، اور میزبان اپنے مہمان کو اس طرح کھلاتے پلاتے ہیں جیسے وہ کوئی شریف آدمی نہ تھا بلکہ میزبان کے اکھاڑے کا پہلوان یا ان کے تکیہ کا فقیر یا ضلع کا کلکٹر تھا!

مسلمان بچوں کی مذہبی و اخلاقی تربیت کے لیے جو کتابیں مرحوم نے مرتب کی ہیں وہ ہر شخص کے پڑھنے کے لائق ہیں۔ شبانہ روز کے اندھا دھند مطالعہ اور مصروفیت کے بعد یہ رسالے تیار کیے گئے تھے۔ اس سلسلہ میں کوئی مستند مطالعہ سے نہ چھوٹی۔ کلام پاک اور احادیث شریف کا ہر جگہ حوالہ دیا ہے جہاں کہیں کوئی بات ذرا بھی مشتبہ پائی، ترک کردی۔ فرماتے تھے لوگ خوش عقیدگی یا ناسمجھی کے سبب سے بہت سی باتیں تولے پرکھے بغیر لکھ گئے ہیں، سہل سے سہل اور مختصر سے مختصر عبارت میں ساری باتیں بیان کردی ہیں۔ اکثر کہا کرتے کہ آج کل مذہب کی کس مپرسی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ نہ ٹھکانے کے مذہبی آدمی ملتے ہیں نہ مذہبی کتابیں!

قاضی صاحب مرحوم کو جن لوگوں نے قریب سے دیکھا تھا وہ کچھ ایسا محسوس کرتے تھے جیسے ان کے ظواہر کی تہوں کو ہٹا کر دیکھا جا سکے تو اندر سے وہ ملول و محزوں نکلیں گے۔ شاید اسی حزن و افسردگی کو چھپانے کی مرحوم طرح طرح سے جتن کرتے تھے۔ کبھی ہنسی مذاق کی باتوں سے کبھی روزہ نماز سے لیکن بیش تر کام میں انتہائی مصروفیت سے۔ احباب اس کی شکایت کرتے کہ کام کرتے رہنے سے صحت غارت ہو جائے گی تو اسے ٹال جاتے، کبھی کہتے۔ ''میرے لیے مصروفیت سے محرومی موت ہے'' کوئی بہت اصرار کرتا تو بڑے دردمند لہجہ میں کہتے۔ ''ذاکر صاحب کو نہیں دیکھتے۔ ان کی صحت سے میری صحت بہتر ہے لیکن ان کی محنت اور مصروفیت مجھ سے بدر جہا بڑھی ہوئی ہے۔ میری ذمہ داری تو ان تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے، اُن کی ذمہ داری تو کہیں بھی پہنچ کر ختم نہیں ہوتی۔ میرے فرائض میں تو صرف یونیورسٹی کے مالیات کی دیکھ بھال ہے، اُن کے فرائض میں ہماری پوری نسل کی عافیت اور آبرو کی نگہبانی ہے۔ جب وہ اپنی صحت، آبرو اور عافیت کی پروا نہیں کرتے تو میں کس منہ سے کروں!''

قاضی صاحب بے قابو ہو کر کبھی بات نہ کرتے کیسی ہی اندیشہ ناک یا دردانگیز صورت حال کیوں نہ ہو، ڈگمگاتے یا پگھلتے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ہمیشہ تدبیر سوچتے اور

بتاتے۔ یونیورسٹی کو خاصے تہلکوں کا سامنا رہا۔ بیماری کی وجہ سے ذاکر صاحب علی گڑھ سے دور تھے۔ ایسے مواقع پر صورت حال کو بگڑنے نہ دیا اور ہر چیز اور ہر بات کو کیل کانٹے سے درست رکھنا قاضی صاحب ہی کا کام تھا۔ وہ دن رات ایک کر دیتے اور اس طرح مستعد، منہمک اور متحرک رہتے جیسے لڑائی کے زمانہ میں سامان حرب وضرب کی تیاری میں بڑے سے بڑے کارخانے رہتے اور رکھے جاتے تھے۔

مرحوم کسی کی قابلیت، دل سوزی، جاں فشانی اور ذہانت کا اعتراف بڑی مشکل سے کرتے تھے۔ سوا ذاکر صاحب کے! کہتے تھے ''ذاکر صاحب کی ذہانت، ایثار، محنت اور دردمندی تو رہی اپنی جگہ پر اُن جیسا مردم شناس اور اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کی تہہ تک جلد سے جلد پہنچ جانے والا آدمی انھوں نے اپنی تمام عمر میں کسی اور کو نہ پایا کہ مسائل کا بہتر سے بہتر حل ذاکر صاحب کے ذہن میں جتنا جلد آتا تھا کسی اور کے نہیں آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر دشواری اپنا حل ان کو بتا دیتی تھی۔''

ذاکر صاحب کو قاضی صاحب پر بڑا بھروسا تھا۔ وہ ان کی ایمان داری، سوجھ بوجھ، جفاکشی اور نکتہ رسی کو اپنے اور یونیورسٹی کے لیے بڑی نعمت سمجھتے تھے۔ ان کے یوں دفعتاً اُٹھ جانے پر جو صدمہ ذاکر صاحب کو ہوا ہوگا اس کا اندازہ کم لوگ کر سکتے ہیں۔ قاضی صاحب رات کے گیارہ بجے تک میٹنگ میں شریک رہے، پورے قلب کا دورہ ہوا، بارہ بجے حالت ردّی ہوئی پھر سنبھل گئی۔ دوسرے دن سکون رہا، شب میں ڈھائی بجے دوسرا دورہ پڑا اور آدھ گھنٹہ میں جاں بحق ہو گئے۔

خدا رحمت کند بر عاشقانِ پاک طینت را!

(مرحوم کا ایک ماتم گسار)

تجویزِ تعزیت

یہ تجویز بھی رشید صاحب کی ڈرافٹ کی ہوئی ہے۔ ذیل میں وہ تعزیتی رزولیوشن درج کیا جاتا ہے۔ جو ممبران یونیورسٹی کی طرف سے یکم اگست 1953ء کی شام کو اس جلسہ میں کہا گیا

تھا جو بہ سلسلہ انتقال پُر ملال قاضی عزیز الدین احمد صاحب بلگرامی سابق ٹریژرر مسلم یونیورسٹی رام پور حامد ہال میں منعقد ہوا تھا اور جس کی ایک نقل بخدمت قاضی معراج الدین احمد صاحب بلگرامی ایم اے یکے فرزندِ قاضی صاحب مرحوم بذریعہ رجسٹرار صاحب مسلم یونیورسٹی روانہ کی گئی۔

اہالیانِ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جناب قاضی عزیز الدین احمد صاحب بلگرامی کی اچانک وفات پر اپنے دلی اندوہ قلق کا اظہار کرتے ہیں۔ مرحوم بلگرامی کے بڑے شریف اور علم دوست گھرانے کے فرد اور اس درس گاہ کے نام ور فرزندوں میں تھے۔

حکومت کے متعدد ذمہ دار مناصب کے فرائض قابلیت، نیک نامی اور تندہی سے انجام دینے کے بعد سبک دوش ہوئے تو اس درس گاہ کے خازن کا کام ایسے وقت میں سنبھالا جب یہ ادارہ نہ صرف بڑے ہی نازک اور حوصلہ فرسا دور سے گزر رہا تھا، بلکہ حکومت کی طرف سے مرحوم کو اطمینانی اقتدار اور منفعت کے دوسرے مناصب پیش کیے جارہے تھے۔ لیکن مرحوم نے اس درس گاہ کے ہر نفع کو دوسرے ہر نفع پر مقدم رکھا اور باوجود خرابیِ صحت کے اپنی خداداد ذہنی صلاحیتوں اور شخصی امانت و دیانت کو یونیورسٹی کی خدمت و خیر سگالی میں اس محبت اور شفقت سے بر سر کار لائے کہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

مرحوم کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو اس یونیورسٹی پر قربان کر دیا اور یہ وہ غیر معمولی امتیاز ہے جس پر اس درس گاہ کا ہر فرد مرحوم کو فخر و محبت سے تادیر یاد رکھے گا۔ مرحوم کے دفعتاً اس طرح اُٹھ جانے سے اس یونیورسٹی نیز احباب و اعزا کو جو ناقابلِ بیان نقصان پہنچا ہے وہ بُھلایا نہ جا سکے گا۔

بلگرامی صاحب مرحوم اچھے ساتھی کھرے انسان اور پکے مسلمان تھے وہ دوسروں کی دشواری کو اپنی دشواری بنا لیتے تھے اور اپنی دشواری میں کسی کو شریک نہ کرتے تھے۔ خدا ان کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان سے محبت کرنے والوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

[(مسلم یونیورسٹی گزٹ، علی گڑھ، جلد: 3، شمارہ: 4۔ 24 اگست 1953 (13/ذی الحجہ 1372ھ)]

●●●

جگر صاحب

(1890-1960)

سید علی سکندر جگر مراد آبادی 1890 میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید علی نظر تھا۔ داغؔ، امیر اللہ تسلیم اور رسا رام پوری سے تلمذ رہا۔ جگر چشمہ کا کاروبار کرتے تھے۔

جگر جب علی گڑھ آتے رشید صاحب کے گھر پر ہی ان کا قیام رہتا تھا۔ رشید صاحب جگر کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اصغر کا بھی رشید صاحب کے یہاں اکثر قیام رہتا تھا۔ رشید صاحب جگر اور اصغر دونوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔

جگر صاحب رشید صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔ رشید صاحب جگر کی غزل گوئی کے معترف تھے۔ جگر کے مجموعۂ کلام پر ان کا مقدمہ 'جگر میری نظر میں' جگر کی شاعرانہ خوبیوں کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔

جگر کا 1960 میں انتقال ہوا۔ جگر کے دو شعری مجموعے ''آتشِ گل'' و ''شعلۂ طور'' ہیں۔ مرتّب

o

بالکل یاد نہیں آتا جگر صاحب سے پہلے پہل کب، کہاں اور کیسے ملاقات ہوئی۔ ممکن ہے الہ آباد میں ہوئی ہو جہاں اصغر صاحب مرحوم[1] ہندوستانی اکیڈمی (یوپی) میں صیغۂ اُردو کے مشیر ادبی تھے۔ کسی کام سے الہ آباد جانا ہوتا تو میرا قیام اصغر صاحب کے ہاں ہوتا۔ یہ زمانہ اور اس کے بعد کا کافی زمانہ ایسا تھا جب جگر صاحب پر شراب کا بڑا تسلط تھا۔ رفتہ رفتہ مجھ سے اتنی راہ و رسم ہوگئی کہ جگر صاحب جب کبھی علی گڑھ تشریف لاتے تو میرے ہاں ٹھہرتے۔ یہاں تک کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بڑے عزیز اور محترم دوست بن گئے۔

الہ آباد میں اصغر صاحب کے سامنے جگر صاحب اس طرح خاموش، مؤدب اور آنکھیں نیچی کیے ہوئے بیٹھتے کہ ان سے گفتگو بھی کی جاتی تو صرف ہاں، نہیں، میں مشکل سے جواب دیتے اور پھر سر جھکا لیتے۔ اصغر صاحب مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کے ہاں پہنچ جاتا تو وہ ایسے خوش ہوتے جیسے اُن کا رُواں رُواں مسکرانے لگا ہو۔ ان کے اس طرح خوش ہونے سے مجھ پر آسودگی اور عفو کی ایسی کیفیت طاری ہوتی جیسے میں ان تمام لوگوں کا قصور معاف کرنے لگا جنھوں نے میرے ساتھ ظلم و زیادتی کی تھی۔

کبھی کبھی وہیں جگر صاحب مل جاتے۔ ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ خود نہ آئے ہوں، بلکہ کسی نے پہنچا دیا ہو اور اس کے منتظر ہوں کہ موقع ملے تو پھر اپنی مہم پر چلے جائیں۔ ان کے

---

1. اصغر گونڈوی (1884-1936)، یہ خاکہ جگر صاحب کی حیات میں لکھا گیا تھا۔

مواجہہ میں اصغر صاحب مجھ سے تفصیل سے گفتگو نہ کرتے۔ میں بھی کوئی ذکر نہ چھیڑتا۔ ہم دونوں بیٹھے ہوتے تو جگر صاحب اُٹھ کر چلے جاتے۔

اصغر صاحب، جگر صاحب کو زیادہ خاموش یا اُکتایا ہوا دیکھتے تو کبھی کبھی مسکرا کر یہ فقرہ ان کو سنا دیتے۔ ''چاہے جہاں پھرو، لوٹ کر یہیں آنا پڑے گا'' اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر ہنسنا بولنا شروع کر دیتے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا۔ ''اصغر صاحب کہاں آنا پڑے گا؟ بے چارے آتو جاتے ہیں۔'' ایک دفعہ الٰہ آباد پہنچا تو اصغر صاحب کے ہاں جگر صاحب پھر اسی حال میں ملے۔ کھانے کا وقت آیا تو میں اور اصغر صاحب کھانے کے کمرہ کی طرف چلے۔ جگر صاحب نے شرکت سے معذوری کا اظہار کیا۔ اصغر صاحب اس دن کچھ بدحظ سے معلوم ہوتے تھے۔ چلتے چلتے کھڑے ہو گئے اور جگر صاحب کو مخاطب کر کے بولے۔ ''یہ سب تمہارے شعر نہیں سنتے تمہارا گوشت کھاتے ہیں!'' اصغر صاحب کی آزردگی پر کسی قدر برہمی کا رنگ چھانے لگا تھا۔

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھانے کے کمرے میں داخل ہوا۔ اصغر صاحب کھانے کی طرف متوجہ ہوئے تو میں نے کہا۔ ''اصغر صاحب آپ تو لکھنوی شاعری کے تشبیہ استعاروں کے کبھی شیدائی نہ تھے یہ گوشت کا کیا قصہ ہے؟'' کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ کچھ خش مگیں لیکن زیادہ حزین لہجہ میں بولے۔ ''رشید صاحب آپ کو کیا معلوم یہاں ایسے بے رحم لوگ بھی ہیں جو اُن کو جہاں چاہتے ہیں پکڑ لیتے ہیں اور یہ جو اسپرٹ ہوتی ہے وہ پلا پلا کر ان سے شعر سنتے ہیں اور جب یہ اَدھ موئے ہو جاتے ہیں تو یکّے پر لاد پھاند کر یہاں پہنچا دیتے ہیں۔'' میں نے دیکھا کہ اصغر صاحب بے کیف ہو گئے ہیں اور کھانے سے بھی ہاتھ کھینچ لیا ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''اصغر صاحب آپ نماز تو پڑھتے ہیں؟'' بولے۔ ''ہاں'' میں نے کہا۔ ''.......صاحب تو آپ کو صاحبِ کشف و کرامات بھی بتاتے ہیں۔'' بولے۔ ''جی تو پھر؟'' میں نے عرض کیا۔ ''.......صاحب نے آپ کا ایک شعر سن کر آپ کو مستجاب الدعوات بھی قرار دیا تھا۔'' بولے۔ ''آپ بھی تو کچھ کہیے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ اللہ سے دعا کیوں نہیں مانگتے کہ جگر صاحب کا گوشت کھانے والے ویجیٹرین ہو جائیں۔'' اصغر صاحب ہنس پڑے اور ہم دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے! کھانا کھلانے پر جو ملازم مامور تھا اس سے پوچھتے جاتے تھے

یہ کھانا یا وہ کھانا جگر صاحب کے لیے رکھ دیا ہے یا نہیں۔ اس سے اطمینان نہ ہوتا تھا تو ڈونگے اور پلیٹ سے نکال کر علاحدہ پلیٹوں میں رکھتے جاتے اور کہتے۔ ''یہ سب جگر صاحب کے لیے ہے۔ بغیر کھانا کھلائے ان کو باہر نہ جانے دینا؟''

میرے گھر کا ہر چھوٹا بڑا جگر صاحب کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ یونیورسٹی اور شہر میں بھی جگر صاحب محبوب و مقبول تھے۔ اس زمانہ میں بھی شراب کا بڑا زور تھا۔ اکثر غافل اور بدمست شہر سے لائے جاتے۔ یونیورسٹی کے اندر کوئی نہ کوئی طالب علم مل جاتا جو اُن کو میرے ہاں لاتا۔ میں گھر پر نہ موجود ہوتا تو وہ کمرہ میں پہنچا کر دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتا۔

یہ طالب علم جگر صاحب کی نرسنگ اس طور پر کرتے جیسے کوئی اپنے باپ یا بھائی کی خدمت کر رہا ہو یا کوئی نرس سرسام میں مبتلا مریض کی نرسنگ کرتی ہو، اور یہ اس زمانہ کی بات ہے جب جگر صاحب اور یہ طالب علم دونوں اپنی اپنی جگہ پر ان بانکوں سے کم نہ تھے جن کے قصے تاریخوں اور داستانوں میں ہم پڑھتے آئے ہیں۔

میں آجاتا تو طالب علم چلے جاتے اور معلوم نہیں کیوں اور کیسے۔ جگر صاحب خاموش اور مؤدب ہو جاتے۔ لیکن ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا جیسے رہ رہ کر سمندر کی تہہ سے کوئی طاقت ور موج اُبل کر باہر آنے والی ہو لیکن سطح کے قریب پہنچ کر یک بہ یک زور ختم کر کے واپس چلی جاتی ہو۔

یہ باتیں میں اس لیے نہیں بیان کر رہا ہوں کہ اس میں میری بڑائی نکلتی ہے، میری یہ نیت ہوتی تو میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اس بھونڈے طریقہ سے اس کی نمائش کرتا۔ جگر صاحب سے مجھے یہی تو شکایت ہے کہ وہ میرے سامنے مؤدب کیوں ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایسے آدمی سے ملنے میں بڑی اُلجھن ہوتی ہے جو مجھے ہر وقت گارڈ آف آنر دیتا رہے اور اس سے بھی کچھ کم کوفت اس وقت نہیں ہوتی جب کوئی شخص میرے سامنے مجھ سے زیادہ مسخرا بننے کی کوشش کرتا ہے!

جگر صاحب اپنے حلقہ کے لوگوں میں بیٹھے ہوتے ہیں تو بہت خوش اور بے تکلف ہوتے ہیں۔ ایسے میں جگر صاحب کے پاس جانے سے پرہیز کرتا ہوں۔ لیکن اتفاق یا ضرورت

سے پہنچ جاؤں تو وہ اس طرح خاموش اور سنجیدہ ہو جائیں گے جیسے مکتب کے چھوٹے بچے ہنس بول یا اُودھم مچا رہے ہوں اور دفعتاً مولوی صاحب نمودار ہو جائیں!

جگر صاحب یقیناً مجھ سے بہتر انسان ہیں۔ وہ مجھ سے مساوات برتیں، میری عیادت کریں، مجھ سے خدمت لیں، مجھ سے جھگڑیں یا مذاق کریں یہ ساری باتیں سمجھ میں آتی ہیں، لیکن وہ مجھے حرمین شریفین قسم کا مولوی یا کسی اُردو اخبار کا آبرو باختہ ایڈیٹر یا برطانوی عہد کا تھانے دار سمجھیں، یہ میرے لیے ڈوب مرنے کی بات تو ہے ہی خود جگر صاحب کے لیے کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ اُن کے ہاں میرا جو رکھ رکھاؤ ہے، وہ غالباً اس تعلق سے ہے جو مجھے اصغر صاحب سے یا اصغر صاحب کو مجھ سے تھا۔ اس طرح کی باتوں کا جگر صاحب بڑا لحاظ کرتے ہیں۔ وضع داری شریفوں کی پرانی کمزوری ہے۔

ایک دفعہ خبر آئی کہ جگر صاحب شراب سے تائب ہو گئے۔ یقین نہ آیا کہ ایسا ہوا ہوگا۔ سمجھتا تھا کہ آج نہیں کل یہ خبر آئے گی کہ پھر سے شروع کر دی۔ بُری عادتیں اس آسانی سے نہیں چھوٹتیں جس آسانی سے اچھی عادتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ سوچتا یہ تھا کہ جب میں اپنی معمولی بُری عادتیں چھوڑ دینے پر قادر نہیں ہوں تو جگر صاحب شراب کیسے چھوڑ دیں گے جس میں وہ اس طرح ڈوبے ہوئے تھے جس طرح شاید جوشِ گریہ میں غالب کا دل ڈوبی ہوئی اسامی تھا!

جگر صاحب شراب سے کیوں اور کیسے تائب ہوئے اس کا مجھے علم نہیں۔ اس بارہ میں ان سے کبھی ذکر نہ آیا۔ اتنا البتہ جانتا ہوں کہ ان پر شراب کا کتنا ہی غلبہ کیوں نہ ہوتا، ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوتی جسے مبتذل کہہ سکیں۔ ان کی زبان سے نحیف کلمات نہیں نکلتے تھے۔ وہ کبھی لوٹتے پوٹتے دُند مچاتے نہیں پائے گئے۔ مجھے تو اکثر محسوس ہوا جیسے کیف و سرخوشی بخشنے کے بجائے شراب ان کو انتہائی درد و کرب میں مبتلا کر دیتی ہو۔ اُن پر تھوڑی شراب بھی بہت اثر کرتی تھی۔

ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ان کے اعصاب بڑے ذکی الحس ہیں اور تھوڑی سی تحریک بھی بہت ہو جاتی ہو۔ شاعری میں بھی اُن کا یہی حال ہے۔ جیسے خیال یا جذبہ برقی رو بن

کران کے جسم و جان کو جھنجھنا دیتا ہو۔ کچھ دنوں سے اُن کے کلام میں یہ بات بظاہر کم ہوگئی ہے لیکن غور کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ جو بات کہی گئی ہے، اس میں تاثرات کی شدت ہے، لیکن ان کو پیش کیا گیا ہے زیادہ مدھم آواز اور انداز میں۔

جگرؔ صاحب کی شاعری میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ اصلاً وہ دوری و مہجوری کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی رفتار اور سمت کا مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ فراق کے شاعر ہیں وصال کے نہیں۔ اُن کا محبوب سے رشتہ کا انداز Centrifugal (مرکز گریز) ہے۔ یہی سبب ہے کہ جگرؔ صاحب کی شاعری میں محبوب کی عفت میں کہیں کوئی خلل نظر نہیں آتا اور ان کا کلام اس آلودگی اور بے راہ روی سے پاک ہے جو ہماری شاعری اور سوسائٹی میں آج کل نظر آتی ہے۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ جو شاعری ذہن و فکر کے اعتبار سے محبوب سے قریب سے قریب اور جسم و جان کے اعتبار سے دور سے دور ہو، وہ اس شاعر سے بالعموم بہتر و برتر ہوگا جس کی پوزیشن اس کے بالکل برعکس ہو۔ جگرؔ کے نقاد کو یہ نکتہ مدّنظر رکھنا چاہیے۔

شراب چھوڑنے کے بعد جگرؔ صاحب طرح طرح کی مصیبتوں [1] میں مبتلا ہوگئے۔ یہ زمانہ ان پر بڑا سخت گزرا، صحت خراب ہوگئی طرح طرح کی ذمہ داریوں نے آگھیرا، مالی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی۔ جگرؔ صاحب نے جس پامردی سے ان مصیبتوں کو جھیلا وہ جگر صاحب کا رزمیہ ہے۔ کتنے اور کیسے کیسے ''روزِ ابر و شبِ ماہتاب'' آئے ہوں گے اور جگرؔ صاحب پر سے گزر گئے ہوں گے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

جگرؔ صاحب بڑے مذہبی آدمی ہیں۔ مذہبی لوگوں کے بارہ میں میرا تجربہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ میں نے اکثر ایسے لوگوں کو مذہب میں مبتلا پایا جن میں اخلاقی کمزوریاں ملتی تھیں۔ یہ لوگ خدا کو اس منطق سے قائل کرتے رہتے ہیں۔ ''میں جتنی شادیاں کرتا اور طلاق دیتا ہوں اتنی ہی زائد رکعتیں نماز کی بھی تو پڑھ لیتا ہوں۔'' وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح امریکہ ہر چیز کی قیمت ڈالر میں وصول کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کا کفارہ نفلوں میں قبول کرلیتا ہے۔

---

1 اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ میرا مطلب شراب کی فضیلت جتانا ہے۔ یہاں شراب کے چھوڑنے اور مصیبتوں کے آنے میں سبب اور مسبب کا رشتہ نہیں ہے۔ (رشید صدیقی)

مذہب بڑی سخت اور قابلِ قدر آزمائش ہے۔ بالخصوص مسمانوں کا مذہب جس طرح کے مذہبی لوگ میرے پیشِ نظر ہیں، وہ اس درجہ بے وقوف ہوتے ہیں کہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جب وہ اپنے اردگرد کے معمولی سوجھ بوجھ کے لوگوں کو دھوکہ نہیں دے سکتے تو وہ خدا کو کیوں کر دھوکہ دیں گے جس کی صفات کا ان کو علم ہے۔ یقین ہو یا نہ ہو، ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ خدا نے اپنے سارے اختیارات ان بندوں کو ہمیشہ کے لیے منتقل کردیے ہیں جن کا وہ حق مارتے رہتے ہیں۔ ایسے معاملات میں وہ خدا کے ہاں جتنی عرضیاں بھیجتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن سب کو پڑھے بغیر، عدالتِ مجاز کو واپس کردیتا ہے۔

ان میں بعض ایسے معصوم بھی ملیں گے جو اس کوشش میں رہتے ہیں کہ خدا کو نہ سہی اُن فرشتوں ہی کو دھوکہ دے کر کاربراری کرلیں جو اُن کا اعمال نامہ مرتب کرنے کے لیے کاندھوں پر بٹھا دیے گئے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ آخرت میں پٹواری کے اندرجات کی بنا پر مقدمہ جیت لیں گے۔

جگر صاحب ان معنوں میں مذہبی آدمی ہیں کہ وہ اللہ رسول اور انسان کے حقوق پہچانتے ہیں اور اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ جس کا جو حق ہو، اُسے پہنچ جائے وہ نفع کے ضرر اور ضرر کے نفع کو جانتے ہیں۔ اُن میں حیا ہے، وہ پرائی چیز کو اپنانے کے درپے نہیں ہوتے ان میں غیرت اور حمیت ہے۔ ظلم اور زیادتی اپنے پر ہو تو جھیل جائیں گے دوسرے پر ہو تو اس کی حمایت میں اپنے کو خطرہ میں ڈال دیں گے۔ اُن کے یہ جوہر تقسیم ملک کی ہلاکتوں میں کھلے! تفصیل میں طوالت ہے۔

جگر صاحب عالم فاضل نہیں ہیں۔ مذہب ہو، سیاست ہو، شعر و ادب ہو، ان پر ان کی گفتگو منطقیانہ یا فلسفیانہ نہ ہوگی۔ ان کا احساس جتنا سریع اور شدید ہے، اتنا ان کا مطالعہ وسیع نہیں ہے۔ وہ خود اپنی شاعری کے بارہ میں تفصیل سے گفتگو نہیں کرپاتے۔ وہ اپنی شاعری سے باہر نکل کر کسی اور کی شاعری پر غور کرنا نہیں چاہتے۔ شاید غور کر بھی نہیں سکتے۔ جس کے جذبات تند و تیز ہوں، وہ غور کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ جگر صاحب اقبالؔ کی شاعری کے کچھ ایسے قائل نہیں ہیں۔ فانیؔ بھی نہ تھے۔ دونوں کا یہ کہنا ہے کہ شاعری میں فکر و فلسفہ کیسا؟ حالاں کہ دونوں بالخصوص جگر صاحب جب جہت و جہاں سے بلند ہوتے ہیں، اقبالؔ کے قریب ہوجاتے ہیں۔

لیکن جگر صاحب شعر و شاعری کے بارہ میں جو کچھ کہتے ہیں وسعت اور وزن سے قطع نظر اس میں خلوص کی پاکیزگی اور یقین کی محکمی ملتی ہے۔

میں نے جگر صاحب کو تقریباً ہر حال اور ہر صحبت میں دیکھا ہے۔ خوب صورت نوجوان آزاد منش عورتوں میں، ماں بہن بیٹیوں میں، عمائد اور اکابر کی موجودگی میں، طلبا اساتذہ اور دوسرے سنجیدہ اور ثقہ حلقوں میں۔ گفتار و کردار کے اعتبار سے میں نے ان کو کہیں قابل گرفت نہ پایا۔ عورتوں کی موجودگی میں جگر صاحب عفیف و شفیق نظر آئیں گے۔ ان کی زبان سے کوئی ہلکی بات نہ نکلے گی اور نگاہ کبھی بے باک اور بے محابانہ ہوگی۔ عورتوں کی موجودگی سے قطع نظر بے تکلف دوستوں میں مَیں نے کبھی یہ نہ دیکھا کہ جگر صاحب نے بے خیالی میں یا تفریحاً کوئی ایسا جملہ کہا ہو جس میں عورتوں سے تفریح یا عورتوں کی تضحیک کا پہلو نکلتا ہو۔ کم سے کم میری جان پہچان کا کوئی اردو شاعر ایسا نہیں ہے سوا فانی مرحوم کے جو اس بارۂ خاص میں جگر صاحب کا مقابلہ کر سکے۔

رؤسا اور امرا کے سامنے جگر صاحب حتی الوسع اپنا اور ان کا دونوں کا رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھتے ہیں، لیکن اس طرح کی صحبتوں میں جگر صاحب کی طرف سے میں ہمیشہ متردّد رہا۔ اس لیے کہ معمولی آدمیوں کی بدتمیزی وہ بالعموم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن کسی بڑے آدمی سے ذرا بھی کوئی ناواجب حرکت سرزد ہو جائے تو جگر صاحب بغیر کچھ کہے یا کیے نہ رہیں گے چاہے اس کا انجام کچھ ہی ہو۔ بھوپال کے نواب زادہ رشید الظفر صاحب زمانۂ طالب علمی سے جگر صاحب کی بڑی عزّت کرتے ہیں۔ ایک زمانہ میں انھوں نے جگر صاحب کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا، اور کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں عائد کی تھی کہ وہ کیا کریں یا کہاں رہیں۔ اس زمانہ میں والیانِ ریاست میں سے اکثر یہ چاہتے تھے کہ جگر صاحب ان سے وابستہ ہو جائیں۔

ان میں سے ایک جو بہت بڑی ریاست کے چشم و چراغ تھے اس کے درپے ہوئے کہ جگر صاحب جس معاوضہ اور شرط پر چاہیں ان کے متوسلین میں شامل ہو جائیں۔ طرح طرح سے ڈورے ڈالے گئے۔ جگر صاحب کی مالی حالت خراب تھی۔ بھوپال کے وظیفہ سے بس بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ جگر صاحب اس آفر کو خوش اسلوبی سے ٹالتے رہے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ

رئیس نے جگر صاحب سے برملا اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ جگر صاحب نے بات ٹالنی چاہی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اصرار بڑھا اور اصرار میں کچھ رنگ امارت کا بھی جھلکا۔ جگر صاحب بے قابو ہوگئے۔ بولے۔ ''جناب آپ مجھے داموں خریدنا چاہتے ہیں۔ میں تو رشید الظفر خاں کے ہاتھوں بِک چکا ہوں!'' حاضرین سنّاٹے میں آگئے اور جگر صاحب گھر آگئے۔

جگر صاحب میں مروّت اور وضع داری بہت ہے۔ جس سے رسم و راہ ہو جائے اس کے لیے وہ تمام آداب برتتے ہیں جو شریفوں میں قدیم سے چلے آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے دھوکے کھائے اور نقصان اُٹھائے۔ جگر صاحب کا شمار کھاتے پیتے لوگوں میں نہیں ہے۔ مدتوں بڑی تنگی ترشی سے بسر ہوئی ہے۔ اب بھی خرچ آمدنی سے بہت زیادہ ہے، لیکن انھوں نے اپنی تنگ دستی کا اظہار کبھی کسی سے نہیں کیا۔ مہمان کا خیر مقدم اس طرح کرتے ہیں جیسے ان کے گھر خیر و برکت کا نزول ہو رہا ہو۔ تکریم و تواضع میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھتے۔ کپڑے اچھے پہنتے ہیں۔ سامان قیمتی رکھتے ہیں جس کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی مانگ لیتا ہے یا چُرا لیتا ہے ورنہ خود کہیں کھو آتے ہیں!

جگر صاحب جب کبھی میرے ہاں آئے میں نے یہ سوال کیا۔ ''جگر صاحب سفر میں کیا کھو آئے؟'' اور تقریباً ہمیشہ یہ معلوم ہوا کہ کچھ نہ کچھ، کہیں نہ کہیں چھوڑ آئے۔ ایک دفعہ مشاعرہ میں جو کچھ ملا تھا اُسے جیب میں رکھ لیا تھا۔ جن کے ہاں ٹھہرے تھے انھوں نے جگر صاحب کی دیکھ بھال کے لیے اپنے کسی عزیز کو مقرر کر دیا تھا۔ انھوں نے جگر صاحب کی بڑی خدمت کی، ہر وقت موجود رہتے اور اظہارِ عقیدت کرتے۔ جگر صاحب کو غافل سمجھ کر انھوں نے سارے روپے نکال لیے۔ جگر صاحب کہتے تھے کہ وہ یہ سب دیکھ رہے تھے، لیکن چُپ رہے۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ کیوں؟'' بولے۔ ''یہ واقعہ ایسے وقت ہوا جب میں جائے قیام سے رُخصت ہو کر اسٹیشن آ رہا تھا۔ بہت سے لوگ موجود تھے کچھ اچھا نہ معلوم ہوا کہ وہاں اس چوری کا اعلان کروں اور کسی شریف آدمی کو رُسوا کروں۔''

جگر صاحب جس کے مہمان ہوتے ہیں اس پر بہت کچھ اپنا ہی صَرف کر دیتے ہیں۔ میں نے غصہ میں ان کو آپے سے باہر ہوتے نہ دیکھا۔ حکم چلاتے نہ پایا۔ اپنی بڑائی کبھی ان کی

زبان پر نہ آئی، دوسروں کے عیب انھوں نے کبھی نہیں ڈھونڈھے نہ کبھی ان کی تشہیر کی۔ ایسے لوگ کم ہیں جو اپنی بڑائی جتانے کے لیے ایسا نہ کرتے ہوں! جگرؔ صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عام شعرا کی مانند اس تاک میں نہیں رہتے کہ کوئی غریب اور شریف مل جائے تو اپنے اشعار سُنا سُنا کر اسے اَدھ موا کر دیں!

جگرؔ صاحب کو معصوم بچوں سے کھیلتے ہوئے کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ بالخصوص ایسے حال میں کہ جگرؔ صاحب کو نہ معلوم ہو کہ انھیں کوئی دیکھ رہا ہے۔ بچے سے کہیں زیادہ معصوم وہ خود نظر آتے ہیں۔ وہ اتنے خوش اور شگفتہ معلوم ہوں گے جیسے ان کے سر پر آسمان نہ ہو۔ جگرؔ صاحب کا چہرہ بشرہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی بچہ ان کے سامنے بے تکلف ہو سکے۔ اس کی کمی جگرؔ صاحب طرح طرح سے پوری کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بچہ کا کھلونا بنا دیتے ہیں۔ ایسا کھلونا جس کو بچہ نہ کھیلے تو کھلونا خود کھیلنے لگے۔ وہ بچوں سے مصافحہ، معانقہ یا چوما چاٹی نہیں کرتے، نہ دعائیں دیتے ہیں نہ تلقین کرتے ہیں، نہ اسے ملک نہ ملّت کی خدمت یا خواری کے لیے تیار کرتے ہیں۔ وہ اس کے سامنے اپنی شاعری بھول جاتے ہیں، اپنی عمر، صحت، حلیہ، زبوں حالی سب فراموش کر دیتے ہیں۔ بس طرح طرح سے خوش ہوتے ہیں اور بچہ کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ بچے خدا کا مصرعہ طرح ہوتے ہیں جن پر خدا طرح طرح سے طبع آزمائی کرتا ہے!

میں نے بعض مشہور مستند اور عمر رسیدہ شعرا کو دیکھا ہے جو دوسرے شاعر کی برائی بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مشاعرہ میں شاعر اپنا کلام سنا رہا ہے یہ بیٹھے اس پر بازاری فقرے چُست کر رہے ہیں اور آس پاس کے نالائقوں سے اپنی اس خفیف الحرکتی کی داد لیتے جا رہے ہیں۔ اس طرح کی بے ہودگی کسی اور میں ہو تو ہو، شاعر میں ہرگز نہ ہونی چاہیے۔

اس طرح کی حرکت شاعر ہی نہیں کرتے، وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو شعر و ادب کے پارکھ سمجھے جاتے ہیں اور جنھوں نے عمر کا بیش تر حصہ شعر و ادب کی خدمت میں گزارا ہے۔ بس یہ گوارا نہیں کہ ان کے ہوتے دوسرا کیوں!

بعض شعرا، بعض اشعار اور بعض مواقع ضرور ایسے ہوتے ہیں جب پھبتی یا فقرے بے اختیار زبان پر آ جاتے ہیں۔ اُسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ یہ فقرے اور پھبتی کبھی

کبھی وہ مزا دے جاتے ہیں جو اچھے اچھے اشعار نہیں دے پاتے، لیکن اس طرح کے فقرے اور پھبتی کہنے کا حق مشاعرہ میں سامعین کو حاصل ہے خود شعرا کو نہیں۔

مشاعروں میں اب یہ بات عام ہوگئی ہے بالخصوص دہلی کے پبلک مشاعروں میں۔ آج کل شاید ہی کوئی اور تقریب ایسی ہوتی ہو جہاں بے ہودگی اور آبروریزی کے ایسے مناظر دیکھے جاتے ہوں جیسے دلّی کے اس طرح کے مشاعروں میں۔ عام مجمع میں جہاں شریف خواتین، ذمہ دار حکام، پیشوایانِ ملک وقوم، غیر ممالک کے اکابر، ناسمجھ لڑکے لڑکیاں موجود ہوں وہاں شعرا کا جو قوم کا ناموس ہوتے ہیں، فخریہ اور اعلانیہ شراب پی پی کر اس طرح کی نالائقی دکھانا بڑے رنج اور شرم کی بات ہے۔

مجھے تو کبھی کبھی اس کا اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ شاید وہ دن بھی دور نہیں جب دلّی کا کوئی منچلا سرمایہ دار شاعروں کی کوئی سرکس کمپنی بنا لے اور امریکن فری اسٹائل میں ان کے کرتب اور کرتوت شہر شہر دکھاتا پھرے!

خلوت ہو یا جلوت جگر صاحب کو میں نے ساتھی شعرا کے کلام پر کبھی حاشیہ آرائی کرتے نہیں پایا۔ مشاعرہ میں اُن کی طرح سنجیدہ اور خاموش بیٹھنے والا شاعر شاید ہی کوئی اور ہو۔ اُن کی زبان سے کوئی فقرہ کبھی نکلے گا بھی تو تحسین اور ہمت افزائی کا۔ یہاں مجھے ثاقبؔ اور صفیؔ مرحومین بے اختیار یاد آتے ہیں۔ لکھنؤ کے یہ باکمال شعرا مشاعرہ میں جس ادب و احترام سے بیٹھتے اور مناسب مواقع پر تحسین کے کلمات جس شریفانہ انداز سے کہتے وہ ادب کہیں نہیں نظر آتا۔

یہ مشاعرہ میں شروع سے آخر تک دوزانو نیچی نظر کیے ہوئے بیٹھے رہتے، خواہ مشاعرہ کتنے ہی دیر میں کیوں نہ ختم ہوتا۔ کبھی چائے، پان یا پانی کی فرمائش نہ کرتے۔ کوئی پیش کر دیتا تو بڑی فروتنی سے قبول کر لیتے یا عذر کر دیتے۔ ان لوگوں نے ایسے مشاعروں میں بھی شرکت کی جہاں مخالف کیمپ کے شعرا اور ان کے حمایتی موجود ہوتے اور اس کا اندیشہ رہتا کہ کہیں کوئی نا ملائم فقرہ نہ کہہ دے لیکن آج تک کوئی ناگواری پیش نہ آئی۔ مخالفین کا کلام یہ دونوں بڑے شوق اور شائستگی سے سنتے اور داد دیتے تھے۔

ثاقبؔ صاحب کوعلی گڑھ سے بڑی اُلفت تھی۔ کوئی بڑی ہی مجبوری ہوتی تو خیر، ورنہ یہاں کے مشاعروں میں ضرور شرکت کرتے۔ میری طالب علمی کا زمانہ تھا، ثاقبؔ صاحب پکی بارک کے ایک کمرہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دن بھر کا سفر کر کے آئے تھے، طبیعت ناساز تھی۔ رات کو مشاعرہ تھا۔ میں نے عرض کیا آپ آرام فرمالیں، وقت آنے پر میں حاضر ہو جاؤں گا اور آپ کو لے چلوں گا۔ فرمایا۔ ''میاں نہیں یہ آدابِ مشاعرہ کے خلاف ہے کہ جب جس کا جی چاہے آجائے اور جب جی چاہے چلا جائے۔ میں آپ کے ساتھ ابھی چلتا ہوں۔''

اس مشاعرہ میں ثاقبؔ صاحب کے دو اشعار علی گڑھ میں بہت مقبول ہوئے۔ جیسے آج کل رات کو سینما ہوا اور صبح اس کے مقبول فلمی گانے یا دُھنیں بچہ بچہ کی زبان پر آ گئیں۔ اس زمانے میں علی گڑھ کے مشاعروں کا یہی حال تھا، اچھے اشعار ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر رواں ہو جاتے تھے۔ ثاقبؔ صاحب کے وہ دو اشعار یہ تھے ۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانہ کو مرے
جن پہ تکیہ تھا، وہی پتے ہوا دینے لگے!

....

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں
ابر سیاہ جانب کہسار دیکھ کر !

جگرؔ صاحب میرے ہاں تشریف لاتے ہیں تو چند باتوں کا میں خاص طور پر خیال رکھتا ہوں۔

اوّل یہ کہ جگرؔ صاحب کی صحت اچھی نہ ہوگی۔ اس لیے اپنے عزیز ترین ڈاکٹروں کو بُلواتا ہوں جو اُن کا مکمل معائنہ کرتے ہیں۔ وہ دوا اور غذا تجویز کریں گے، پرہیز بتائیں گے اور دوسرے مشورے دیں گے۔ میں ان سب پر جگرؔ صاحب سے عمل کراؤں گا۔

دوسرے یہ کہ جگرؔ صاحب معلوم نہیں کہاں کہاں کا اور کتنے دنوں کا چکّر لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے ساتھ میلے کپڑے چادر، غلاف، تولیے کا انبار ہوتا ہے۔ دھوبی بلوا کر یہ کپڑے اس کے حوالے کروں گا۔

تیسرے یہ جگرؔ صاحب کا خط بڑھا ہوگا۔ اس کے لیے نائی بلواؤں گا تاکہ وہ جگرؔ صاحب کو نوک پلک سے درست کر دے۔

چوتھے یہ کہ اس بات کا انتظام کروں گا کہ جگرؔ صاحب کے عشاق ان کو علی گڑھ میں گھسیٹتے نہ پھریں، اور میرے ہاں نہ اپنا کلام ان کو سنائیں اور نہ ان کا کلام خود سُنیں۔

پانچویں یہ کہ جگرؔ صاحب کے پاس جو نقدی ہوتی ہے اسے ضبط کر لیتا ہوں تاکہ وہ علی گڑھ میں روپے اس طرح نہ خرچ کریں جس طرح بعض حکومتیں دوسری حکومتوں پر خرچ کرتی ہیں۔

چھٹے یہ کہ جگرؔ صاحب رُخصت ہونے لگتے ہیں تو میں خدا حافظ کہنے کے لیے نہیں موجود ہوتا اس لیے کہ جگرؔ صاحب کچھ اس گداز قلب کے ساتھ رُخصت ہوتے ہیں جیسے نہ ان کو میری زندگی کا بھروسہ ہے نہ اپنی زندگی کا اور اس طرح سے رُخصت ہونا یا رُخصت کرنا میرے بس کی بات نہیں!

(مطبوعہ 'نقوش'، لاہور، شخصیات نمبر)

●●●

اقبال سہیل

(1884-1955)

اقبال احمد خاں سہیلؔ 1884 کو اعظم گڑھ کے قصبہ بر ہرہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام عزیز اللہ خاں تھا۔ اقبال سہیل کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ دس سال کی عمر میں انھوں نے اُردو، فارسی اور عربی کی اچھی استعداد حاصل کر لی تھی۔ مشرقی علوم کی تحصیل کے لیے اُن کو علی گڑھ بھیجا گیا جہاں ان کی سرپرستی مولانا حمید الدین فراہی نے کی۔

اقبال سہیل 1914 میں انٹرنس پاس کر کے علی گڑھ دوبارہ آئے اور یہاں انھوں نے بی۔اے میں داخلہ لیا۔ اُن کا شمار ذہین ترین طلبا میں ہوتا تھا۔ وہ ایک اچھے مقرر اور شاعر بھی تھے۔ اُن کا اردو، عربی اور فارسی کا وسیع مطالعہ تھا۔ رشید صاحب اور ذاکر صاحب کے قریب ترین ساتھیوں میں سے تھے۔

علی گڑھ سے بی۔اے اور ایل۔ایل۔بی کرنے کے بعد وہ اعظم گڑھ جا کر وکالت کرنے لگے تھے اور اپنے پیشہ میں کامیاب تھے۔ 1955 میں انتقال ہوا۔

تابشِ سہیل اُن کا شعری مجموعہ ہے۔ **مرتب**

مولانا سہیل (اقبال احمد خاں ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی علیگ) سے میری ملاقات 1915 میں ہوئی۔ اُس زمانے میں مولانا شاعری کرتے تھے، یونین کے الیکشن لڑاتے تھے اور معجون کھاتے تھے۔ اب مقدمے لڑاتے ہیں اور بچے پیدا کرتے ہیں۔ جس کی ابتدا ایسی ہو، اُس کا انجام یہ کیوں نہ ہو! ہم دونوں گل منزل (یادش بخیر کچی بارک) میں رہتے تھے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا لُو چلتی تھی، خاک اُڑتی تھی۔ معلوم نہیں آپ نے گل منزل دیکھی بھی ہے یا نہیں۔ یہ بھی نہیں مولانا سے واقف ہیں یا نہیں۔ اس میں اگر آپ کو کسی ایک سے بھی نیاز حاصل ہے تو سمجھ لیجیے دوسرے کو بھی دیکھ لیا۔ مولانا ساکن، گل منزل گل منزل متحرک، مولانا!

جس دن ملاقات ہوئی مولانا الیکشن میں مبتلا تھے۔ کچی اور پکی بارکوں میں یوں بھی چشمک رہا کرتی تھی۔ جب سے مولانا کچی بارک میں آگئے تھے اس میں اضافہ ہوگیا تھا۔ ہر طرف الیکشن کا چرچا تھا مسجد، ڈائننگ ہال، یونین، کلاس روم، ہر جگہ، ہر وقت، ہر شخص اس آشوب میں اسیر تھا۔ ایک فریق کے ایجنٹ میرے کمرے میں بھی آگئے مولانا کو خبر ہوئی قاآنی کا ایک شعر گنگناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ پانوں کی ڈبیا ہاتھ میں، پیک منہ میں اور اُس کے دھبے شیروانی پر کمرے میں بیٹھنے کا سامان کہاں؟ بکس پر فریق مخالف کے ایجنٹ بیٹھے اپنے اُمیدوار سے زیادہ میری قابلیت کا خطبہ پڑھ رہے تھے۔ کچی بارک کے غسل خانے معلوم نہیں آپ نے دیکھے ہیں یا نہیں نہانے سے پہلے ان غسل خانوں کی ستر پوشی لازمی تھی۔ ایسی ستر پوشی جس کے ہوتے ہوئے بھی بقول حکیم حاذق ''بے غسلا'' ستر شوئی بقدرِ اشک شوئی ہی کر سکتا تھا۔

میرے غسل خانے کی آبادی صرف ایک گھڑے پر مشتمل تھی دوسرے کی جگہ خالی تھی۔ اس پر مولانا بلا تکلف اس طور پر بیٹھ گئے گویا آج تک اسی قسم کی نشست پر بیٹھنے کے عادی تھے۔ مجھ پر اس کا اثر پڑا۔ یہ البتہ نہیں معلوم اس گھڑے پر اس کا کیا اثر پڑا جس کے رفیق کی جگہ مولانا نے غصب کر لی تھی۔

مولانا اور فریق مخالف کے ایجنٹ میں بحث ہونے لگی۔ حریف نے آخر اس اعتراف پر گفتگو ختم کرنی چاہی کہ دونوں اُمیدوار احمق تھے۔ مولانا نے برجستہ فرمایا۔ ''تو جناب میرا احمق کیوں نہ ووٹ پائے!'' یہاں احمق کے بجائے دونوں نے ایک اور لفظ استعمال کیا تھا جو احمق سے زیادہ جامع تھا، لیکن اس کا اعادہ اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کے لوگ خاکسار کی عافیت میں خلل انداز ہوں گے۔ اُردو میں بہت سے ایسے الفاظ، فقرے اور کہاوتیں ہیں جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے پوری داستان پر بھاری ہوتے ہیں۔ وہ بے تکلف استعمال بھی ہوتے ہیں لیکن چوں کہ اُستادوں کا کلام اُن سے خالی ہے اس لیے ان کا اظہار و اعلان نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا کا ''محاربۂ الیکشن'' ایک نظام کے ماتحت ہوتا اُمیدوار کا انتخاب اکثر ذوق و نظر کے ماتحت کرتے۔ اس کے بعد پروپیگنڈا شروع ہوتا۔ مشاعرہ ہوتا تو غزل تیار کر دیتے۔ تقریر ہوتی تو وہ رکھ دیتے۔ روپے پیسے کی ضرورت ہوتی تو اس سے بھی دریغ نہ کرتے۔ کسی مضمون میں نیازمندی ہوتی تو درس دیتے وہ کوئی حماقت کر بیٹھتا تو ثابت کر دیتے کہ اس سے بڑھ کر لیاقت اور ذہانت اگر کسی میں تھی تو خود اُن میں تھی نتیجہ یہ ہوتا کہ لوگ مولانا کے قائل اور ان کے پٹھو کے دشمن بن جاتے اس سلسلے میں مولانا کو اکثر خودستائی پر مجبور ہونا پڑتا۔ ایک دفعہ کسی دل جلے نے کہہ دیا۔ ''مولانا آپ اپنا پروپیگنڈا کرتے ہیں کتنی شرم کی بات ہے۔'' مولانا نے برجستہ فرمایا۔ ''پیغمبر نبوت کا دعویٰ نہ کرے، تو آپ لوگ نبی کے کب قائل ہوں؟''

کالج میں فارغ التحصیل عیال دار کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ ایف۔ اے پاس کر کے آئے تھے ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی ہو کر نکلے۔ چار برس کالج میں رہے بورڈر تھے لیکن تمام زمانہ دوسروں کے کمروں میں گزارا۔ دن کا کیا ذکر رات ہوئی جس کمرے میں ہوتے وہیں رات گزار دیتے۔ کمرے والے کو شعر سناتے رہتے یا اس کو اقتصادیات، فلسفہ، تاریخ،

الٰہیات، فارسی، عربی یا شعر و شاعری پر لیکچر دیتے ورنہ پھر آم، پان، زمیں داری، مذہب، عورتوں کی اقسام، مردوں کے امراض، مسلمانوں کے انجام پر خطبہ دے دیتے، زائد چارپائی کا انتقام ہوا تو خیر، ورنہ کسی کے ساتھ اس کی چارپائی پر شکنِ بستر ہو جاتے۔ جس مبحث کو اُٹھاتے معلوم ہوتا۔

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں!

انگریزی میں نیازمند تھے۔ ریاضی سے دلچسپی تھی۔ سائنس سے قطعاً ناآشنا۔ ان کے علاوہ کالج میں درسیات کے سلسلے میں جتنے مضامین تھے ہر ایک پر عبور تھا۔ جدید ترین نظریات سے آشنا تھے۔ ذہانت اور حافظہ کا حال یہ تھا کہ جس چیز کو عمر میں کبھی کبھار دیکھا یا پڑھا تھا اس کی ادنیٰ جزئیات پر بھی اتنی قدرت تھی کہ اس پر نہایت اعتماد کے ساتھ درس دے سکتے تھے۔ مُرشد (ڈاکٹر ذاکر حسین خاں) کے قائل تھے۔ اکثر فرماتے ''ذاکر کی ذہانت اور فطانت تک پہنچنا آسان نہیں ہے، کیا کروں خرابیِ صحت نے برباد کر دیا ورنہ اس عمر میں بھی ایسا ہی تھا!''

بی۔ اے میں ذاکر صاحب کے مضامین انگریزی کے علاوہ فلسفہ اور اقتصادیات تھے، ایف۔ اے میں سائنس، انٹرنس میں ریاضی کا نصابِ اعلیٰ۔ مرشد کو پڑھنے لکھنے سے کیا سروکار؟ بی۔ اے میں حاضری کم تھی ٹول صاحب نے بلا کر دھمکایا تو کتاب لے کر بیٹھے۔ کچھ دیر تک قرۃ العین کے اشعار اس انداز سے پڑھتے رہتے جس سے باآسانی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ ایک پٹھان کے ہاتھوں قرۃ العین اور اس کے اشعار کا کیا حشر ہو سکتا تھا۔

اس کے بعد اپنے اور قرۃ العین کے انجام پر غور کرنے کے لیے لیٹ جاتے۔ مولانا تشریف لاتے، ذاکر صاحب فرماتے۔ ''مولانا اب جان کی خیر نہیں پڑھنا شروع کیا ہے لیکن قدم قدم پر کتاب کے مصنف سے اختلافِ آرا ہوتا ہے یہ بھی طے نہیں کر سکتا کہ کون حق بجانب ہے۔'' مولانا جواب دیتے کہ ''کوئی مضائقہ نہیں کتاب لاؤ'' کتاب لائی گئی۔ مولانا فرماتے۔ ''ذرا اصل عبارت کا ترجمہ سناؤ۔'' وہ بھی سنایا گیا۔ ''لاحول ولاقوۃ'' کہہ کر مولانا کرسی پر اُکڑوں بیٹھ جاتے تبصرہ شروع ہوتا، ثبوت میں مثالیں اپنی زمیں داری یا علامہ شبلی مرحوم کی تصانیف سے دیتے۔ ذاکر صاحب کچھ دیر سنتے پھر کہتے۔ ''بس بس سمجھ گیا۔'' مولانا فرماتے۔

''دیکھو جلدی نہ کرو ابھی تو محض ابتدائی باتیں بیان کی ہیں مصنف بڑا فریبی ہے، اب اس کا فریب کھولتا ہوں۔'' غرض نوبت یہاں تک پہنچتی کہ ذاکر صاحب قرۃ العین کے ساتھ بھاگ کھڑے ہوتے اور مولانا کسی حالت میں ہوتے ان کے پیچھے ہو لیتے۔ اب ذاکر صاحب آگے چلے جا رہے ہیں مولانا تعاقب میں ہوتے، دونوں کے درمیان جتنا فاصلہ بڑھتا جاتا مولانا اپنی آواز بلند کرتے جاتے۔ یہاں تک کہ ذاکر صاحب آنکھ سے اُوجھل ہو جاتے اور یہ پاس کے کمرے میں بغیر کسی تامّل یا تکلف کے داخل ہو جاتے۔ کمرہ کسی کا ہوتا مولانا کا قیام آئندہ بارہ گھنٹے کے لیے وہاں مسلّم ہو گیا۔ یہاں بھی ذکر وفکر کا کوئی نہ کوئی سلسلہ شروع کر دیا جاتا۔

میں کچی بارک کے 72 نمبر میں تھا۔ مسجد سے بہت قریب۔ جمعہ کا دن تھا مولانا بھی موجود تھے۔ موصوف کے غسل کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ مولانا کو غسل اور فیرینی سے ہمیشہ نفرت رہی لیکن آج لوگ کچھ اس درجہ آمادۂ نقضِ امن ہوئے کہ جی کڑا کر کے نہانے پر آمادہ ہو گئے۔ چھوٹی سی میلی بنیان اور اس سے زیادہ میلا آڑا پائجامہ قریب سَتر بنے ہوئے تھے۔ کثیف کمر بند صاف پائجامہ میں ڈالا جا چکا تھا، اور میلے پائجامے کو تہہ بند کی سی بندش دے رکھی تھی جس کو مزید کمک فِتق کی کمانی سے پہنچائی گئی تھی۔ اتنے میں کھانا آ گیا مولانا نے کہا۔ ''کھانے کے بعد نہالوں گا۔'' ابھی ایک نلی (ہڈی) سے اُلجھے ہوئے تھے کہ صاحب باغ سے کچھ احباب آ گئے۔ طہارت کے اسلامی اور غیر اسلامی تصوّر پر بحث چھڑ گئی۔ بحث کے انہماک میں مولانا کو یہ خبر نہ ہوئی کہ جس چیز پر نلی کو ٹھونک کر گودا نکال رہے تھے وہ غسل خانے کی اُونچی دہلیز تھی۔ لوگوں نے غل مچایا تو خبر ہوئی۔ نو واردوں نے مسجد کا رُخ کیا لیکن مولانا کی بحث ختم نہیں ہوئی تھی بے خبری میں حریفوں کا تعاقب کرتے ہوئے مسجد تک پہنچ گئے گداگر، مرد، عورت، بچے سب مولانا کو دیکھ کر اس درجہ سراسیمہ ہوئے کہ بچوں نے بوڑھوں کا بوڑھوں نے بوڑھیوں کا اور بوڑھیوں نے اپنے چیتھڑوں کی پناہ پکڑی۔ ہم لوگ بھی دوڑ پڑے اور مولانا کو کمرے پر واپس لائے۔

موصوف کو ہر کھیل سے دلچسپی تھی اور جسے جتنا کم جانتے تھے اتنا ہی زیادہ اس سے شغف ہوتا۔ تاش، چوسر، گنجفہ، شطرنج، کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، ٹینس، پولو کہیں ہو رہا ہو۔ مولانا

ضرور موجود ہوں گے اور اس تندہی اور دلچسپی کے ساتھ مصروفِ نظارہ ہوتے کہ دنیا و مافیہا کسی کی خبر نہ رہتی۔ اس سلسلے میں مولانا کا رعب اسی وقت تک رہتا جب تک خاموش رہتے۔

مولانا صرف ''اندرونِ خانہ'' قسم کے کھیلوں میں براہِ راست حصہ لیتے تھے تاش کھیلنے کا بھی شوق تھا، لیکن مولانا کے ساتھ کھیلنا ہر شخص کے بس کا نہ تھا۔ اوّل تو خراب کھیلتے تھے، دوسرے خلوصِ نیت سے نہ کھیلتے۔

مولانا کی شاعری پر اظہارِ خیال مرشد نے کیا ہے اور خدا جانے کیا اور کس طور پر کیا ہے کیوں کہ نہ مجھ کو خبر کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں اور نہ اُن کو خبر کہ میں کس آفت میں مبتلا ہوں۔ مجھے تو صرف یہ بتانا ہے کہ مولانا کی شعروشاعری کے بعد ہم سب پر شاعر اور شاعری کا پھر کبھی رعب نہیں پڑا۔ کسی قسم کی شاعری ہو، مصرع طرح کیسا ہی سنگلاخ اور وقت کتنا ہی تنگ کیوں نہ ہو، اُردو ہو یا فارسی مولانا کا قلم بقول ظفر علی خاں صاحب ''ٹھاٹھیں مارتا چلا جاتا تھا۔'' معلوم نہیں ٹھاٹھیں مارنے کی ترکیب یا یہ محل استعمال صحیح بھی ہے یا نہیں مفہوم بہر حال وہی ہے جو ظفر علی خاں صاحب کا ہوگا۔ مولانا دوسروں کو غزل، نظمیں لکھ دیا کرتے تھے اصلاح نہیں دے سکتے تھے کہتے تھے ''جب تک اصلاح دوں پوری نظم کیوں نہ لکھ دوں۔''

مولانا سے شعر لکھا کر مشاعرے میں پڑھنا خطرناک تھا۔ مشاعرے میں کبھی تو اپنے یا اُس کے کلام پر بآواز بلند سوچنا شروع کر دیتے تھے یا پھر اُن کا پیچ و تاب یا اظہارِ جذبات اس درجہ نمایاں اور معنی خیز ہوتا کہ لوگ تاڑ جاتے کہ دراصل کلام کا مصنف کون تھا۔ اس لیے جو شخص مولانا سے استفادہ کرتا وہ اس کا بھی اہتمام کرتا کہ جس موقع پر وہ کلام پیش کیا جائے وہاں مولانا موجود نہ ہوں، مولانا کا کلام اُن کے تخلّص سے تقریباً نایاب ہے۔ لیکن دوسروں کے تخلّص سے اتنا ہی وافر ہے جتنا کسی دوسرے کا ہو سکتا ہے۔

ایک زمانے میں غالبؔ اور ذوقؔ کا موازنہ کالج میں بڑی مقبول ''ادبی ورزش'' تھی ایک صحبت میں یہی مسئلہ زیرِ بحث تھا۔ ذوقؔ کے پرستاروں کی تعداد زیادہ تھی۔ مولانا بھی گشت لگاتے پہنچ گئے سب نے مولانا سے رجوع کیا، طبیعت بحث پر مائل نہ تھی، حاضرین نے چھیڑنا شروع کیا۔ مولانا برابر ''غیر حاضر'' رہے۔ ایک صاحب نے بڑے فاتحانہ انداز سے ذوقؔ کا یہ

سر بہ وقتِ ذبح اپنا اس کے زیرِ پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر، لوٹنے کی جائے ہے

مولانا چونک پڑے، سبحان اللہ، اس کے بعد شعر کے ثانی مصرعہ کے ایک لفظ کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے پڑھا اور سر نیچا کر کے ''لاحول ولاقوۃ'' کہہ دیا۔ ذوقؔ کے حمایتی خفیف اور خجل ہو کر اُٹھ گئے۔

یہاں تذکرہ تھا مولانا کے کلام کی کم یابی اور نایابی کا۔ حال ہی میں کسی اخبار میں اشتہار دیکھا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ مولانا کا دیوان زیرِ ترتیب ہے اس لیے جن صاحبوں کے پاس مولانا کا کلام ہو وہ مرتب کے پاس بھیج دیں۔ اس سلسلے میں دو باتیں قابلِ ذکر ہیں ایک مولانا کی یہ کوشش اور تمنا کہ وہ کلام بھی مجموعے میں شامل کرلیا جائے جن کو مولانا کمزوری کے لمحات میں وقف علی الاولاد کیا کرتے تھے۔ دوسری طرف اُن لوگوں کی سراسیمگی ہے جو اُن پر قابض و متصرّف تھے اور اُن ہی کے نام سے وہ کلام شائع کیا۔

ایک صاحب مولانا کے عزیز دوست تھے مولانا سے فرمائش کی یونین میں ایک تقریر کرنا چاہتا ہوں آپ کوئی بڑھیا تقریر لکھ دیں۔ مولانا آمادہ ہوگئے اور تقریر لکھ کر حوالہ کردی، نہایت پُر مغز، مدلّل اور شان دار الیکشن کا زمانہ قریب تھا جب ہر اُمیدوار کے لیے یونین میں اپنی تقریر کا سکّہ جمانا لازم آتا تھا، کئی ہفتے بعد اسی مبحث کا اعلان کیا گیا۔ جس پر مولانا نے تقریر لکھی تھی۔ محرّک کا نام بھی وہی تھا جس کے لیے مولانا نے تقریر لکھی تھی۔ مقرّرہ یوم اور وقت پر ہم مولانا کے ساتھ یونین پہنچے۔ وائس پریسیڈنٹ نے اعلان کیا کہ بعض وجوہ کی بنا پر محرّک تشریف نہ لاسکے۔ اس لیے فلاں صاحب تحریک پیش کریں گے۔ یہ بزرگ مولانا کے دوست کے دوست تھے، لیکن خود مولانا اُن کے ازلی دُشمن تھے۔ مولانا کو کچھ تو اپنے دوست کے فرار ہوجانے پر خفت اور مایوسی تھی کیوں کہ حسبِ معمول ممدوح نے اپنی تصنیف اور اپنے دوست کے ملکۂ تقریر کا اپنے مخصوص انداز میں کافی پروپیگنڈا کر رکھا تھا۔ حریف کی پیش قدمی سے متحیّر و مکدّر ہوئے۔ مولانا نے اب نووارد کے خلاف طبع آزمائی شروع کی۔ کہ ''یہ تقریر کرنا کیا

جانیں۔ وہ عبارت صحیح لکھنا اور بولنا نہیں آتا۔ موضوع زیرِ بحث اُن کے فرشتوں کے بھی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔'' وغیرہ۔

محرک حریف پارٹی کے رُکن تھے اور اُن کا شہرت پانا مولانا کے مقاصد کے منافی تھا۔ تقریر شروع ہوئی، مولانا چونک پڑے۔ یہ بزرگ نہایت صفائی اور جرأت کے ساتھ مولانا ہی کی لکھی ہوئی تقریر دُہرا رہے تھے۔ اب مولانا کو معلوم ہوا کہ فریب دیا گیا تھا۔ ایسا فریب جس کی اہمیت اور نزاکت کو نظر انداز کیا گیا تو الیکشن کا سارا بنا بنایا نقشہ پلٹ جائے گا۔ تقریر ختم ہوئی اور ہال ابھی نعرۂ تحسین سے گونج ہی رہا تھا کہ مولانا اسٹیج پر نظر آئے۔

حاضرین متحیّر تھے کہ مولانا تقریر کرنے پر کیوں کر آمادہ ہو گئے۔ مولانا کی جادو بیانی مشہور تھی لیکن موصوف کو تقریر پر آمادہ کرنا ہر شخص کا کام نہ تھا۔ آج جو یہ آمادگی پائی گئی تو مجمع ہمہ تن گوش بن گیا۔ مولانا نے تحریک کی مخالفت میں اپنی ہی لکھی ہوئی تقریر کی رو میں برجستہ کامل ایک گھنٹہ تقریر کی۔ اس عالمانہ تبحر لطف بیاں اور جوشِ خطابت کے ساتھ کہ لوگ حیرت میں آ گئے بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کے بعد لوگوں پر مولانا کے تبحر، ذہانت اور سحر بیانی کا ایسا سکہ جما کہ جب تک کالج میں رہے حریفوں نے کبھی سرتابی نہیں کی۔ سرور خاں مرحوم طلبائے کالج کی ''جماعتِ اشراف'' کے مسلمہ لیڈر تھے اور مولانا سہیل اور اُن کے ''چونّی والوں'' کے سخت مخالف۔ ایک بار مولانا کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگے ''فتنہ ہے فتنہ، لیکن کیا کیا جائے کم بخت بڑا قابل اور بے پناہ ہے۔''

1918 یا 1919 کا واقعہ ہے یونین میں اُم الالسنہ عربی پر خواجہ کمال الدین مرحوم کی اردو میں تقریر تھی۔ مرحوم نے بڑی قابلیت اور اعتماد کے ساتھ تقریر شروع کی۔ مولانا سہیل کی آنکھوں میں تکلیف تھی۔ سردیوں کا زمانہ تھا، مولانا کو احباب اسپتال لائے تھے، یونین میں مجمع دیکھا تو کہا۔ ''مولانا تکلیف نہ ہو تو ذرا تقریر سنتے چلیں۔'' مولانا نے کہا۔ ''اچھی بات ہے لیکن آنکھوں میں تکلیف زیادہ ہے جلد اُٹھ آئیں گے۔'' سب لوگ یونین میں آئے مولانا سر سے پاؤں تک بڑے وزنی لبادے میں ملفوف تھے، سر پر اُونی کنٹوپ تھا۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس پر ایک ہرے رنگ کا چھجا (شیڈ) لگا ہوا تھا۔ خواجہ صاحب نے کم و بیش دو گھنٹے تک

تقریر کی۔ حاضرین محوِ حیرت تھے۔ تقریر ختم ہوئی تو وائس پریسیڈنٹ نے اعلان کیا کہ مولانا سہیلؔ فاضل مقرر کا طلبائے کالج کی طرف سے شکریہ ادا کریں گے۔ مولانا کے خلاف سازش کامیاب ہوئی۔ دوستوں اور ساتھیوں نے مولانا کو ہاتھوں ہاتھ ڈائس پر پہنچا دیا۔ مولانا کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی میز کے پاس کھڑے کئے گئے تھوڑی سی ناک، اس سے ذرا بڑی ٹھوڑی اور ہاتھ کی صرف اُنگلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ مولانا نے بے تکلف تقریر شروع کر دی اس اعتماد سے گویا تمام عمر اسی مبحث پر تیاری کی تھی۔ جو لوگ یونین کے مجمع سے واقف ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ اچھے مقرّر کے بعد کسی اور کی تقریر سننے کے لیے کوئی نہیں ٹھیرتا اور صدر کا شکریہ بھی اسی بدنظمی کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ مولانا نے بھی اُم الالسنہ عربی پر تقریر شروع کی۔ پَون گھنٹہ تک تقریر کے نئے نئے پہلوؤں سے موضوع پر روشنی ڈالی، نئی نئی مثالیں پیش کیں۔ تقریر کو اس درجہ دل نشیں اور کہیں کہیں اتنا شگفتہ بنا دیا کہ خواجہ صاحب نے بے اختیار ہو کر مولانا کو گلے سے لگا لیا اور فرمایا۔ ''تمہارے ایسا جامع کمالات ساتھ کام کرنے والا مل جائے تو میں اسلام کا جھنڈا یورپ کی سب سے بلند چوٹی پر نصب کر دوں۔''

مسز سروجنی نائیڈو کالج میں پہلے پہل تشریف لائی تھیں۔ آج سے کم و بیش سترہ اٹھارہ سال قبل اسٹریچی ہال میں رات کے وقت تقریر ہوئی۔ وہ رات اُردو شعر و ادب اور ہندوستانی سیاست میں یادگار رہے۔ ہمارے ''وِدا سوبھا'' آغا حیدر حسن دہلوی نے بیگماتی زبان میں بیگم نائیڈو پر ایک مضمون لکھا جو اپنی خوبیوں کے اعتبار سے اُردو ادب میں بے نظیر ہے دوسری نظم مولانا سہیلؔ نے لکھی، ترکیبِ الفاظ لطافتِ خیال، لطفِ زبان اور ترنّم و تازگی میں وہ خود سروجنی کا پیکرِ شعری تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت کے کالج سکریٹری کے ''حُر'' بننے کی شانِ نزول بھی اسی واقعہ سے وابستہ ہے۔

یہاں مولانا کے کلام کا جائزہ لینا مقصود نہیں ہے عام طور پر لوگ خیال کرتے ہوں گے کہ مولانا کی شعر و شاعری صرف اُردو تک محدود تھی حالاں کہ مجھے اکثر ایسا محسوس ہوا کہ مولانا کے فارسی کلام میں اُردو سے زیادہ طرفگی اور تازگی ہے۔ اعلیٰ حضرت شہر یار دکن کے ورودِ مسعود پر مولانا نے جو فارسی قصیدہ اسٹریچی ہال میں سنایا تھا وہ مولانا کی فارسی دانی کا ادنیٰ ثبوت ہے۔ یہ

قصیدہ مولانا نے رات بھر میں لکھ ڈالا تھا اس کے علاوہ متعدد ایسی نظمیں ہیں جو وائس پریسیڈنٹ یونین کی صدر نشینی کے موقع پر تصنیف فرمائیں۔ کہا نہیں جا سکتا کہ مولانا فارسی نظمیں جلد لکھ سکتے تھے یا اُردو۔ کچھ بھی ہو، لکھتے بہت جلد تھے اتنا جلد کہ تصوّر میں بھی بہ مشکل آ سکتا ہے۔

اکثر ایسا ہوا کہ شہر سے کچھ لوگ آئے ڈھونڈتے ڈھونڈتے مولانا تک پہنچے، مولانا کہیں جانے پر آمادہ ہیں لوگوں نے ہاتھ پاؤں جوڑنا شروع کر دیا۔ مولانا نے کھڑے کھڑے نظم مکمل کر دی۔ ایک دن قضائے حاجت کے بعد لوٹا لیے واپس آ رہے تھے کہ کچھ اجنبیوں نے گھیر لیا۔ منظوم رقعۂ دعوت کی التجا تھی مولانا بھی وہیں لوٹا لیے ہوئے نیب کے سائے تلے اُکڑوں بیٹھ گئے پہلا مصرعہ لکھا یا تھا کہ ایک صاحب بول اُٹھے۔ ''حضور اردو نہیں، فارسی۔'' مولانا نے بغیر کسی تامّل کے فارسی شعر لکھانے شروع کر دیے۔ فریقین کے نام، گاؤں، تاریخ سب کچھ نظم کر دی کیسی دل کش اور ستھری نظم تھی میں نے کہا۔ ''مولانا اسے علی گڑھ منتھلی میں شائع کرا دوں مجھے بھی لکھا دیجیے۔'' فرمایا۔ ''اب یاد کہاں اور پھر ایسی ویسی نظموں سے کون اپنے آپ کو منسوب کرے۔''

کتنے تو ایسے تھے جنھوں نے انعامی نظم اور مضامینِ نثر مولانا سے لکھوائے اور اوّل درجہ کا انعام حاصل کیا، ایک واقعہ کا ذکر کروں گا۔ علی گڑھ کی نمائش قریب تھی اور لکھنؤ کا ایک سفر درپیش تھا، کالج کے بقایا اُن پر مستزاد۔ ہم سب اس فکر میں تھے کہ کہیں سے روپے مل جائیں تو یہ دشواریاں دور ہو جائیں۔ ہم میں سب سے زیادہ مال دار مولانا تھے جو صرف کپڑے اور دواؤں پر روپے صَرف کرتے تھے یا ہم لوگوں کو قرض حسنہ دیتے تھے۔ قرضِ حَسنہ کا مفہوم یہ تھا کہ اگر کبھی مولانا کو ضرورت ہو تو ہم ادا کریں ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔ مرشد نے اس میں سود کا اضافہ کر دیا تھا یعنی بجائے اس کے کہ اصل پر سود کا اضافہ کر کے مولانا کو واپس کیا جائے، ادا کرتے وقت اصل میں سے سود اور بھول چوک کی رقم وضع کر لی جاتی تھی۔ مولانا اس پر بھی اکتفا کرتے تھے کہتے کہ ''جو مل گیا وہ پورا نفع ہے۔''

مرشد نے فرمایا۔ ''مولانا کو ٹٹولو۔'' میں نے کہا۔ ''رقم زیادہ ہے مولانا دے تو جائیں گے لیکن واپسی کے بھی متمنّی ہوں گے، اور مولانا نے مانگا نہیں اور ہماری ساکھ گئی نہیں۔''

علوی نے کہا۔ ''ترکیب میں بتاؤں؟ ابھی ایک نوٹس دیکھا ہے اردو کا ایک مضمون طلب کیا گیا ہے۔ اوّل انعام سو روپے کا ہے، مضمون مولانا سے لکھواؤ نام ہم اپنا دیں گے۔ انعام تو مل ہی جائے گا۔ سو روپے مولانا سے قرض لے لیے جائیں انعام ملے تو حق شاگردی وضع کر کے مولانا کو کچھ روپے واپس کر دیے جائیں گے۔'' یہ ترکیب پسند کی گئی اور پوری اسکیم مرتب کر کے ہم سب منہ لٹکائے ہوئے مولانا کے پاس پہنچے۔

مولانا ہم لوگوں کو کبھی افسردہ خاطر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ بولے، ''خیر تو ہے سُست سُست سے کیوں نظر آتے ہو۔'' ہاں، لیکن بڑا مبتذل اور پیش پا افتادہ مبحث ہے۔'' علوی نے کہا۔ ''جی ہاں ٹھیک ہے لیکن سرور صاحب نے آغا صاحب کے لیے .... صاحب کو لکھنؤ لکھا تھا وہاں سے وہ مضمون تیار ہو کر آ گیا ہے۔ نہایت عمدہ لکھا گیا ہے انعام تو خیر آغا کو مل ہی جائے گا لیکن آپ نے یہ بھی سوچا آئندہ الیکشن پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟ ہم لوگ تو کہیں کے نہ رہے سرور کہتے تھے کہ انعام ملنے پر سہیل کی مزاج پُرسی کروں گا۔''

مولانا نے جُھرجُھری لی۔ بولے، ''سرور سے کہہ دینا ستارۂ یمانی علی گڑھ میں بھی طلوع ہوسکتا ہے اچھا تو ذرا میز پر سے سادی کاپی اُٹھانا قلم تمہارے پاس ہے؟ لکھو۔'' مولانا نے مضمون لکھانا شروع کیا۔ بولے، ''بدوِ آفرینش سے'' ہم لوگوں نے کہا۔ ''مولانا یہ بدو'' وغیرہ مہمل ہیں ذرا سیدھا سیدھا لکھایئے ایسا بھی کیا مضمون جس کا پہلا لفظ نہ ٹھیک پڑھا جائے نہ سمجھا جائے۔'' مسکرائے پھر بولنا شروع کر دیا کم و بیش تین گھنٹے تک لکھاتے رہے اس کے بعد دوسرے وقت کے لیے لکھائی ملتوی ہوئی، دوسرے دن پھر شروع کیا اور بغیر یہ پوچھے ہوئے کہ اُوپر کیا لکھ آئے ہو بولنا شروع کر دیا مضمون فل اسکیپ کے تیس صفحات پر ختم ہوا چوں کہ نتیجہ جلد معلوم ہو گیا اس لیے مولانا سے اُدھار نہیں لینا پڑا، انعام کے روپے مل گئے اور ہمارے پروگرام کی ایک ایک مد پوری ہو گئی۔

مولانا کی گھریلو زندگی بڑی دلچسپ ہے تمام رشتہ دار عورتوں میں بے حد مقبول ہیں۔ خاندان کے لڑکے لڑکیوں کی شادی کی بات چیت مولانا ہی کے ذمہ ہے۔ پُرانے قصّے قضیے اس وقت تک کے لیے ملتوی رکھے جاتے ہیں جب تک تعطیل میں مولانا کا پھیرا نہ

ہو جائے۔ گھر کے ایک معتبر بھیدی سے روایت ہے کہ بڑے، بوڑھے، جوان، بچے سب کے ساتھ مولانا ایک ہی چار پائی پر بیٹھے صبح سے شام تک جھگڑے چکایا کرتے ہیں۔ انھیں کے لب ولہجہ اور روزمرّہ میں گفتگو کرتے ہیں انھیں کے ساتھ کھانا کھا لیتے ہیں اس دوران میں ان سے خواتین، کئی کئی ایک ساتھ کپڑوں کی فرمائش کر دیتی ہیں تو مولانا جس طرح بیٹھے ہوتے ہیں ویسے اُٹھ کر بازار چلے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ بایں ہیئت کزائی دیکھا کہ دال منڈی (بنارس) میں ننگے سر بزاز کے ہاں سے کم سے کم دو درجن کپڑے کے تھان نوکر کے سر پر رکھوائے چلے آرہے ہیں ایک ہاتھ میں رشتہ دار عورتوں ہی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی گلوری ہے پاؤں میں سلیم شاہی جوتی بہ مشکل سلیپر راستہ میں ایک بساطی سے اہلِ حدیث قسم کی بحث کرنے لگے۔ بڑے تپاک سے ملے کہنے لگے۔ ''صدیقی خوب آئے'' بغل گیر ہونے پر آمادہ ہوئے۔ میں نے کہا۔ ''مولانا شیروانی میرے پاس ایک ہی ہے اور نئی بھی ہے اس پان کو یا تو یہیں کسی بالا خانے پر دے آیئے یا اس بساطی کو دے دیجیے بڑی بخشیں کرتا ہے، آپ کا پان کھا کر مدتوں گلپھڑوں کو روئے گا۔''

ہم دونوں مکان واپس آئے عورتوں نے باوجود مولانا کی طلاقتِ لسانی کے سارے کپڑے واپس کر دیے اور فرمائش کر دی کہ ''دوسرے لاؤ'' مولانا پھر آمادۂ سفر ہوئے اور اس اطمینان کے ساتھ گویا شبلی منزل میں دعوت کھانے جا رہے ہیں عرض کیا۔ ''مولانا یہ نہ ہوگا۔ کپڑے نوکر سے واپس کرا دیجیے آپ جس حیثیت سے دال منڈی میں گشت لگاتے ہیں اس کا اثر وہاں کی ''بالانشینوں پر کیسا پڑے گا؟'' مولانا نے کہا۔ ''دال منڈی والیوں کا خیال کروں یا گھر والیوں کا۔ دال منڈی میں تم نہیں جانے دیتے گھر والیاں اندر نہ گھسنے دیں گی۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی پروا نہیں۔ یہ دیکھیے سامنے کیسے اچھے سیخ کے کباب اور پیاز کے لچھے نظر آرہے ہیں ہم آپ یہی کھائیں گے۔ آپ شعر سنایئے گا میں سو رہوں گا'' اتنے میں نبی احمد مرحوم آگئے کہنے لگے۔ ''صدیقی تمہارا آنا ہم سب کی نجات کا باعث ہوا ورنہ اقبالؔ ان عورتوں کے پھیر میں تمام دن دال منڈی میں آسیب کی طرح چکّر کاٹتے ادھر گھر میں عدالت دیوانی کا اجلاس ہو رہا ہے عجب ضیق میں جان تھی۔''

مولانا سہیل کو فن عمارت میں بڑا درک ہے جس طرح مشکل زمین میں اچھے شعر نکالنا ہر شاعر کا کام نہیں اسی طرح شہر کی چپقلش میں عمارت کا اچھا نقشہ بنانا بھی آسان نہیں، ٹیڑھی میڑھی زمین میں مولانا نے ایسے خوش وضع مکان بنوائے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے معلوم نہیں مولانا اچھا کھانا کھانے کے شائق ہیں یا نہیں یہ ضرور ہے کہ مولانا کے یہاں نہایت لذیذ اور ستھرا کھانا پکتا ہے۔ میں نے اکثر اپنے خرچ سے مولانا کے یہاں ارہر کی دال اور کھڑے مسالے کا گوشت کھایا اور اُن کے بالا خانے کے ہوادار برآمدے میں سونے کے لیے اعظم گڑھ کا سفر کیا ہے۔ پان کثرت سے کھاتے ہیں دانت بالکل نہیں صاف کرتے جس طرح بعض لوگ شکر کی خاطر چائے پیتے ہیں مولانا چونے کی خاطر پان کھاتے ہیں۔ فن عمارت کی اصطلاح یا استعارے میں یوں کہہ سکتے ہیں پان پر کتھے کی صرف کونچی پھری ہوتی ہے لیکن چونے کا پلاسٹر ہوتا ہے۔ لیموں کے دل دادہ ہیں کہتے ہیں۔ ''اللہ میاں نے، اگر عیسائیوں کا عقیدہ صحیح ہے چھ دن میں دنیا کی ساری چیزیں بنائیں ساتویں دن لیموں سے دل بہلایا ہے۔'' ایک دن تو مزے میں آکر یہاں تک کہہ گئے کہ ''لیموں ہی عورت کی تخلیق کا موجب ہوا۔''

اعظم گڑھ میں وکالت کرتے ہیں۔ خوب چلتی ہے۔ وکالت کے پیشے سے میں طبعاً متنفر ہوں اور میری دلی خواہش ہے کہ مولانا اس عذاب سے نجات پا جائیں۔ مولانا کا بہترین مشغلہ تصنیف و تالیف یا درس و تدریس ہوگا۔ مرشد اور سہیل عہدِ حاضر کے ہندستانی مسلمانوں میں منفرد ہیں۔ میں نے ان سے زیادہ کسی اور کو طباع، ذہین اور بے پناہ نہیں پایا لیکن مرشد اور سہیل میں ایک فرق ہے۔ مرشد اپنی سیرت اور شخصیت کے اعتبار سے نسبتاً بہت بلند و بہتر ہیں۔ مولانا سہیل وکالت میں اپنے حریف کا مقابلہ بحیثیت ایک فریق کے کرتے ہیں اور اس کے قائل ہیں کہ جنگ کا کوئی صحیفۂ اخلاق نہیں، مرشد حریف کا مقابلہ فریق کی حیثیت سے نہیں کرتے اُصول کو انھوں نے کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ وہ حریف کی عظمت کے بھی قائل ہو جاتے ہیں۔ سہیل کی عصبیت اکثر اُن کو حریف کی سیرت اور شخصیت کے بہتر پہلوؤں کا احساس کرنے سے باز رکھتی ہے۔ وہ اپنے دشمن کو حق و صداقت کا دوست نہیں سمجھ سکتے، مرشد کا عقیدہ یہ ہے کہ دشمن بھی مخالفت میں مخلص ہو سکتا ہے سہیل کے جانی دشمن بھی ہو سکتے ہیں مرشد کے کبھی نہیں۔

سہیل کثیر الاولاد ہیں دو لڑکے اور بہت ساری لڑکیاں۔ سب سے چھوٹا لڑکا حال ہی میں پیدا ہوا، چوں کہ متعدد لڑکیوں کے بعد پیدا ہوا، اس لیے مولانا کو اس کی بڑی مسرّت ہوئی۔ اس کی ولادت پر مولانا مسعود علی صاحب ندوی کو ایک خط لکھا گیا، جس کا آخری فقرہ یہ تھا:

''خدا کرے مولود کو سر یعقوب کی خوش نصیبی آپ کی بھل منساہٹ اور سہیل کی قابلیت ارزانی ہو۔''

سید صاحب[1] سے پہلے پہل اعظم گڑھ میں ملاقات ہوئی تھی۔ مولانا سہیل کے توسّل سے بہت دن ہوئے، شاید 32-30 برس تعطیلوں میں تفریحاً مولانا اور دوسرے عزیزوں دوستوں سے ملنے اعظم گڑھ گیا تھا۔ سہیل صاحب کو علامہ شبلی مرحوم سے بڑا شغف ہے۔ شبلی کے سامنے وہ سب کو بے حقیقت سمجھتے ہیں، حد یہ ہے کہ کبھی کبھی اپنے آپ کو بھی! ''کبھی کبھی'' یوں کہ اس بارۂ خاص میں مولانا کے بیانات میں اکثر تضاد رہا ہے!

فرمایا: چلو، تم کو حضرت مرحوم کے جانشین سے ملالاؤں۔''

میں نے کہا:

''مولانا! آپ کے ہوتے کون جانشین ہوگیا؟ یہ آپ کی عالی ظرفی ہے کہ آپ کسی اور کو مرحوم کا جانشین مانتے ہیں۔ آپ اپنے حاشیہ نشینوں کا ایمان کیوں پرکھتے ہیں جو آپ کو حضرت مرحوم کا صدقِ دل سے جانشین سمجھتے آئے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ آپ کے بعد نہ حضرت مرحوم کا کوئی جانشین رہے گا، اور نہ خود آپ کا!''

مولانا اس پر مسکرائے اس طور پر کہ پان کی پیک جو دہن کے گوشہ سے باہر سرک آئی تھی اُس کو ہاتھ سے پونچھا کہ اُس کی سُرخی کچھ داڑھی موچھوں پر رہ گئی کچھ ہتھیلی پر آئی اور وہاں سے بچہ کے کُرتے پر منتقل ہوئی جو پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ لوگوں نے شور مچایا تو بولے:

---

1 رشید صاحب نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کا خاکہ تحریر فرمایا ہے جو اُن کی کتاب ''ہم نفسانِ رفتہ'' میں شامل ہے۔ مندرجہ بالا سطور چوں کہ مولانا سہیل مرحوم کے بارے میں ہیں انھیں یہاں نقل کر دیا گیا ہے۔ (مرتّب)

''ارے یہ کہاں سے آ گیا میں تو سمجھ رہا تھا کہ منشی جی مقدمہ کے کاغذات رکھ گئے ہیں۔''

ایک دن مولانا سہیل سے، جو ابتدا سے میرے ''نگہبان فرشتہ'' کی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھے اپنے یہ وسوسے بیان کیے۔ مولانا کمرے میں کھڑے تھے اتفاق سے کمرہ بھی مولانا ہی کا تھا وہیں اُکڑوں بیٹھ گئے تھے۔ بولے، ''ارے بھائی، ٹکسالی اُردو ہمارے دیار کیا لکھنؤ تک میں نہیں بولی جاتی۔ ہم سب تو کتابی اُردو بولتے ہیں۔ رہا شعر و شاعری کا معاملہ تو یہ کچھ جون پور ہی پر موقوف نہیں ہر جگہ اس کی گرم بازاری ہے۔ ہندوستان کے دور افتادہ خطوں میں اردو کا شاعر ہونا پڑھے لکھے اور مہذّب ہونے کی نشانی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ لازم نہیں کہ جو شخص اردو کا شاعر ہو وہ صحیح اور اچھی اردو بھی بول سکتا ہے! اچھا دیکھو کسی دن تم کو ٹکسالی اردو سنواؤں گا۔'' پھر کچھ تھک سے گئے اور اپنی چارپائی کا سہارا لے کر فرش پر بیٹھ کر دونوں پاؤں پھیلا دیے، بولے۔ ''فارسی لے رکھی ہے؟'' میں نے کہا۔ ''جی ہاں'' کہنے لگے۔ ''دیکھو کلاس وغیرہ میں وقت ضائع نہ کرنا میں پڑھا دوں گا۔ کون کون سے مصنف ہیں؟'' میں نے دو ایک کے نام لیے تو بولے۔ ''لاحول ولاقوۃ، میں نہ پڑھاؤں گا کلاس ہی میں پڑھ لینا!''

کم لوگوں کو فارسی کے کلاسیکی (Classical) ادب پر اتنا عبور ہو گا جتنا مولانا سہیل کو تھا۔ جن لوگوں نے فارسی میں ایم۔ اے لے رکھا تھا اور مولانا کے دوست یا عقیدت مند تھے اُن کو خاقانؔی اور عرفؔی کے قصائد مولانا پڑھایا کرتے۔ وہ بھی اس طور پر کہ جاڑے کا موسم اور رات کا وقت ہوتا۔ مولانا سردی سے گھبراتے تھے اس لیے سر سے پاؤں تک اُون اور روئی میں ملفوف لیٹے رہتے اور لحاف کے اندر سے بلا کسی تامّل کے یا دوبارہ شعر پڑھائے بغیر مطلب بیان کرتے جاتے۔ یہی نہیں، بلکہ جہاں کہیں کتابت یا طباعت کی غلطی ہوتی اس کی تصحیح بھی کرتے جاتے۔ کوئی بات خواہ مخواہ یا بے تکی کہی گئی ہوتی تو مطلب بیان کر کے لاحول بھی پڑھ دیتے۔ غالبؔ، عرفؔی اور نظیرؔی کی شاعری کے نکات اور نزاکتیں واضح کرنے میں مولانا کو کمال تھا جہاں تہاں مماثل اشعار علامہ شبلی کے سناتے جاتے!

ذہن کی درّاکی میں سہیل صاحب کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے، سوا ذاکر صاحب کے، گو دبی زبان سے یہ بھی کہہ دیا کرتے کہ یہ مولانا کی مسلسل خرابی صحت کے باعث تھا۔

شاعری میں علامہ شبلی کا اور تفہیم قرآن میں مولانا حمید الدین فراہی[1] کا نام بڑے احترام سے لیتے۔ ذاکر صاحب اور میں مولانا کے ساتھ کالج میں کم وبیش چار سال رہے۔ دن رات کا اُٹھنا بیٹھنا، کھانا، بات چیت، سیر سفر، رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک رہے۔ گفتگو یا مباحثے میں فارسی اور اردو کے سربرآوردہ شعرا کے چیدہ اشعار مولانا کی زبان پر اتنے برمحل آتے کہ اکثر شعر ہی سُن کر محفل کا رنگ بدل جاتا!

یونین میں ایک موضوع پر دیر تک جوشیلی تقریریں ہوتی رہیں۔ مولانا سہیل بغیر درخواست اور اصرار کے تقریر نہیں کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کا بھی یہی دستور تھا، اصرار بڑھا تو مولانا آمادہ ہو گئے۔ تقریر اس شعر سے شروع ہوئی۔

قمریاں پاس غلط کردۂ خود می دارند[2] ورنہ یک سرو دریں باغ باندام تو نیست!

اردو کا کیا ذکر طلبا میں فارسی کے ایسے اور اتنے سخن فہم موجود تھے کہ شعر سنتے ہی واہ، واہ سے مجلس گونج اُٹھی کیوں کہ بحث میں حصہ لینے والوں پر یہ شعر بڑی خوبی سے چسپاں ہوتا تھا۔ اس پر تقریباً آدھے گھنٹے تک مولانا کی کبھی حکیمانہ، کبھی شاعرانہ تقریر، یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آج جیسی پُر لطف اور پُر مغز تقریر یونین میں کبھی نہ ہوئی ہو!

اسی طرح کا ایک اور واقعہ یاد آتا ہے ایک موضوع کی مخالفت میں بڑے مزے کی تقریریں ہوئیں۔ محرک کالج کے ''سروقداں، سیم تناں'' میں شمار ہوتے تھے۔ اُن کی تائید میں غالباً کوئی تقریر نہیں ہوئی یا ہوئی بھی تو بہت معمولی درجے کی۔ لوگ تفریحاً طرح طرح کے آوازے کسنے لگے۔ خلافِ معمول مولانا نے تقریر کی اجازت مانگی اور محرک کی تائید کرنے ڈائس پر آئے اور شروع اس شعر سے کیا:

---

1 مولانا حمید الدین فراہی 1862 میں ایک گاؤں فریہا میں پیدا ہوئے یہ گاؤں اعظم گڑھ کے شمال میں واقع ہے۔ ملاحظہ کیجیے، مولانا حمید الدین فراہی از عبید اللہ فہد فکر ونظر علی گڑھ۔ نام وران علی گڑھ حصہ سوم ص:9، جلد:24، جنوری 1987 تا جولائی 1988۔

2 قمریوں کی یہ محض غلط فہمی ہے کہ باغ کے سرو کی گرویدہ بنی ہوئی ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ باغ میں ایک بھی سرو، تمہارے قد وقامت کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

دلم بہ پاکئی دامانِ غنچہ می لرزد[1] کہ بُلبلاں ہمہ مستند و باغ باں تنہا!

حاضرین سے نعرۂ تحسین بلند ہوا۔ دیر تک یہ عالم رہا۔ رائے شماری ہوئی تو قریب قریب سب کے ہاتھ محرک کی تائید میں اُٹھے۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے غالبؔ، عرفیؔ اور نظیریؔ کے مولانا بڑے قائل تھے۔ اُن کے اور دوسرے اساتذہ کے اتنے اچھے اشعار ہم سب کو سناتے اور ان کی خوبیوں کو اس مبصرانہ اور دل نشیں انداز سے واضح کرتے کہ محسوس ہونے لگتا جیسے شعر و ادب کا ذوق رکھنا بہت بڑی نعمت تھی! ظہوریؔ کی نثر اور ذوقؔ کی شاعری پسند نہ تھی۔ اس زمانے میں ذوقؔ اور غالبؔ کے حلقے قائم ہو گئے تھے۔ جہاں ایک کی خامی اور دوسرے کی خوبی پر بڑے شدّ و مد سے بحث ہوا کرتی۔ مولانا نے وقتاً فوقتاً ذوقؔ کی ایسی کڑی اور کبھی کبھی استہزائی اور تفریحی تنقید کی اور غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کا سکہ بٹھایا کہ کالج میں ذوقؔ کا کوئی حمایتی نہ رہا اور جو کبھی تھا بھی وہ منہ چھپاتا پھرتا!

شعر و ادب کے معاملے میں ذرا بھی بدمذاقی[2] دیکھی یا ساتھیوں کی زبان سے کوئی ایسا فقرہ نکل گیا جس میں زبان کی غلطی یا ذوقؔ کی پستی پائی جاتی تو فوراً ٹوک دیتے خفا کبھی نہ ہوئے اور جو باتیں سکھانے بتانے کی ہوتیں ان کو طرح طرح سے ذہن نشیں کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کی ذہانت کی بے اختیار داد اُس وقت دینی پڑتی تھی جب وہ کسی دقیق مسئلہ کو کسی بڑی ہی معمولی یا مضحک مثال سے واضح کر دیتے تھے۔ عرفیؔ کی طرح مولانا کی بھی اُفتادِ طبع ''سینئر شکنی'' تھی اسی سبب سے وہ علم و ادب کے ''منصب داروں'' یا ''سجادہ نشینوں'' میں مقبول نہ تھے!

کچھ لوگ مولانا سے غزل لکھوا کر مشاعرے میں پڑھتے تھے۔ یہ ہمیشہ ہر جگہ ہوتا آیا ہے۔ ایسے حضرات مولانا سے وعدہ لے لیتے تھے کہ جس مشاعرے میں وہ غزل پڑھی جائے گی، مولانا

---

1 میرا دل غنچے کی پاک دامنی کے سبب لرزیدہ ہے، جب کہ صورتِ حال یہ ہے کہ بلبل مست ہیں اور باغباں تنہا رہ گیا ہے۔

2 مولانا نے ایک بار فرمایا۔ سجاد انصاری کہا کرتے تھے کہ ''اگر پڑھے لکھے شخص سے شعر و ادب کے بارے میں کوئی زیادتی وقوع میں آئے تو اُسے نالائقی، کہنا چاہیے۔ ملّا مولویوں سے ہو تو بدتوفیقی، اور عام لوگوں سے ہو تو بدمذاقی۔''

اس میں شرکت نہ فرمائیں گے۔ اس لیے کہ اکثر ہوتا یہ کہ مولانا اُس غزل کے متعلق کچھ ایسے فقرے بے خبری یا بے اختیار میں فرما جاتے کہ پڑھنے والے کا بھانڈا پھوٹ جاتا، اس سلسلے میں ایک صاحب نے جو مولانا کے دوست بھی تھے، مولانا سے اچھا مذاق کیا۔ انجمن حدیقۃ الشعر کی طرف سے یونین میں مشاعرہ منعقد ہونے والا تھا۔ یہ صاحب مولانا سے ایک غزل اپنے لیے لکھوا کر لے گئے۔ باری آئی تو پڑھنے سے پہلے ادھر اُدھر نیچے اُوپر دیکھنے لگے۔ جیسے کسی کی تلاش مقصود تھی، صدر نے دریافت کیا کہ معاملہ کیا تھا تو بولے۔ ''حضور والا دیکھ رہا ہوں مولانا سہیل تو نہیں موجود ہیں!'' سب سمجھ گئے اور یک بارگی بڑے زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ تھوڑی دیر بعد خاموشی کا تسلط ہونے لگا، تو صدر نے فرمایا۔ ''آج کا مشاعرہ —— صاحب کے ہاتھ رہا!'' اس پر پہلے سے بھی زیادہ زور کا قہقہہ بلند ہوا!

مولانا نیز ہم سب کو ذاکر صاحب مغرب کے جدید علوم اور نظریوں سے آشنا رکھتے تھے، لیٹن لائبریری، یونین اور معلوم نہیں اور کہاں کہاں سے نئی نئی باتیں اور نئے نئے اشعار یاد کرلاتے اور ہم سب کو سناتے۔ ان پر مولانا تبصرہ کرتے اور صلے میں ہم سب کے لیے بہ طیب خاطر اور کبھی بادل ناخواستہ خوانچے والوں سے پھل، فیرنی یا کباب خرید دیتے! شعر و ادب کا صحیح و صالح ذوق پیدا کرنے، تنقید کا علمی انداز عام کرنے نیز گفتگو اور روزمرّہ کے مشاغل کے آداب میں شائستگی ملحوظ رکھنے کی مولانا نے ایک روایت قائم کردی تھی!

انگریزی حکومت، انگریزی طور طریقوں اور خود انگریزوں سے ہمیشہ بے زار رہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ بے زاری ان کی فطرت میں داخل ہوگئی ہو۔ سبب یہ تھا کہ غدر کے بعد مسلمان علما اور شرفا پر انگریزی حکومت نے جو ستم ڈھائے اُس کا اُن پر بہت اثر تھا اس طرح کے واقعات کبھی کبھی بڑی حسرت والم سے سناتے۔ اردو شاعری کو سیاسی نظمیں شبلی اور ظفر علی خاں نے دیں، لیکن غزل میں سیاسی طنز کے نوک ونشتر سہیل کا عطیہ ہے۔ مولانا محمد علی کی غزلوں میں بھی یہ رنگ جھلکتا ہے۔ سہیل میں یہ بات شبلی سے آئی۔ لیکن نشتریت کا التزام ارادی اور شعوری طور پر جتنا سہیل کی غزلوں میں ہے اتنا نہ شبلی کے یہاں ہے، نہ محمد علی یا حسرت کے ہاں!

وطن، خاندان، ماحول، معتقدات، تعلیم وتربیت، رہن سہن کے اعتبار سے مولانا قطعاً مشرقی اور مذہبی واقع ہوئے تھے۔ بہ ایں ہمہ علمی مسائل کو علمی نقطۂ نظر سے دیکھنے پرکھنے یا

شعر وادب میں اصلاح وترقی کے رُجحانات کو پہچاننے اور اس کی تائید کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ ہر مسئلے پر اظہارِ خیال کرنے میں اس کا لحاظ رکھتے کہ نقطۂ نظر وہ ہو جس کا مسئلہ مطالبہ کرتا ہو نہ یہ کہ ہم آپ کیا چاہتے ہیں!

ایک دن مولانا نے مجھے ساتھ لیا۔ فرمایا، ''چلو تم کو دلّی کی زبان سنواؤں۔'' چنانچہ ساتھ ہولیا، کچھ دیر تک تُچی پَچی بارکوں کے غلط کمروں میں اعتماد کے ساتھ داخل ہوتے رہے جیسے وہ کمرے اور اس میں رہنے والے مدت سے جانے پہچانے ہوئے تھے۔ مولانا کو دیکھ کر کمرے کا رہنے والا تعظیماً کھڑا ہو جاتا تو مولانا لاحول پڑھتے ہوئے فوراً باہر آ جاتے۔ یہ بتانا دشوار ہے کہ مولانا ارادتاً اپنی غلطی پر لاحول بھیجتے یا اضطراراً کمرے والے پر!

مولانا نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''بھئی آغا حیدر، ان کو دلّی کی زبان سنوانے لایا ہوں۔'' فجّی صاحب نے کہا۔ '' آغا دہلی کے شرفا اور خواتین کی زبان، کرخنداروں کی نہیں!'' اس زمانے میں مولانا سہیل کا کسی سے فرمائش کر دینا کہ ''عرضِ ہنر کرو'' مخاطب کی بڑی عزّت افزائی تھی، یوں بھی آغا حیدر حسن مولانا کا بڑا احترام کرتے تھے۔

نومبر 1959 میں مولانا جوارِ رحمت میں پہنچ گئے! کس قدر شفیق و شریف النفس، کیسا ذہین و ذی علم اور فارسی شعر وادب کا کس پائے کا باکمال ہم سے رُخصت ہو گیا۔ دوستوں کے لیے اُن کے دل میں کتنی وسعت، کتنی نرمی اور نوازش تھی۔ کیسی کیسی خوش گوار یادیں، شوخ بھی شریفانہ بھی، نئی پُرانی ہمیشہ تازہ رہنے والی یادیں مرحوم سے وابستہ ہیں۔

اپنے نیازمندوں میں مولانا نے جن دو چار کو تادمِ آخر، تقریباً چالیس سال تک، عزیز و محترم رکھا، ان میں ایک راقم السطور بھی تھا۔ مجھے تو وہ جیسے کسی حال میں متردّد یا مایوس نہ دیکھ سکتے ہوں اور ہر طبقے سے جو اُن کے بس میں ہوتا خوش کرنے یا تسکین و تقویت پہنچانے کی کوشش کرتے۔ مرحوم کے اِردگرد جتنے لوگ تھے، خواہ اپنے ہوں یا پرائے، اُن سے کوئی پوچھے کہ مرحوم کی مفارقت سے اُن پر کیا گزری! مرحوم تو اُٹھ گئے، اُن کی یادوں کے حزیں اور رہ رہ کر اُمنڈنے والے انبوہ کو کہاں لے جاؤں، کیسے بھلاؤں یا اُن کو کیا جواب دوں!

(نگار لکھنؤ، اکتوبر 1953۔ مشمولہ مضامینِ رشید، مکتبہ جامعہ، 1991) ●●●

صدیق مرحوم
(صدیق احمد صدیقی)

صدیق احمد صدیقی کا تعلق سندیلہ سے تھا۔ اُن کا شمار علی گڑھ کے ذہین طلبا میں ہوتا تھا۔ وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے۔

تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔ قائداعظم محمد علی جناح کی وفات پر کمنٹری کے ذریعہ پوری قوم کو رُلا دیا۔

وہ لندن چلے گئے اور بی۔ بی۔ سی اردو سروس سے منسلک ہو گئے، اور ایک ادبی انجمن حلقۂ ارباب ذوق قائم کی۔ لندن میں اُن کا گھر علی گڑھ والوں کے لیے ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اکثر مشاعرے اور ادبی مجلسیں برپا ہوتی تھیں۔

13 ستمبر 1958 کو اُن کا انتقال ہوا۔ مرتب

o

صدیق احمد صدیقی کا لندن میں دفعتاً انتقال ہوگیا۔ جہاں وہ بیوی بچوں کے ساتھ عزّت، عافیت اور فراغت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ انھیں کے ساتھ نہیں، اپنے کتنے ایسے دوستوں کے ساتھ جو اُن کے گھر میں اُن کے آس پاس اور ان سے دور اور بہت دور بستے تھے! ایسی وابستگی ان کو دوستوں سے اور دوستوں کو اُن سے تھی!

ابتدائی تعلیم ندوہ میں ہوئی۔ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ سے انٹرنس کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی آ گئے۔ 1938 میں اُردو میں آنرز اور 1940 میں ایم۔ اے فرسٹ ڈویژن میں کیا۔ اس درمیان میں مکتبہ جامعہ دہلی سے بھی منسلک رہے۔ 37-1936 میں مسلم یونیورسٹی یونین کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ وائس پریسیڈنٹ (اب پریسیڈنٹ) بھی ہو جاتے اگر سیاسی فضا یکسر منقلب نہ ہو جاتی۔ انجمن اردوئے معلیٰ کے بھی سکریٹری رہے۔ بحیثیت طالب علم ماریسن کورٹ، آفتاب ہوسٹل اور ممتاز ہاؤس میں قیام رہا۔ کچھ دنوں ظفر عمر مرحوم[1] کے ساتھ ''علی گڑھ گزٹ'' میں بھی ایڈیٹری کی خدمات انجام دیں اور ٹیوشن بھی کرتے رہے۔ غالباً 1941 میں ڈیلی کالج اندور میں اردو کے لیکچرار ہو گئے۔ ملک کے تقسیم ہونے تک وہیں رہے۔ پھر پاکستان چلے گئے۔ وہاں کے مختلف نشیب و فراز (فراز کم نشیب زیادہ) سے گزرتے ہوئے بالآخر بی بی سی لندن کے پاکستان سیکشن میں 1949 میں ملازم ہو گئے اور وہیں سفرِ آخرت پیش آ گیا۔

---

1 ظفر عمر، جاسوسی ناولوں 'نیلی چھتری'، 'بہرام کی گرفتاری'، وغیرہ کے مصنف۔

لندن میں وہ پاکستان و ہندوستان بالخصوص علی گڑھ والوں کا ماویٰ وملجا تھے۔ کیا تعجب اوروں کے بھی رہے ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی لندن سے گزرے، صدیق احمد صدیقی کی محبت و مدارات سے خوش وقت ہونے کے لیے ان کے ہاں ضرور پہنچتا۔ ایسے لوگ بھی پہنچ جاتے جو مالی یا کسی اور دُشواری میں مبتلا ہوتے۔ صدیقی وہ سب کرتے جو کر سکتے تھے۔ خاص کر طالب علموں کے لیے اُن کا دل اور اُن کے گھر کا دروازہ ان کے ہر دوست کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ جیسے لندن کا وہ مشہور ہسپتال جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا صدر دروازہ افتتاح کے دن کھلا تو آج کئی سو سال سے بند نہیں ہوا۔

علی گڑھ والوں میں سے کوئی لندن سے آتا تو قبل اس کے کہ میں پوچھتا کہ صدیقی سے ملاقات ہوئی یا نہیں، وہ خود اُن کی محبت و مدارات کا ذکر کرنے لگتا جیسے اس ذکر کرنے میں دیر لگا دی تو وہ کسی فروگذاشت کا مرتکب ہو جائے گا۔ صدیقی کی وفات کا صدمہ ان کے علی گڑھ کے دوستوں پر کیسا ہوا اس کا اندازہ وہ نہیں کر سکتا جس نے اُن کے ساتھ نہ علی گڑھ کا زمانہ گزارا ہو نہ لندن کا، اردو کے اچھے مقرر تھے، بولنے کا انداز مولانا آزاد سبحانی کا تھا۔ بعد کے نہیں بالکل ابتدا کے آزاد سبحانی کا۔ کبھی مزے یا جوش میں آکر بات کرنے لگتے تو معلوم ہوتا، جیسے تقریر کرنے لگے ہوں۔

علی گڑھ میں طلبا کی شخصیت کا نشو و نما کلاس روم میں نہیں، بورڈنگ ہاؤس میں ہوتا ہے۔ کلاس کے ساتھی ایک دوسرے سے اتنے آشنا نہیں ہوتے جتنے بورڈنگ ہاؤس کے ساتھی اسی سبب سے بورڈر کا درجہ ڈے اسکالر سے ممتاز سمجھا گیا۔ اچھے ڈویژن میں پاس ہونے اور پوزیشن لانے کی بھی علی گڑھ میں بڑی منزلت رہی ہے اور بڑے بڑے ''گرینڈی'' یا ''شورہ پُشت'' ان کا احترام کرتے تھے۔ اوّل الذکر دونوں کی کمان اُترتے بارہا علی گڑھ میں دیکھی لیکن اچھے اسکالر اور اچھے کھلاڑی کا درجہ ہمیشہ جوں کا توں اُونچا رہا۔ تاوقتیکہ انھوں نے اپنے آپ کو لیڈری کے چکّر میں نہ ڈال دیا۔

صدیقی شروع سے آخر تک لیڈر رہے۔ پڑھنے لکھنے میں بھی ممتاز تھے۔ طبّاع اور ذہین ہونے کے علاوہ، یا اس کے باوجود، مخلص اور شریف النفس تھے۔ ساتھیوں کی طرح طرح

سے حمایت اور دل داری کرتے تھے۔ ضرورت دیکھتے تو کبھی کبھی ان کو اپنی اہمیت کا بھی احساس دلا دیتے تھے۔ تمام یونیورسٹی میں ''چچا صدیق'' کہلاتے تھے۔ مذاق سے نہیں پیار اور اخلاص سے۔ ان کے ساتھی کہتے تھے کہ صدیقی ساتھ نہ ہوتے تو نہ بزم میں مزا آتا نہ رزم میں۔ لیڈر ہونے کے سبب سے اتھارٹیز اُن سے چوکنے ضرور رہتے، لیکن ان کا خیال بھی بہت کرتے تھے۔ اس لیے کہ جانتے تھے کہ یہ ان کی لیڈری تھی۔ وہ کسی کی چاکری میں لیڈری پر فائز نہیں ہوئے تھے اس لیے ہمیشہ قابلِ اعتبار رہے۔ یہی سبب ہے کہ لیڈر ہونے کے باوجود وہ علی گڑھ کی بدنامی کا باعث کبھی نہیں ہوئے۔

اپنے اُستادوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ یہ بات اُن میں خاندانی تربیت اور روایات سے آئی تھی۔ پُرانے مسلمان گھرانوں میں اب بھی بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کی دل داری شرافت کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ مجھ سے بہت مانوس تھے اور کچھ ''سجدۂ مرشد'' قسم کے آداب ملحوظ رکھتے تھے۔ جس سے میں بہت گھبراتا ہوں۔ یہ اس لیے کہ خود میری نظر میں کوئی کتنا ہی محترم اور محبوب کیوں نہ ہو، میں اس طرح کے آداب برتنے پر اپنے آپ کو کبھی نہیں آمادہ کرسکتا تاوقتیکہ میرا مقصد اس کا مذاق اُڑانا یا تضحیک نہ ہو!

چنانچہ ایک دفعہ مجھے کہنا پڑا۔ ''صدیق صاحب میں جون پور کا رہنے والا ضرور ہوں، لیکن وہاں کے 'ملاّ ٹولے' سے دور دور کا واسطہ نہیں۔ ماشاء اللہ آپ بھی کچھ ایسے غیر ضروری طور پر 'خوش عقیدہ' مسلمان نہیں معلوم ہوتے۔ پھر آپ کے میرے تعلقات ایسے ناسزا کیوں ہوں!'' مسکرائے، یہ حربہ وہ بڑی کثرت اور اتنے ہی کاری طور پر استعمال کیا کرتے تھے، کہنے لگے بات 'ملاّ ٹولے' اور 'خوش عقیدگی' کی ہو یا نہ ہو 'نفس' اور 'نکہتِ گل' کی ضرور ہے۔ کیا کروں اب نہ ایسے لوگ ملتے ہیں، نہ ایسی جگہ جہاں شرفا کے آداب ملحوظ رکھنے کی آرزو پوری کرسکوں۔ ایک اپنی یہ یونیورسٹی اور اساتذہ رہ گئے ہیں وہاں آپ یہ فرماتے ہیں!'' میں نے کہا۔ ''آپ کی آرزو بڑی مستحسن ہے لیکن کسی بات کو مستحسن یا غیر مستحسن قرار دینے میں آپ کو جو برمحل فارمولا بنا لینے کی مشق ہے اس سے ڈرتا ہوں اور آپ کو بھی ڈرانا چاہتا ہوں۔ اپنی یونیورسٹی میں بھی آدمی کا انتخاب کرنے میں احتیاط برت لیا کیجیے تو کیا ہرج؟''

جیسا کہ کہہ آیا ہوں صدیقی بڑے ذہین نوجوان تھے۔ ان کو اپنی بات منوا لینے کا ڈھب آتا تھا۔ صورتِ حال کیسی ہی نازک یا پیچیدہ کیوں نہ ہو، وہ اس پر قابو پا لیتے تھے۔ اس میں ان کے خلوص اور خدمت کرنے کے جذبے کے علاوہ ان کی طبع سلیم اور فہمِ رسا کو بھی بڑا دخل تھا۔ ایسے مواقع پر بھی زِچ ہوتے تو پھر 'داؤ پیچ' کر جاتے! اربابِ پولیس اور ریڈیو کا جن لوگوں (مجرم یا آرٹسٹ) سے سابقہ ہوتا ہے ان کو قابو میں لانا اور رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ صدیقی اپنے طرح طرح کے ''ججمانوں' سے نباہ بھی خوب کرتے اور نبٹتے بھی خوب تھے۔ جیسے وہ اسی طرح کے کام کے لیے خلق ہوئے ہوں۔

صدیق احمد صدیقی کے کسی طرح ابھی مرنے کے دن نہ تھے۔ اپنی کتنی ہی فطری اور اکتسابی اچھی صلاحیتوں سے وہ دوسروں کو بہت دنوں تک فائدے پہنچا سکتے تھے اور خود بھی زندگی کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو سکتے تھے جس کے وہ یقیناً مستحق تھے۔ خدا جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

(مطبوعہ۔ ماہِ نو، کراچی، نومبر 1958)

●●●

جواہر لعل نہرو

(1889-1964)

جواہر لعل نہرو 1889 میں الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، اور بیرسٹری کی ڈگری لے کر 1912 میں ہندوستان واپس آئے۔ گاندھی جی سے رابطہ قائم ہوا۔ ہوم رول لیگ میں شامل ہوئے۔ 1919 میں جلیانوالہ باغ کا خونی حادثہ اور قتلِ عام سے حکومت برطانیہ کے مخالفت اور نان کوآپریشن تحریک کی تنظیم کے جرم میں قید کر لیے گئے۔ 1931 سے 1945 تک سیاسی تحریک کے سلسلہ میں متعدد بار جیل گئے۔

انڈین نیشنل کانگریس کے سکریٹری کے عہدہ پر کئی سال تک کام کیا۔ کانگریس کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ 1947 کی عبوری حکومت کی منتقلی کی تشکیل کر کے انھوں نے اقتدار کی منتقلی میں آخری گفت و شنید میں قائدانہ فرائض انجام دیے۔

15/اگست 1947 کو آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم ہوئے۔ ان کے دورِ اقتدار میں ملک نے بہت ترقی کی۔ 1964 میں فوت ہوئے۔

جواہر لعل نہرو نے اپنی تصنیف ''تلاشِ ہند'' میں سر سید احمد خاں کی عظیم خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری کا سنگِ بنیاد ان کے ہاتھوں رکھا گیا۔ ان کے نام پر یونیورسٹی کے میڈیکل کالج کا نام جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج رکھا گیا۔ مرتب o

ہجوم غم[1] میں نہیں کوئی تیرہ بختوں کا! پنڈت جی[2] ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔
موت آگے پیچھے سبھی کو آئے گی۔ اس سے زیادہ عام، یقینی اور غم ناک حادثہ کوئی دوسرا نہیں۔ سب سے زیادہ دردناک موت تو ذاتی طور پر اُن کی محسوس ہوتی ہے جن سے خون کا رشتہ ہو۔ اس کے بعد اُن کی جن سے خون کا نہیں احترام و عقیدت کا ہوتا ہے جنہوں نے دوسروں کی خاطر اپنی بہترین صلاحیتیں اور اپنی قیمتی سے قیمتی متاع وقف رکھی، جن کے فیض سے انسانوں کی چھوٹی بڑی جماعتوں میں یگانگت آئی۔ ایک دوسرے کے رنج و راحت اور نفع و نقصان میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جہالت، بھوک، بیماری، ذلت اور تنگ نظری سے چھٹکارا ہوا۔ ان کے بجائے فخر، فراغت اور مسرت سے ہم کنار ہوئے۔ علم اور سچائی کے پھیلانے، دوسروں کی خدمت کرنے اور ظلم و زیادتی سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔

پنڈت جی سے ہمارا یہی رشتہ تھا، کتنا پرانا اور کبھی نہ مٹنے والا رشتہ۔ ایک مدت تک اُن کو اور ان کے کاموں کو دیکھنے، ان کی باتیں سننے اور اُن اقدار و روایات کا لحاظ کرنے سے جو اُن کی ذات سے منسوب تھی، اگر ہم اُن سے خون کا سا رشتہ بھی محسوس کرنے لگے ہوں تو کیا عجب۔ اُن کی وفات پر درد و الم کا جو عالم دیکھا گیا اُس سے تو کچھ ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ ہر شخص اُن کو فرداً فرداً بالکل اپنے طور پر عزیز رکھتا تھا۔ بڑے پیمانے پر یہ امتیاز بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے۔

---

1. ہجوم غم میں نہیں کوئی تیرہ بختوں کا۔ کہاں ہے آج تو اے آفتاب نیم شبی (اصغر گونڈوی)

2. جواہر لعل نہرو تاریخ پیدائش 14 نومبر 1889 الٰہ آباد۔ تاریخ وفات 27 مئی 1964 دلی۔

مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو نے ہماری قومی اور اخلاقی زندگی کی تخلیق و تشکیل کی اور اس کو ایک ضمیر دیا۔ اتنے بڑے ملک کو جو اپنے اور دوسروں کے لائے ہوئے بے شمار دُکھ اور درماندگی میں مدت الایام سے مبتلا رہا یا رکھا گیا ہو، اس کو کم سے کم مدت میں عزت و اقتدار کے درجے پر پہنچا دینا انھیں دونوں برگزیدہ شخصیتوں کا کام تھا۔ آج جب کہ دونوں نہیں ہیں ہم کو واضح طور پر اس کا احساس ہو رہا ہے کہ ذمہ داری کے کام جو انھوں نے ہمارے لیے چھوڑے، اُن کے بجالانے میں ہم سے کیسی صریح غفلت ہوئی ہے!

ہندوستان کے علاوہ شاید ہی کسی اور ملک کو یکے بعد دیگرے اس قد و قامت کے دو بڑے راہ نما ملے ہوں، جیسے کہ یہ دونوں تھے۔ اتنے بڑے اور زار و زبوں ملک کی بڑی خوش نصیبی تھی کہ ایسا ہوا۔ لیکن یہ خوش نصیبی اسی وقت مفید اور مبارک ہوگی جب اس کو سچائی اور سرفروشی سے مستحکم کیا جائے اور آگے بڑھایا جائے۔ ورنہ اس خوش نصیبی میں خطرات بھی مضمر ہیں!

پنڈت جی گذشتہ نصف صدی تک ہماری قومی زندگی کے ایسے ایسے معرکوں سے اس بے جگری، خلوص اور کامیابی سے گزرے کہ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے ہر چیز دفعتاً وقوع میں آسکتی ہے، سوا پنڈت جی کی وفات کے۔ اعلیٰ شخصیتوں کی اعلیٰ خدمات کی ذہنوں پر ایسی گرفت ہوتی ہے کہ ہم ان کے ہوتے ہوئے کبھی کبھی فطرت کے اٹل قوانین کو بھی بھولنے لگتے ہیں۔ اچھے آدمیوں کے بارے میں ہم غیر شعوری طور پر یہ خیال قائم کر لیتے ہیں کہ شاید وہ ہمیشہ زندہ رہیں یا جلد نہیں مریں گے۔ اس کے برعکس بُرے اشخاص کے بارے میں یہ خیال آتا رہتا ہے کہ اُن سے جلد نجات مل جائے گی۔ نیکی اور بدی کا تصرف ذہنوں پر بالعموم ایسا ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ کرشمہ ہے ہماری اس خواہش کا کہ ایسا ہو یا ایسا نہ ہو، لیکن اس رمز کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ایسی خواہش پیدا ہی کیوں ہوتی ہے۔ خواہش یا ارادہ نیک اور بلند ہے تو اس کا سرچشمہ کوئی حقیقتِ اعلیٰ ہوگی۔

ریڈیو سے لمحے لمحے کی خبریں آتی رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم دنیا کے کسی اور خطے میں بیٹھے ہوئے ہندوستان کو ایک بھیانک بھونچال کی زد میں دیکھ رہے ہیں۔ ایک طرف یہ تھا، دوسری سمت ذہن میں پنڈت جی کے اوراقِ زندگی، کتنے بے شمار اوراق، تیزی و ترتیب سے

کھلتے جارہے تھے۔ انسانی تصوّر و تخیل بھی کیا ہوتا ہے، کوئی غیر معمولی بات پیش آ جائے تو ماضی کے واقعات خواہ وہ کتنے ہی دور یا پاس کے زمانے میں کیوں نہ گزرے ہوں، حال کے آئینے پر ایک مخصوص معنویت کے ساتھ منعکس ہونے لگتے ہیں۔ ایسا تو نہیں کہ ماضی، ماضی مطلق بن کر نہ رہ جاتا ہو بلکہ بہ شکلِ دگر حال میں دخل دینے اور اس پر اثر انداز ہونے کے لیے برابر ہمارے تعاقب میں رہتا ہو۔ ماضی اور حال کے تانے بانے میں انسانی تاثر اور تخیل جس طرح اور جس قسم کے گل بوٹے بناتا ہے وہ ایک پُر اسرار و فکر انگیز کرشمہ ہے جس کا تصوّر عالم اور عامی دونوں بہ قدرِ استعداد یکساں طور پر کر سکتے ہیں۔ یہ اس کرشمے کی مزید طرفگی ہے!

اس وقت پنڈت جی کی زندگی کا ایک خاص واقعہ یاد آ رہا ہے جس کو انھوں نے بڑے موثر اور سحر کارانہ انداز سے بیان کیا ہے۔ الفاظ یاد نہیں ہیں، سماں کا تصوّر و تصویر گڈمڈ ہو کر سامنے آ رہی ہے اور وہ مصرعہ یاد آ رہا ہے جو ہمارے ایک مشہور شاعر نے 'افسانۂ ہستی' سن کر کہا ہے یعنی "کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے، کچھ طرزِ ادا ہے"۔

اسیری کا زمانہ تھا۔ عالی خاندان، خوب صورت، نوجوان، نیک نہاد چہیتی بیوی لاعلاج مرض میں مبتلا، بھوالی کی صحت گاہ میں مقیم ہے۔ اس کو دیکھنے کے لیے اجازت مل گئی ہے۔ بھوالی کے سفر میں ہیں۔ مریضہ کی بیماری اور بے چارگی کا احساس بے قرار کیے ہوئے ہے۔ ملک اور قوم کو ہر طرح کی زبوں حالی سے نجات دینے کا چیلنج قبول کر چکے ہیں۔ پہاڑ کی بلندی، اس کا سکوت و ثبات، نشیب و فراز، کتنی بلندی کیسی پستی، درخت، جھاڑیاں، راستے، ان سب کا دم بہ دم ٹھنڈی نم آلود، کبھی دبیز کبھی ہلکی کہر کی چادر میں دیکھتے دیکھتے ملفوف اور پھر یک بہ یک نمودار ہو جانا، دل میں طرح طرح کے جذبات و خیالات کا ہجوم، ان کا عمل اور ردِ عمل، حال کو مستقبل کے لیے بہتر بنانے کی فکر، ذاتی، امیال و عواطف کی کشاکش، قومی ذمہ داری، اخلاقی تقاضے، غرض ذہن میں تضاد و توافق کا ایک جہان لیے ہوئے سرگرم سفر ہیں!

یہ تصویر ذہن میں آئی۔ پھر پنڈت جی کی زندگی کے وہ لیل و نہار آئے جب انھوں نے ہندوستان کے ماضی کو ایک معنی، اس کے حال کو سمت و رفتار دینے اور مستقبل کو مضبوط و مبارک بنانے میں اپنی بہتر سے بہتر استعداد اور وسائل سے دریغ نہ کیا۔ نہ کبھی دیکھا، نہ سوچا کہ

عمرِ گریزاں کے کیسے کیسے قیمتی لمحے، جسم و جان کے کتنے خوش گوار تقاضوں سے مستغنی یا محروم گزرتے چلے جارہے ہیں جو پھر لوٹ کر نہ آئیں گے.......

دفعتاً ریڈیو سے ایک دردناک لَے بلند ہوئی۔ تصوّرات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ یاد آیا کہ ہم کسی سانحے سے دوچار ہیں۔ پنڈت جی اس جہان سے رُخصت ہو چکے ہیں۔ عزیزوں، دوستوں، عقیدت مندوں اور ساتھیوں کی بے قراری، بے بسی اور مایوسی ذہن کے اُفق پر چھانے لگی۔ ریڈیو کمنٹری میں گزرے ہوئے حالات وحوادث کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ایسے مواقع پر ذہن بالعموم اسی طرح پر کام کرتا ہے۔ صرف کینوس کی وسعت اور نقوش کی بوقلمونی اور گراں مائیگی کا فرق ہوتا ہے۔ یہ تو نہیں کہتا کہ پنڈت جی کی زندگی کا اس طور پر نظارہ یا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایسی زندگی کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی ہوگی، لیکن اس میں شک نہیں ایسے سر آمدِ روز گار قوم اور ملک کو بڑے انتظار اور آزمائش کے بعد نصیب ہوتے ہیں!

پنڈت جی خاندان، مزاج، تعلیم وتربیت، رہن سہن، پسند ناپسند ہر اعتبار سے ارسٹوکریٹ (Aristocrat) تھے۔ ان میں ارسٹوکریٹ کی خوبیاں اور خامیاں دونوں تھیں۔ خامیاں کم خوبیاں زیادہ۔ تمام عمر عوام سے وابستگی، پھر مہاتما گاندھی کا تصرف (اور یہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں) ایسے عوامل تھے جن سے پنڈت جی کے طور طریق میں بڑی تبدیلی آگئی تھی۔ لیکن اکثر اس کا بھی احساس ہوا کہ پنڈت جی کا قلب مہاتما گاندھی کے ساتھ تھا لیکن فکر و ذہن کے اعتبار سے وہ خود مختار تھے!

ارسٹوکریٹ ہونے کی ایک سب سے بڑی خوبی جو اُن میں عمر کے آخر تک تازہ اور بیدار رہی یہ تھی کہ وہ کسی حال میں دوسرے اور تیسرے درجے کے لوگوں سے مفاہمت نہیں کر سکتے تھے۔ سستی شہرت حاصل کرنے پر وہ کبھی آمادہ نہ ہوئے جس کی وجہ سے اُن کی شہرت اکثر معرضِ خطر میں رہی اور دوسرے نام نہاد لیڈروں کا نام ونمود اور نان نفقہ بڑھتا رہا۔ پنڈت جی نے جو روایات قائم کردی تھیں اُن کو قائم رکھنا اور آگے بڑھانا بڑا مشکل مسئلہ تھا۔ اس لئے اس پر مسلسل قیاس آرائی ہو رہی تھی کہ پنڈت جی کے بعد اس صلیب کو کون اُٹھائے گا۔ چنانچہ رحلت کے بعد یہ نزاکت بعض نامسعود امکانات کے ساتھ سامنے آئی۔ یہ ہم سب کی خوش نصیبی

ہے کہ پنڈت جی کے آزمودہ اقدار اعلیٰ کی رہنمائی میں ہم اس مشکل مقام سے آسان گزر گئے گو بعض مبصروں کی یہ رائے بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ پنڈت جی کے جانشین کا مسئلہ اتنا مشکل نہیں ہے جتنا پنڈت جی کے جانشین کے جانشین کا۔

مسائل پر پنڈت جی کی نظر سائنٹفک بھی ہوتی اور اخلاقی بھی۔ وہ کسی مذہب کے پیرو نہ تھے لیکن سائنس، تاریخ ٹکنالوجی کسی کو اخلاقی، سماجی، بالفاظِ دیگر انسانیت کے تقاضوں سے علاحدہ نہیں سمجھتے تھے۔ تہذیب کی ناکامی اور ٹکنالوجی کی کامیابی کے اس دور میں جب انسانی دماغ حالات و واقعات سے اتنا واقف اور اُصول وحقائق سے اس درجہ ناآشنا ہے، پنڈت جی کا رویہ نہایت درجہ صحت مند و اُمید افزا تھا۔ پنڈت جی نے آج سے بہت پہلے اپنے بارے میں یہ لکھا تھا کہ ہندوستان کے مستقبل پر ان کا اثر اچھا بھی ہوسکتا تھا اور خراب بھی۔ کتنی صحیح بات کتنے پہلے کہہ دی تھی۔ ایک ارسٹوکریٹ کا اندازِ فکر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کے آٹوکریٹ یا ڈکٹیٹر ہوجانے کا ہمہ وقت امکان رہتا ہے۔ لیکن قدرتِ کاملہ کا یہ احسان ہے کہ اس نے ہندوستان اور پنڈت جی دونوں کو مہاتما گاندھی کے فیضانِ اثر میں دے دیا۔ سوچنے کی بات ہے کہ پنڈت جی مہاتما گاندھی کے روحانی و اخلاقی تصرف سے بے گانہ رہتے تو کیا ہوتے یا کیا ہوتا! پنڈت جی کو کتنے کیسے اور کہاں کہاں کے تقاضے کبھی علاحدہ علاحدہ کبھی ایک ساتھ اپنی طرف کھینچتے، کبھی ان سے ٹکراتے، لیکن خدا جانے ان میں کتنے طاقت ور اسپرنگ لگے ہوئے تھے یا کس چٹان میں ان کے پاؤں گڑے ہوئے تھے کہ حتی الوسع وہ کبھی راہ سے بے راہ نہ ہوئے۔

گاندھی جی نے آزادی عدم تشدد سے حاصل کی تھی لیکن تشدد ہی کا شکار ہوئے۔ قوم اور ملک کی امانت پنڈت جی کے سپرد ہوئی۔ اُن کو جس زمانہ، جن حالات اور جن لوگوں سے سابقہ ہوا وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ بین الاقوامی سیاست کے پیچ وخم سے قطع نظر جہاں شیطنت، ہوس یا حماقت کی ایک چنگاری سے سارا جہاں خاکستر ہوجاتا، خود ہندوستان کی آزادی مختلف و متضاد عناصر اور عوامل کی زد میں تھی، آج بھی ہے۔ یہ پنڈت جی کے بین الاقوامی وقار و اعتبار کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان نہ صرف ہر گزند سے محفوظ رہا بلکہ اقوامِ عالم کی صف میں اس کو ممتاز جگہ ملی۔ ظاہر ہے جو شخص زندگی میں اتنا محترم و معتبر تھا مرنے کے بعد کتنا محترم و معتبر ہو گیا ہوگا۔

پنڈت جی عالمی نقطۂ نظر سے سوچنے کے عادی تھے۔ ان کی نظر مختلف و متفرق حالات یا سانحات پر اتنی نہیں رہتی تھی جتنی اقوامِ عالم کی تقدیر پر۔ وہ سطحِ سمندر کی لہروں کو اتنی اہمیت نہیں دیتے تھے جتنا سمندر کی داخلی قوتوں اور بیرونی عوامل کو جو اُسے جُنبش میں لاتے تھے، وہ ادنیٰ آدمیوں اور ان کی ریشہ دوانیوں کو نا قابلِ التفات سمجھتے تھے۔ اس سے جہاں فائدہ ہوتا وہاں نقصان بھی پہنچ جاتا۔ پنڈت جی کو ایسے الیوں سے اکثر سابقہ رہا۔ پنڈت جی کی لیڈر شپ بہ درجہا زیادہ کامیاب ہوتی اگر ہندوستان بحیثیت مجموعی اس سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتا جتنا کہ اُن کو ملا تھا۔

پنڈت جی نے اپنی صاحب زادی کو بڑی شفقت سے خطوط کی شکل میں تاریخِ عالم کی دھوپ چھاؤں سے روشناس کرایا ہے۔ یہ تاریخ اُن کی علاحدہ ایک مستقل تصنیف بھی ہے۔ پنڈت جی کے نزدیک تاریخ ایک انجیل کی حیثیت رکھتی ہے جس میں اُمتوں کے لیے کھلی اور چھپی بے شمار نصیحتیں اور عبرتیں ملتی ہیں۔ اُن کی ادبی و علمی تحریروں میں بڑے ذہن کی کیسی اور کتنی حسین و عظیم تخلیقی صلاحیتیں نظر آتی ہیں۔ اُن تحریروں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ قلم سے کیا کیا اور کیسے کیسے کام لیے جا سکتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ کے بھی اور فنونِ سپہ گری کے بھی۔

میں تاریخ کا طالب علم کبھی نہیں رہا لیکن تاریخ کی بعض کتابیں پڑھی ہیں۔ پنڈت جی کی لکھی ہوئی تاریخ بھی۔ پنڈت جی نے تاریخِ عالم کا مطالعہ بڑی بلندی سے کیا ہے۔ ایسی بلندی سے جہاں سے حشرات الارض چھوٹے بڑے حیوانات، عمارتیں، متفرق مناظر اور اسی طرح کے حالات و حوادث تو کیا بسا اوقات دریا اور پہاڑ تک نظر نہ آئیں، اس کا فائدہ یہ ہے کہ حالات و حوادث پر حکم لگانے میں تعصب یا تنگ نظری کا لوث تک نہیں آنے پاتا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ:

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے![1]

تاریخ مطالعہ کی کوئی شاخ ہو اُس کا سمجھنا اور صحیح نتیجے پر پہنچنا آسان نہیں ہے اس لیے اور کہ صحیح تاریخ کا لکھنا سب سے زیادہ مشکل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخ لکھنے کے لیے ضروری

---

1. جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے! (غالب)

ہے کہ حالات و واقعات کا دور سے اور دیر سے مشاہدہ و مطالعہ کیا جائے تا کہ ذہن اُن حالات و حادثات سے متاثر نہ ہو جو وقتی اور ہنگامی ہوں۔ لیکن صحیح واقعہ تو وہی ہے جو ایک خاص وقت میں، خاص مقام پر، خاص حالات میں پیش آیا۔ بہت دور، بہت دیر یا بہت اونچائی سے دیکھنے میں تو حالات و واقعات اشخاص اور جائے وقوع سب نظر سے اوجھل ہو جائیں گے۔

یہی سبب ہے کہ تاریخ کے صحیح مطالعہ کے لیے تاریخ کے ابتدائی سے ابتدائی ماخذ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جہاں واقعات کی خبر ملتی ہے نہ کہ مورخین کرام کی فکر ونظر۔ کسی مشہور مصور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک تصویر بنانے سے قبل اس نے دعوتِ عام دی کہ جس کی تصویر بنانے والا ہوں اُسے آج سب لوگ اچھی طرح دیکھ لیں ورنہ کل سے وہ وہی دیکھیں گے جو میں بنادوں گا۔ ہر زمانے میں حاکموں نے مورّخوں سے اسی طرح کا کام لیا ہے اور اُن دونوں بزرگوں نے شاید ہی کسی علم سے اتنی بے تکلفی برتی ہو جتنی تاریخ سے۔

پنڈت جی کی تاریخی تصانیف میں تحقیق یا تنقید کی اتنی کارفرمائی نہ ملے گی جتنی تاثرات کی۔ یہی رنگ اُن کی دوسری تحریروں میں بھی کم و بیش ملتا ہے۔ علمائے فن تاثراتی اندازِ تحریر کو کتنا ہی نا قابلِ التفات قرار دیں اس اعتبار سے اس کا قصور ضرور معاف کیا جا سکتا ہے کہ اس میں جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر دکھانے کی گنجائش کم نکلتی ہے۔ پنڈت جی نری واقعہ نویسی کو اتنی اہمیت نہیں دیتے جتنی اُس مخفی نا قابلِ فہم و ناپیدا کنار نظامِ کائنات کو جس کے عوامل کی باہمی کشش و گریز یا عمل و ردِ عمل سے وہ واقعہ شہابِ ثاقب کی مانند ٹوٹ کر ہماری دنیا اور ہماری زندگی میں درآیا ہے۔ پنڈت جی کے سوچنے اور لکھنے میں ماورائیت یا غیر ارضیت کا یہ انداز ایک ایسے اخلاقی رجحان یا ذہنی اُفتاد کی نشان دہی کرتا ہے جس کو معلوم نہیں کیوں وہ اپنانے سے اجتناب کرتے ہیں۔ آرٹسٹ ہو، ادیب ہو، یا مفکّر وصوفی (پنڈت جی تحریروں میں ان سب کی جھلک جا بجا ملتی ہے) اپنے سے الگ اور بلند ہو کر زندگی کی حقیقت و مجاز پر نظر ڈالے گا تو اس کا تاثر یا تجربہ ویسا ہی ہوگا جیسا کہ پنڈت جی کے فکر و فن میں ملتا ہے۔

پنڈت جی سے کبھی شرفِ نیاز نہیں حاصل ہوا۔ صرف دو بار مسلم یونیورسٹی میں ایک دفعہ دوسرے مقام پر دور سے دیکھنے اور تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ عوام کے دلوں میں اُن کی اور عوام

کی پنڈت جی کے دل میں جو بے پایاں محبت و منزلت تھی اس کا مظاہرہ ایک بار آنکھوں سے دیکھا اور ایک جگہ اس کا ذکر پنڈت جی کی تحریروں میں نظر سے گزرا۔

جنرل الیکشن کی سرگرمیوں کے سلسلے میں ایک جگہ اپنی بے پایاں تگ و دَو کا ذکر بڑے موثر انداز میں کیا ہے۔ کانگریس کے اغراض و مقاصد سے عوام کو روشناس کرانے اور کانگریس کے اُمیدواروں کو کامیاب بنانے کی مہم پر روانہ ہوئے ہیں۔ دو عدد مائکروفون ہیں اور کچھ ساتھی دور دراز اجنبی دشوار گزار راستوں پر چلے جا رہے ہیں۔

''وہ خضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل''

کا نقشہ ہے، سواری کے لیے کہیں موٹر، کبھی گھوڑا، اکثر پیدل تھوڑی تھوڑی دور پر گاؤں والوں کا اجتماع آس پاس کی آبادی کے اعتبار سے کم یا زیادہ۔ صبح سے رات گئے تک موسم کی سختیاں جھیلنا، نفس کے عام مطالبات سے بے پروا، بغیر کسی اُکتاہٹ کے اشتیاق و انتظار میں بیٹھا ہوا۔ ہر جگہ ٹھہرنا، تقریر کرنا، غریب کسان اور مزدوروں میں اپنی محبت بانٹنا، ان کی دعائیں لینا اور آگے روانہ ہو جانا۔

اس ذکر کو آخر میں کچھ اس طرح کے الفاظ پر ختم کیا ہے۔ کھانے پینے آرام کرنے کی جگہ نہ موقع نہ فرصت، جتنی دیر کسی گاڑی میں بیٹھنے کو مل گیا نیند سے بے اختیار ہو کر غافل ہو گئے، تھوڑی ہی دیر میں پھر وہی استقبال، نعرے، دعا سلام اور روانگی۔ مقررہ پروگرام کی پابندی کا یہ حال تھا کہ ایک جگہ سات بجے شام کو تقریر کرنی تھی، پہنچا تو صبح صادق نمودار ہو رہی تھی!

دوسرا واقعہ جو سامنے گزرا یہ ہے۔ آزادی ملنے سے کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ رات کے دس بجے سے صبح پانچ بجے تک کا سفر تھا۔ پنڈت جی بھی اسی ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ گاڑی ایسی تھی جو بہت کم اسٹیشنوں پر رُکتی تھی۔ شروع سے آخر تک راستہ بھر ریلوے کے دونوں سمت عوام کا ہجوم پنڈت جی کے خیر مقدم میں نعرے لگاتا رہا، قطعاً اس سے بے خبر رہ کر کہ پنڈت جی کے دیدار کا کوئی امکان تھا بھی یا نہیں، یا پنڈت جی کے کانوں تک خیر مقدم کے نعروں کی آواز پہنچتی بھی تھی یا نہیں! صرف اتنا پتہ لگ گیا تھا کہ پنڈت جی گاڑی میں موجود تھے۔ گاڑی کے ٹھہرنے یا اس کے سُست رفتار ہو جانے کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔

دور اور نزدیک کے تقریباً تمام مرد عورت بچے جوان بوڑھے کھنچ کر چلے آتے تھے۔ نعرے اس زور سے بلند ہوتے کہ گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ ماند پڑ جاتی تھی۔ ''تا نہ پنداری کہ تنہا می روی'' کا ایسا نظارہ کس نے دیکھا ہوگا کتنے لاکھ آدمی رہے ہوں گے جو کم و بیش ڈیڑھ سو میل تک پنڈت جی کے خیر مقدم میں نعرے لگاتے اور اپنی خوشی اور فخر کا اظہار و اعلان کرنے کے لیے، بغیر کسی لالچ یا دباؤ کے سنسان جنگل، بیابان میں تمام رات کھڑے رہے ہوں گے۔ جیسے اپنے ہیرو کو کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے لا رہے ہوں۔

ریڈیو پر سنایا جا رہا ہے، پنڈت جی کی اَرتھی اُٹھائی گئی، مجمع فرطِ غم سے بے قابو اور بے قرار ہے۔ اَرتھی کا سفینہ جنتا کے اُمنڈتے ہوئے سمندر میں ہچکولے کھاتا چلا جا رہا ہے..... بے اختیار پنڈت جی کے رات دن کے وہ سفر یاد آ گئے جس کا ذکر کر آیا ہوں۔ آج وہ کس سفر پر کہاں جا رہے تھے!

پنڈت جی کی خاکستر (استھی) اسپیشل ٹرین سے دہلی سے الٰہ آباد لائی گئی جہاں اُسے گنگا جمنا اور سرسوتی کی ٹھنڈی شفاف مقدّس آغوش میں دے دیا گیا، جس طرح آج سے کم و بیش 74 رسال پہلے اسی الٰہ آباد میں انھیں دریاؤں کی فضا اور روایات میں خدا نے ان کو آغوشِ مادر میں دے دیا تھا۔ یہاں سے ان آبِ رواں فیض و فروغ کے ساتھ پنڈت جی کا آخری مادّی وجود اس عالمِ لازماں و لامکاں کے سفر پر روانہ ہو گیا جس کی

''نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم''

پنڈت جی نے ماں کی گود سے گنگا کی گود تک پہنچتے پہنچتے کیا کر دکھایا اس کا ذکر تو اُن کی وفات کے دن سے اب تک ہر چھوٹا بڑا، عالم، جاہل، مرد عورت اپنے اپنے طور پر، اپنی اپنی جگہ مسلسل کرتے رہے ہیں اور ایک نامعلوم مدت تک کرتے رہیں گے۔ اس وقت ایک قطعہ یا رُباعی یا دونوں یاد آ رہی ہے جو معلوم نہیں کب کیسے کسی سے سن کر یا کسی کتاب میں لکھا دیکھ کر ذہن میں محفوظ رہ گئی۔ بہت دنوں تک اس کی طرف توجہ نہ ہوئی، کبھی خیال گیا بھی تو یہ کہہ کر ٹال دیا، شعر ہی تو ہے جسے شاعر کہتے رہتے ہیں۔ ان کو اس کے سوا اور کرنے ہی کو کیا رہتا ہے۔ پنڈت جی کی وفات پر خلقِ اللہ کی بے قراری و بے بسی دیکھی، اس کا جو حال سُنا اور پڑھا تو یہ

اشعار یاد آ گئے ۔ پھر کچھ اس طرح کا احساس ہوا کہ شاعر بھی کیا چیز ہوتا ہے، بظاہر بیٹھا باتیں بناتا رہتا ہے لیکن جب کوئی معرکہ آن پڑتا ہے یا حادثہ گزر جاتا ہے تو اس کے شعر کا سہارا لیے بغیر کام نہیں بنتا۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوا کہ وحی والہام بھی شاید اس درجے نہ موثر ہوتے اگر پیغمبروں نے اپنے عمل میں اور شاعروں نے اپنے کلام میں ان کی تعبیر نہ کی ہوتی۔ اشعار ہیں:

یاد داری کہ وقت زادنِ تو
جملہ خنداں بُدند و تو گریاں
تو چُناں زی کہ وقتِ مُردنِ تو
جملہ گریاں شوند و تو خنداں! [1]

پنڈت جی نے ان اشعار کو سچ کر دکھایا۔

دہلی سے الٰہ آباد یہ اسپیشل ٹرین ماتمیوں کے جس بے اماں و بے کراں انبوہ سے گزری اور تمام رات گزار کر صبح دس بجے تک کم وبیش چار سو میل تک ٹرین کے ساتھ

وہ اُٹھا شورِ ماتم آخری دیدارِ میّت پر!

کا جو منظر دیکھا گیا تاریخِ عالم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ کسی کی جدائی کو بے ساختہ اس پیمانے پر کرب والم سے محسوس کرنا کہ اس کی مثال تاریخِ عالم میں نہ ملتی ہو، پنڈت جی کی بڑائی کی کتنی محکم دلیل ہے! انھوں نے خدمتِ وطن میں کیسے کیسے سفر کیے، کیسی مصیبتیں جھیلیں اور اب مراجعتِ وطن کس شان سے کر رہے ہیں، سوچیے۔ فخر کرنے اور انسان بننے کے اس میں کتنے اشارے ملتے ہیں۔

جس شخص نے اپنی قوم، اپنے ملک اور اپنے نصب العین کی خاطر ہر رنج و راحت، خوف و خطر، نفع و نقصان اور ننگ و نام سے منہ موڑ کر ہر طرح کی سختی فرض و فخر سمجھ کر ہنسی خوشی جھیلی ہو اور عہد کی سب سے عظیم اور برگزیدہ شخصیت مہاتما گاندھی کی رہنمائی و رفاقت میں مدتوں اس طرح کام کیا ہو کہ آج ہندِ جدید کی تشکیل و تعمیر میں دونوں کا نام ایک ساتھ یکساں احترام

---

1 تجھ کو یاد رکھنا چاہیے کہ تیری پیدائش کے وقت سب لوگ خوش ہو رہے تھے اور تو رو رہا تھا۔ تو ایسی زندگی بسر کر کہ جب مرے تو سب رو رہے ہوں اور تو ہنستا ہوا دنیا سے رُخصت ہو۔

سے لیا جاتا ہو، اس کی منزلت متعین کرنے میں مبالغے سے بھی کام لیا جائے جب بھی بیان کرنے کا حق ادا نہ ہوگا!

ہندوستان کو آزاد کرانے اور ترقی یافتہ اقوام اور ممالک کی صف میں ممتاز جگہ دلانے میں دو بظاہر مختلف لیکن دراصل ایک دوسرے سے تائید و تقویت حاصل کرنے والے عوامل ہیں۔ ایک گاندھی جی کی عظیم شخصیت جو قدیم ہندوستان کی اعلیٰ روایات واقدار کی امین وعَلم بردار تھی۔ دوسرا پنڈت جی کے عہد (سائنسی، صنعتی، مشینی) کے ٹکنیک اور تقاضوں سے آگہی اور اس پر یقین وعمل۔ جس ملک کو ان دو عوامل کی متفقہ کارفرمائی سے آزادی وسربلندی نصیب ہوئی ہو، ظاہر ہے اس کی آئندہ ترقی وتنزل کا مدار اُس پر ہوگا کہ اس کے سربراہوں نے اُن پر کہاں تک ایمان داری اور بے خوفی سے عمل کیا۔ کسی اور ملک وقوم کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے البتہ ہندوستان کی تاریخ وتقدیر کے پیشِ نظر یہ حقیقت بے اختیار سامنے آتی ہے کہ جب تک یہ دونوں قوتیں (گاندھی+نہرو) ساتھ ساتھ کام نہ کریں گی، ملک کو وہ فروغ نصیب نہ ہوگا جس کے ہم خواہاں ہیں۔

میں سیاسیات وسماجیات کے پیچ وخم سے واقف نہیں ہوں لیکن ایک عامی کی حیثیت سے غلط یا صحیح یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ ملک کا انتظام ہاتھ میں لیتے ہی کانگریس حکومت کا رُخ یک طرفہ ہوگیا۔ اقتصادی، سائنسی اور مشینی ترقی کے شان دار منصوبوں نے ہم کو اس درجہ اپنی طرف مائل کرلیا کہ ہم گاندھی جی کے بتائے ہوئے راستے کو رفتہ رفتہ نظر انداز کر گئے۔ اس کی وجہ سے بعض قباحتیں راہ پاگئیں جو پنڈت جی کی زبردست شخصیت کی وجہ سے سر نہ اُٹھا سکیں۔ ہماری دعا ہے کہ وہ کبھی نہ سر اُٹھا سکیں۔ پھر بھی ضرورت اس کی ہے کہ حکومت کے آئندہ پروگرام میں پنڈت جی کے مشینی وسائنسی (ماڈرن) جوشِ عمل کے ساتھ مہاتما گاندھی کے خانہ ساز مجربات (انصاف پرستی، انسانیت دوستی اور امن وآشتی) کو پیشِ نظر رکھا جائے اس لیے کہ:

پھر یہ غوغا ہے کہ لاساقی شرابِ خانہ ساز
دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش![1]

---

1. اقبالؔ

اور ''شرابِ خانہ ساز'' وہ ہے جس کی کشید اپنے کیف و سرمستی سے کی گئی ہو اور جس میں اپنا ہی ''آب و رنگ تشنہ لبی'' جھلکتا ہو نہ کہ دوسروں کا!

پنڈت جی اتنے دنوں تک ہم میں گھلے ملے اور ہمارے دُکھ درد میں شریک رہے اور تمام عمر ہر موقع پر ہر چھوٹے بڑے سے اس محبت و عزّت سے پیش آئے کہ ہم کو یہاں تک اس کا یقین ہو گیا تھا کہ پنڈت جی زندہ ہیں تو ہم پر آنچ نہ آنے دیں گے خواہ وہ حکومتِ ہندوستان کے وزیر اعظم رہیں بھی یا نہیں! سماج دشمن عناصر سے قطعِ نظر (جو کتنے ہی طاقت ور کیوں نہ ہو جائیں کبھی احترام کی نظر سے نہ دیکھے جائیں گے) ہر شخص خواہ وہ کہیں رہتا، بستا اور پنڈت جی سے کچھ بھی واقف ہو، اس امر کا قائل تھا کہ موصوف کی شخصی حیثیت ان کی منصبی حیثیت سے کہیں زیادہ بلند و محترم تھی۔ میرا تو خیال ہے کہ کسی لیڈر میں جب تک یہ صفت نہ ملے اس کو قوم کا سردار نہ تسلیم کرنا چاہیے، حکمرانی وہ نہیں ہے جو پولیس فوج اسلحہ اور بین الاقوامی دھڑے بندی کے زور پر کی جائے۔ حکمرانی یہ ہے کہ فردِ واحد (مردِ قلندر) بے منّت غیرے اپنی ذاتی خدمات اور خوبیوں کے طفیل بے شمار لوگوں (جن میں اپنے اور پرائے دونوں شامل ہوں) کے دلوں پر قابض و متصرّف ہو جیسے پنڈت جی تھے۔

شریف اور ستم زدہ کا بڑا سہارا تھے۔ اُس زمانے کے تھے جب ایسا ہونا والانسبی کا اوّلین تقاضا اور سب سے معتبر نشانی تھی۔ سب سے مشکل کام یہ ہے کہ بڑا ہو جانے پر کوئی شخص اپنے بد قسمت، کم حیثیت یا کس مپرس پُرانے ساتھیوں کا خیال رکھے۔ پنڈت جی کس خوشی سے بہ عجلت تمام کتنے رنجور شریفوں اور تنگ حال ساتھیوں کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔ جیسے کوئی جہاز سمندر میں دفعتہً کسی مصیبت میں پھنس جاتا ہے تو مدد کے لیے ادھر اُدھر (S.O.S) بھیجنے لگتا ہے۔ اس وقت جتنے پانی یا ہوا کے جہاز جہاں ہوتے ہیں سب کام چھوڑ کر بہ سرعت تمام ہر طرح کا سامان لے کر اس کی مدد کو پہنچ جاتے ہیں۔ یہی حال پنڈت جی کے غالباً ذاتی دفترِ انشا کا تھا جو درخواست پاتے ہی جیسے خود بخود کام کرنے لگتا ہو۔ وہ اپنے تنگ حال پُرانے ساتھیوں سے اس طرح ملتے جیسے تھوڑی دیر کے لیے اُس عہد میں پہنچ گئے ہوں جب دونوں اپنے اپنے مستقبل سے بے خبر یا بے نیاز ایک دوسرے کی رفاقت میں خوشی اور بے فکری کی زندگی بسر کرتے تھے۔

حصولِ آزادی کے بعد پنڈت جی کے عہدِ حکومت میں 17 رسال ہندوستان کو ہر جہت سے جلد سے جلد خوش حال، مضبوط و معتبر بنانے کے لیے جو منصوبے بنائے گئے اور ان کو کامیاب بنانے کے لیے جو تدابیر عمل میں لائی گئیں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئیں باوجود ناگزیر دُشواریوں اور شاید ناگزیر ہی بدعنوانیوں کے۔ اگر کانگریس اتنے دنوں تک پنڈت جی کی مسلسل قیادت میں برسرکار نہ رہتی تو ہندوستان کو وہ بلند درجہ نصیب نہ ہوتا جس پر آج ہم اس کو فائز دیکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جلد ہی دور و نزدیک کی تمام حکومتوں کو ہندوستان کی بے پایاں مستور طاقتوں، اس کے تعمیری عزائم، اس کے سیاسی مسلک (سیکولر جمہوریہ) اور ان سب کی روح رواں پنڈت جی کی عظیم شخصیت کا احساس ہوا اور انھوں نے ہندوستان کو دوست بنانے اور رکھنے کو اپنی اپنی حکومتوں کا اہم مقصد قرار دیا۔ حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں پنڈت جی کا نام جتنے لوگ جس احترام سے لیتے تھے شاید کسی دوسری سیاسی شخصیت کا نہ لیتے ہوں۔ یہ امتیاز پنڈت جی کے منصب کے طفیل اتنا نہ تھا جتنا ان کی ذاتی خوبیوں کی بنا پر۔

حکومتِ ہند کے تین سب سے اونچے مناصب (صدر، نائب صدر اور وزیر اعظم) اس وقت تین ایسی جامع حیثیات شخصیتوں کے ہاتھ میں تھیں جو مسلمہ طور پر ہندوستان کے بہترین قدیم و جدید کا سنگم اور تہذیب و شائستگی علم و فن، فکر و نظر اور نصب العین و روایات کی امین و علَم بردار تھیں جن کو بحیثیتِ مجموعی ہندوستان کا ضمیر کہا جاسکتا ہے۔ یقین سے نہیں کہہ سکتا پھر بھی یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ اس وقت شاید ہی کسی اور ملک کے سب سے اُونچے تین عہدہ داران تینوں مساوی حیثیت کے ہوں۔ ان کو کسی دوسرے ملک کا بڑے سے بڑا آدمی بھی بڑا مانے بغیر نہ رہے گا۔

کبھی دلّی جانا ہوتا ہے تو وہاں کا اژدہام، شور و غل، تگ و تاز، شان و شوکت، عیش و طرب، کارخانے طرح طرح کے خوب صورت اور قیمتی سامانوں سے لبریز دوکانیں، نئی پرانی عمارتیں، روشنی، شاہراہیں، ہوٹل، سرکاری لوازمات، تعلیم گاہیں، سینما گھر، سفارت خانے اور سیر گاہوں کے ساتھ ناداری و نامرادی، جہالت، بیماری، گندگی، جرائم و فتنہ فساد کا کاروبار پھیلا

دیکھ کر ڈرنے لگتا ہوں کہ کہیں کھو نہ جاؤں، کوئی گرفتار نہ کرلے، ٹرک یا ٹیکسی کچل نہ ڈالے یا زندہ باد و مردہ باد کے نعروں میں عقل، نقدی یا آبرو نہ کھو بیٹھوں!

پہلے کبھی جانے کا اتفاق ہوتا تو باوجود ہلچل اور ہنگامے کے دہلی کی تاریخی عظمت اور اس کا تہذیبی وقار جسم و جان پر اس طرح سایہ فگن ہو جاتا اور برابر رہتا کہ کسی وقت کہیں آنا جانا ہوتا تو غیر شعوری طور پر یہ محسوس ہوتا رہتا ہے کہ دہلی کو ہم نذرِ عقیدت پیش کر رہے ہیں اور وہ ہم کو ان تمام نوازشوں سے بہرہ مند کر رہی ہے جو صرف وہی کر سکتی تھی۔ دہلی کی طرف سے اب وہ اطمینان نہ رہا۔ دہلی اتنی بڑھ اور بدل چکی ہے کہ وہ ہم کو اب کسی طرب و طمانیت یا افتخار کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ دہلی مبہوت ہے۔ وہ اپنے کو بھلا چکی ہے۔ کبھی دل پر یاس کا غلبہ ہوتا ہے تو خیال آنے لگتا ہے کہ قدیم الایام سے دہلی تاراج اور آباد ہوتی رہی ہے، اب جب کہ وہ آباد ہونے سے تاراج ہوئی ہے دیکھئے کیا ہوتا ہے؟

لیکن دراصل کہنا یہ ہے کہ ادھر کبھی دہلی جاتا تو پنڈت جی، صدر اور نائب صدر کے برسرِ کار ہونے سے ایک طرح کا بھروسہ رہتا کہ ان کے اثر سے دہلی کے رہنے بسنے والوں میں شہری اور اخلاقی ذمہ داری کا اتنا شعور ضرور راسخ ہو گیا ہوگا کہ کسی کی آبرو یا جان و مال کو نقصان نہ پہنچایا جائے، نہ پہنچنے دیا جائے، یہ بھروسہ جتنا قدرتی ہے اتنا ہی مبارک ہے۔ اپنے سے بڑے اور بالآخر سب میں بڑے میں اعتقاد اور اس پر اعتماد ہی تو انسانی شرف و سعادت کا باعث ہوا ہے۔ پنڈت جی کے اُٹھ جانے سے اس بھروسے میں فرق آ گیا۔

پنڈت جی کی وفات پر جس شدت سے سارے ملک میں اور اس سے باہر بھی اظہار رنج و غم کیا گیا اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ وہ ''محشرستان بے قراری'' اب کسی قدر ماند پڑ چکا ہے۔ حادثہ کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو، نفس اپنے تقاضوں سے بے پرواہ رہنے کی کسی کو زیادہ مہلت نہیں دیتا۔ قومی پیمانے پر جو سوگ منایا جاتا ہے اس کے پیچھے ایک مقصد ہوتا ہے یعنی جس شخص یا سانحے کا ماتم منایا جائے اُس کی بازیافت یا تلافی کے لیے قوم ایک نئے عزم کے ساتھ اپنی پوری اخلاقی و تعمیری صلاحیتوں کو برسرِ کار لائے، ورنہ ''ماتم برائے ماتم'' تو ''ادب برائے ادب'' سے بھی زیادہ فعلِ عبث ہے اگر اس اظہارِ اندوہ و الم میں قوم اور ملک کی بھلائی اور برتری کے لیے ہم

سب کی دلیری، دانش مندی اور دردمندی بھی شامل ہے تو پنڈت جی کی وفات ہمارے لیے ان کے ''ظہورِنو'' کی بشارت ہے۔

پنڈت جی کی حیات ہیں ان کے ؎

گہے برطارمِ اعلیٰ نشینم
گہے برپشت پائے خود نہ بینم

کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا دشوار تھا۔ اب یہ کام آسان ہے اور ہماری فوری توجہ کا مستحق۔ موجودہ مرکزی کابینہ میں پنڈت نہرو جیسی مبہوت کردینے والی کوئی دوسری شخصیت نہیں ہے اور یہ اچھا ہے۔ ایسی شخصیتوں کا صرف گاہے بہ گاہے نمودار ہونا بہتر ہوتا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ موجودہ حکومت سر جوڑ کر کام کرنے والوں کی ایک مضبوط اور قابلِ قدر ٹیم ہے جو متفقہ سوجھ بوجھ، متفقہ ذمہ داری، متفقہ پامردی اور عام رواداری و انسانیت دوستی کو پیشِ نظر رکھ کر کام کرنے پر آمادہ ہوئی ہے۔ کام میں دیر لگے گی۔ عزّت، اعتبار اور عبادت کے کاموں میں یوں بھی دیر لگتی ہے۔

پنڈت جی کو کانگریس کے مسلک سے علاحدہ کر کے دیکھنا ہمارے آپ کے لیے مناسب و ممکن ہو یا نہیں، عوام ان کو اسی طرح دیکھتے تھے۔ یوں بھی آدمی، آدمی کو پہلے دیکھتا ہے، اُس کے مسلک اور مشن کو بعد میں۔ ہندوستان کے بے شمار عوام نے شروع سے اب تک کانگریس کو اتنا جانا اور پہچانا نہیں جتنا اس کے لیڈروں کو، جن میں سب سے سر برآوردہ اور ایک نامعلوم مدت تک عزّت و محبت سے یاد رکھے جانے والے مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو ہیں۔ ہر جنرل الیکشن میں اس بات کا واضح طور پر اظہار ہوتا کہ بحیثیت مجموعی عوام جتنے پنڈت جی کے فدائی ہیں اتنا نہ پنڈت جی کے مسلک سے واقف ہیں نہ اُس مسلک کے شیدائی!

پارٹی کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر لیڈر کی شخصیت پر ہوتا ہے۔ خاص طور پر ایسے ملکوں میں جہاں آزادی نہ ملی ہو یا آزادی ملے زیادہ دن نہ گزرے ہوں۔ یہ بات جتنی قدرتی ہے اتنی ہی آگے چل کر اندیشہ ناک بن جاتی ہے۔ کانگریس کو آخری دو لیڈر یکے بعد دیگرے ایسے ملے کہ عوام اور خواص دونوں کی نگاہیں ان پر جم کر رہ گئیں۔ اس طرح کانگریس کے بنیادی مقاصد کو

سمجھنے اور اس پر ایمان لانے کی طرف سے لوگ غافل ہوگئے۔ پنڈت جی کی وفات سے دفعتہً ایسا خلا پیدا ہوگیا جس پر قابو پانا آسان نہیں ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے معلوم نہیں کس کس سمت سے طوفان کے کیسے کیسے جھونکے اور جھٹکے آئیں۔ ایسے میں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ پنڈت جی اپنے مزاج کے اعتبار سے مہاتما گاندھی کے اتنے نمائندہ نہ تھے جتنا کانگریس کے۔ پنڈت جی کے بعد کانگریس کی قیادت ایسے ہاتھوں میں آئی ہے جس کا جھکاؤ گاندھی جی کے مسلک کی طرف ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو شاید پنڈت جی کا جانشین منتخب کرنے میں وہ اتفاقِ رائے اور اتحادِ خیال دیکھنے میں نہ آتا جو آیا اور یہ صورتِ حال یقیناً نیک فال ہے۔ ہندوستان تا حال روحانی اور اخلاقی قدروں پر ایمان رکھتا آیا ہے جس کو سب سے بڑی تائید مہاتما گاندھی کی قیادت سے ملی۔ پنڈت جی کا طریقِ فکر اور طرزِ عمل نژادِ نو اور جہانِ نو کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھا۔ یہ نہ کوئی نئی بات ہے نہ ڈرنے کی بات ہے۔ صرف ساز و سُتیز کا مسئلہ ہے۔

پنڈت جی کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے سرمایہ فراہم کیا جائے گا۔ یہ رقم کروڑوں تک پہنچے تو عجب نہیں۔ سمجھ دار اور وسیع النظر اصحاب سوچ بچار کر اس رقم کو رفاہِ خلق کے کاموں پر صَرف کرنے کا پروگرام بنائیں گے جس سے بڑے وسیع پیانے پر ہر چھوٹا بڑا فائدہ اُٹھائے گا۔ ملک کے خیر و برکت کے سرچشموں میں اضافہ ہوجائے گا، لیکن صرف اتنا کر دینے سے مہاتما گاندھی اور پنڈت جی کی یاد کو قائم رکھنے کا مقصد پورا نہ ہوگا۔ چھوٹے بڑے لیڈروں کی چھوٹی بڑی بندھی ٹکی یادگاریں تو قائم ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ان کے کارآمد ہونے میں بھی شک نہیں لیکن رفاہِ عام کے پروگرام اچھی اور نمائندہ حکومتیں یوں بھی بناتی اور نافذ کرتی رہتی ہیں۔ یہ ان کے فرائض میں ہے۔ اگر ان میں دو چار کا اضافہ ہوگیا تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مہاتما گاندھی اور پنڈت جی کی یادگاریں ڈھرّے کی نہ ہونی چاہئیں۔ سارے ہندوستان میں عالی شان سے عالی شان جتنے پہاڑ، دریا، شہر، پانی کے بند، باغات، جنگل، تعلیم گاہیں، عمارتیں، شاہراہیں وغیرہ ہیں ان کے ناموں کے بجائے مہاتما گاندھی اور پنڈت جی کے نام رکھ دیے جائیں تو اس سے ان سرداروں کی بڑائی میں کوئی اضافہ ہوگا، نہ ان پہاڑوں، دریاؤں اور عمارتوں کے مصرف میں۔ فرض کیجیے ہندوستان کو آج سے گاندھی نہرو

استھان کہنے لگیں تو اس سے ہماری آپ کی مشتبہ ذہنیت میں کیا فرق آجائے گا جس کی اصلاح میں ان عظیم شخصیتوں نے کیا کیا نہ کرڈالا۔ لیکن ہم جہاں کے تہاں رہے!

مہاتما گاندھی اور پنڈت جی نے ہمارے بطون میں اس لیے انقلاب نہیں پیدا کیا کہ ہمالیہ کا نام گاندھی یا نہرو رکھ دیا جائے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہم میں انسانیت آئے اور ہم انسان بنیں، جبر و جہالت کے خلاف جہاد کریں، درندگی سے نیکی کی طرف آئیں اور زندگی کو بلند اور بابرکت بنانے میں اور ان مقاصد کے حصول میں "تسلیمِ جاں" سے بھی دریغ نہ کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ مہاتما گاندھی اور پنڈت جی کے نام پر جو سرمایہ فراہم کیا جائے یا کیا جاچکا ہے اس کا ایک معقول حصہ ایسی تدابیر کے بروئے کار لانے پر صَرف کیا جائے جن سے ہندوستان کے نوجوان اس طرح کی تربیت حاصل کریں اور اس کا حلف لیں کہ وہ اپنے خیال، لفظ اور عمل سے مہاتما گاندھی اور پنڈت جی کی بیش بہا خدمات کو تاعمر روشن رکھیں گے۔ اس اسکیم کو اسی تندہی سے نافذ کرنا چاہیے جیسے ناگہانی حالات میں نوجوانوں کے لیے فوجی تربیت لازم کردی جاتی ہے۔

مادّی خوش حالی اور بے قید سیاسی آزادی کے ساتھ اخلاقی گراوٹ بھی برابر سامنے آرہی ہے۔ مہاتما گاندھی اور پنڈت جی کے احترام میں مخصوص قسم کی یادگار قائم کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ ہمارے نوجوان اُن اخلاقِ فاضلہ سے بہرہ مند ہوں جن کا سرچشمہ یہ برگزیدہ ہستیاں رہی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یادگاریں بڑھتی جائیں اور گاندھی و نہرو گھٹتے جائیں۔ صنعتی ترقی اور مادّی خوش حالی کے لیے ہندوستان کو بیرونی طاقتوں سے اربوں روپے مل سکتے ہیں لیکن یہ حکومتیں کسی قیمت پر بھی ہمارے لیے گاندھی اور نہرو نہیں فراہم کرسکتیں۔ یہ کام تو ہمارے ہی ملک کو کرنا پڑے گا۔ اگر ہندوستان نے اپنے لیے بھی گاندھی اور نہرو کی بازیافت نہ کی تو اس سے زیادہ بدنصیب ملک اور ہم سے زیادہ منافق کوئی دوسری قوم نہ ہوگی۔

پنڈت جی نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی وہ مشترک خاندان، مشترک جائداد اور ایک مشترک و مستقل روایات کا معاشرہ تھا جسے مشرق اوسط اور ہندوستان کی ملی جلی تہذیب نے پروان چڑھایا تھا۔ شمالی ہندوستان کے بیش تر شہری یا قصباتی باشندوں پر اس تہذیب کا

تصرّف عام تھا۔ پنڈت جی کے گھرانے پر مغربی تربیت وتہذیب کا اثر بھی کافی تھا۔ اس طور پر یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ پنڈت جی اعلیٰ قدر ِمراتب تین تہذیبوں کے ساختہ پرداختہ تھے۔ ہندی، ہند ایرانی اور مغربی۔ پنڈت جی کی زندگی میں انقلابات آتے رہے لیکن ان تہذیبوں کا اثر تا دمِ آخر اُن پر رہا۔

اس ہند ایرانی معاشرے میں گھر کا بڑا خاندان کی پرورش و پرداخت، صحت و عافیت، تعلیم و تربیت، اخلاق و عادات، ننگ و ناموس، روزی و روزگار، شادی بیاہ سب کی دیکھ بھال رکھتا اور بڑی حد تک ان کو پورا کرنے کرانے کا ذمہ دار ہوتا، سب اس کے دست نگر ہوتے، کوئی آفتِ ارضی یا سماوی پیش آجائے تو خاندان کا شیرازہ نہیں بکھرنے دیتا تھا۔ ہر خاندان کے بڑے کا دوسرے خاندان والوں پر یکساں اچھا اثر ہوتا اس میں مذہب، ذات پات، رشتہ ناتا کسی کی قید نہ تھی۔ یہاں تک کہ نچلے طبقے کے گھرانے کا کوئی بڑا یا بزرگ ہوتا تو اس کے سامنے اعلیٰ طبقے کے نوجوان کو بھی آنکھیں نیچی رکھنی پڑتیں۔ سوسائٹی کی تقسیم مذہب اور دولت کی بنا پر اتنی اہم نہ تھی جتنی خاندان کے نمائندے اور بزرگ ہونے کی حیثیت سے۔

آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے گاؤں یا قصبے میں کوئی واردات ہو جاتی تو وہ بستی کے بڑے بوڑھوں کی متفقہ رائے سے طے پا جاتی۔ اس میں وہ اُس ایمان داری اور دلیری سے حصہ لیتے جیسے معاملہ کسی خاص فرد یا خاندان کا نہ تھا بلکہ پوری بستی کی آبرو کا سوال تھا۔ اس کا بالکل لحاظ نہ کیا جاتا کہ کون برہمن ہے کون ہریجن، کون ہندو ہے کون مسلمان، کون اپنا ہے کون پرایا۔ مشترک خاندان اور خاندان کی لیڈر شپ کا وہ نظام ختم ہو گیا۔ بُرا ہا ہو یا بھلا اس میں کون پڑے یہ ضرور ہے کہ ایسا ہونا ناگزیر تھا۔

پنڈت جی بڑے عالی نسب، متموّل، روشن خیال، ذی اقتدار و ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ قوم کی خدمت میں چاہے وہ آگ سے خاک اور خاک سے خاکستر کیوں نہ ہو گئے ہوں اگر وہ یونان کے اُس دور میں ہوتے جب غیر معمولی استعداد وصفات کا آدمی دیوتا کے درجے پر فائز کر دیا جاتا تھا تو وہ یقیناً کوئی دیوتا یا نیم دیوتا قرار دیے جاتے۔ جس معاشرت میں وہ پلے اور بڑھے اس میں ہر چھوٹا اپنی ضرورت خاندان کے بزرگ کے سامنے لاتا، اس کی

تائید حاصل کرتا یا اس کے مشورے پر عمل کرتا۔ پنڈت جی وزیراعظم ہوئے تو ان کے جاننے پہچاننے اور ان سے محبت کرنے والوں کی تعداد شمار اور انداز سے باہر ہو چکی تھی۔ سب ان کو اتنا وزیراعظم نہیں جانتے تھے جتنا گھرانے کا بزرگ مانتے تھے، اس لیے سب اپنی اپنی معمولی اور غیر معمولی ضرورتیں اور مصیبتیں لے کر پنڈت جی تک پہنچنے کی فکر میں رہتے، پہنچ جاتے اور مطلب برائی ہوتی یا نہیں، تقویت کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ پنڈت جی موجود ہیں، کام بنے گا نہیں تو بگڑنے بھی نہ پائے گا۔ ان لوگوں کی دادرسی کے لیے کتنے ہی ادارے کھول یا عہدہ دار مقرر کردیے جاتے پنڈت جی تک پہنچے بغیر وہ کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔

اس خاص اعتبار سے مہاتما گاندھی کو بھی وہ حیثیت حاصل نہیں تھی جو پنڈت جی کو تھی۔ مہاتما جی تو نصیحت کرتے، تسکین دیتے یا راضی بہ رضائے الٰہی رہنے کی تلقین کرتے، غرض مند کا کام اتنے سے نہیں چل سکتا تھا۔ وہ تو روزی اور روزگار کا خواست گار ہوتا یا چاہتا کہ اُسے کسی جابر کے ظلم سے نجات دلائی جائے، یہ کام صرف پنڈت جی کر سکتے تھے جس کو کس تندہی سے کتنے دنوں تک دشواریوں میں رہ کر انھوں نے برابر انجام دیا۔ یہاں تک کہ جان، جاں آفریں کے سپرد کردی۔

دوسرے ملکوں کا علم نہیں۔ ہندوستان میں جس لیڈر کو پنڈت جی کی طرح ہر شخص کے بڑے اور بزرگ ہونے کا امتیاز حاصل نہیں وہ پارٹی کا تو لیڈر ہو سکتا ہے، پورے ملک اور باشندوں کا سردار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جہاں تک زیادہ سے زیادہ لوگوں کی انفرادی دشواریوں کو دور کرنے کا تعلق ہے ہندوستان کے لیڈروں میں پنڈت جی کا کوئی ثانی نہیں۔ اور یہ اس روایت کی بنا پر تھا جس میں پنڈت جی پیدا ہوئے، پلے اور جوان کی سیرت کا جُز بن چکی تھی۔ وہ روایات اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہیں۔ آئندہ کی لیڈرشپ میں یہ کمی محسوس ہوا کرے گی۔ یہ اچھا ہوگا یا بُرا، کون جانے!

شروع سالِ رواں میں پنڈت جی دفعتہً علیل ہوئے۔ ہندوستان ہی نہیں مہذب دنیا کے ہر گوشہ میں جہاں جہاں اُن کے جاننے والے موجود تھے، یہ خبر سُن کر مضطرب ہوئے۔ لیکن تعجب کم لوگوں کو ہوا ہوگا اس لیے کہ مختلف النوع ذمہ داریوں کے کام پنڈت جی دن رات میں

اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے انتہائی انہماک کے ساتھ بغیر آرام کیے جس طرح انجام دیتے تھے جو مدتوں سے اُن کا معمول چلا آتا تھا، وہ ان کی عمر کے چار پانچ آدمی بھی متفقہ طور پر انجام نہیں دے سکتے تھے۔ یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ پنڈت جی سے زیادہ مصروف اور طرح طرح کے بھاری ذمہ داریوں سے گراں بار دنیا میں شاید ہی کوئی دوسرا ملے، خواہ وہ کسی حکومت کا سربراہِ کار ہو یا کسی اور ادارے کا۔ احتیاط وعلاج سے طبیعت سنبھل گئی تھی لیکن نہ اتنی کہ وہ جس تندہی اور فیصلہ کُن انداز سے پہلے کام کرتے تھے اس کی متحمل ہو سکتی۔ دوسری طرف ذمہ داری کے کاموں کی نوعیت اور مقدار بڑھتی رہی۔ بہ ایں ہمہ جس ہمت و بشاشت سے وہ اپنے فرائض انجام دیتے رہے وہ اُنھیں کا کام تھا۔

اخبارات اور دیگر ذرائع سے پنڈت جی کی صحت، سرکاری کاموں میں مصروفیت اور جلسوں اور تقریروں میں شرکت کا حال معلوم ہوتا رہتا۔ چہرے بُشرے سے جس مستعدی، شرافت اور ذہانت کا اظہار بیماری سے پہلے تمام عمر ہوتا رہا، وہ اب بھی باقی تھی لیکن اب واضح طور پر یہ بھی دکھائی دینے لگا تھا جیسے اُن پر خاموشی اور بے بسی کا ایک سایہ پڑنے لگا ہو جو روز بروز گہرا ہوتا جارہا تھا۔ ان کی آنکھیں جو ہمیشہ ہمت، اُمید اور دل نوازی سے روشن رہتیں اور دوسرے کے دل کو حوصلے سے گرماتی رہتیں، اب کسی گہری سوچ میں اُفق سے پار، خاموش ناقابلِ فہم لامحدود پنہائیوں میں گم رہنے لگی تھیں۔

کون جانے وہ کس سوچ میں ڈوبے رہتے تھے۔ زندگی کا وہ نقشہ سامنے آتا ہوگا جسے پیشِ نظر رکھ کر تمام عمر کام کرتے رہے۔ کیسے کیسے احباب کی تائید اور اشخاص کی مخالفت حصّے میں آئی، فتح وشکست کی کن منزلوں سے گزرنا پڑا۔ ملک اور قوم کو کتنی عزّت و آسائش نصیب ہوئی۔ آئندہ کے لیے کیا کرنا ہے، وہ آئندہ جو گذشتہ سے زیادہ اہم اور پیچیدہ، اس لیے ساتھیوں کے بے لوث تعاون کا طلب گار تھا۔ خود اپنی ہمت اور استعدادِ کار کا بھی جو عمر اور صحت کے اعتبار سے روز بروز مضمحل ہوتی جارہی تھی۔ غیر متوقع گوشوں سے مخالفت کا عفریت سر اُٹھا رہا تھا۔ اپنے بھی پرائے ہوتے جارہے تھے۔ ان تمام دشواریوں پر قابو پالینا ناممکن نہ تھا لیکن کیا کیا جائے کہ زندگی کی شام جس تیزی سے بڑھتی آرہی ہے جسم وجان کی توانائی اسی اعتبار سے گھٹتی جارہی ہے......

یہ باتیں یوں ہی ذہن میں نہیں آرہی ہیں۔ کچھ دن ہوئے ایک[1] اخبار میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اُس اجلاس کی رپورٹ نظر سے گزری جو پنڈت جی کی موجودگی میں بمبئی میں منعقد ہوا تھا۔ جستہ جستہ اقتباسات درج ذیل ہیں:

''اکبر الہ آبادی نے دلّی کا دربار دیکھا تو ایک لاجواب نظم رقم کردی۔ امسال 15 رسے 17 رمئی تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے بمبئی میں ہونے لگے تو میرؔ خوار[2] نے سوچا کیوں نہیں اپنی سرکار کا دربار بھی دیکھ لیں۔ شہر کے جنوبی حصے میں بیس لاکھ کے خرچ سے بنے ہوئے شان مکھنڈ ہال میں جلسے ہورہے تھے لیکن دقت یہ تھی کہ مئی کی گرمی، تقریباً تین ہزار کا مجمع اور ہال ''ایرکنڈیشن'' کی نعمت سے محروم! پنکھوں کی تعداد دوچند کرکے بھی کوئی فائدہ نہ ہونے والا تھا۔ اس لیے مجلسِ استقبالیہ نے تین سوٹن برف کی سلیں لاکر فضا میں خنکی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ پھر کچھ من چلوں کو سوجھی کہ وقفے وقفے سے گلاب کے عرق کی خوش بو پھیلا کر ہال کو معطّر کیا جائے، تاکہ خنکی میں لطافت بھی پیدا کی جاسکے۔ ہال اور اسٹیج کی سجاوٹ میں بڑی سادگی تھی۔ بیدلرزاں کے پیچ وخم اور رنگین کپڑوں کے ٹکڑوں سے جمنی رائے نے اپنے مخصوص اسٹائل کے آرٹ کے خاص پیارے نمونے پیش کیے تھے۔ لیکن اتنی ہی بدمذاقی مہاتما گاندھی کی اس ٹوٹی ہوئی تصویر سے ٹپک رہی تھی جو کبڑی سی عقب میں کھڑی تھی۔ ٹھیک بارہ بجے دن کو وزیراعظم، صدر کانگریس، ارکان ورکنگ کمیٹی، گورنر مہاراشٹر، وزرائے حکومت وغیرہ کہکشاں کی طرح اسٹیج پر نمودار ہوئے...... جلسہ میں آنے والوں کے لیے موٹر پارک کرنے کا بڑا معقول انتظام تھا۔ ایک فرلانگ تک موٹروں کا اژدہام تھا اور وہ

---

1 دورِ حیات بمبئی کا ہفتہ وار اردو اخبار (20 رمئی و یکم جون 1964 جلد: 3، شمارہ: 15-14

2 نامۂ نگار کا فرضی نام جس کے لیے وہ داد کے مستحق ہیں (پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ میر تقی میرؔ)

بھی کیسی کیسی شان دار موٹریں! میرؔ خوار دل میں سوچنے لگا: کیا یہ اُسی گاندھی کی کانگریس ہے جس نے کُرتا پہننا اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ اس دیش کے کروڑوں باشندے اس کے بغیر زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے یا یہ اُس باپو کی جماعت ہے جو سیوا گرام میں جھونپڑی میں رہا کرتا تھا کیوں کہ اس کے ہم وطنوں کو اس سے بہتر جگہ میسّر نہ تھی؟ کیا اس کانگریس کی شان و شوکت تزک و احتشام امریکن کنونشن سے کچھ کم تھی؟ اس فضا اور اس ماحول میں بیٹھ کر غربت، مفلسی اور سوشلزم وغیرہ کی باتیں کچھ بے جوڑ سی لگتی تھیں۔ غربت اور غریبی پر کرشنا مینن نے ایک بلیغ جملے میں اظہارِ خیال کیا: ''ہندوستان غریب نہیں ہے، ہندوستانی غریب ہیں۔'' وسیع اسٹیج پر بے شمار تکیے پڑے ہوئے تھے۔ آسمانِ سیاست کے بے شمار درخشندہ ستارے آتے گئے اور بیٹھتے گئے۔ ان میں جواہر لعل نہرو اور صدر کام راج کے علاوہ وجے لکشمی پنڈت، مرار جی دیسائی، جگ جیون رام، لال بہادر شاستری، سردار سورن سنگھ، غلام محمد صادق، یشونت رائے چوہان، وسنت رائے نائک، اندرا گاندھی، ایس کے پاٹل، گلزاری لعل نندہ، سچیتا کرپلانی، کرشنا مینن وغیرہ۔ غرض ڈراما یا سینما کی اصطلاح میں ''آل اسٹار کاسٹ'' تھا........ میرؔ خوار کو یقین تھا کہ کانگریس جیسی وقیع جماعت کے اجلاس میں اسٹیج پُر وقار اور سنجیدگی ہوگی۔ ایسے اجلاس جس میں ہمارے چوٹی کے سیاسی رہنما ڈسپلن، تہذیب اور اخلاق کے معلّمین، حکومت کے وزرا اور دوسرے عمائدین جمع ہوں۔ ایسے اجلاس جن کی کاروائی دیکھنے اور سننے کے لیے نہ جانے کتنے غیر ملکی صحافی اور نمائندے اور مدبّرین جمع ہوں۔ کم از کم یہاں تو ایسی باتیں نہ ہوں گی جن سے ہماری تہذیب پر حرف آسکتا ہو۔ مگر افسوس کہ یہاں بھی مایوسی ہوئی۔ یہاں بھی لوگ چار چار پانچ پانچ کی

ٹولیوں میں تقسیم ہو کر حلقہ بنا بنا کر اس طرح بیٹھ گئے جیسے اسکول کے میدان میں ڈرل ماسٹر بچوں کو کھیل کھلانے کے لیے بٹھا دے۔ کسی کا منہ دکھائی دے رہا ہے تو کسی کی پیٹھ، مندوبین تجویز پر تقریر کر رہے ہیں اور ٹولیاں اپنی اپنی گفتگو میں مصروف و مشغول .... اسٹیج پر بے شمار تکیے رکھے تھے۔ پہلے تو یہ سب قرینے سے لگے تھے، لیکن جیسے جیسے لوگ آتے گئے ان کی ترتیب میں فرق آتا گیا، اور تھوڑی دیر میں ان کے طریقۂ استعمال میں بھی خاصا اختلاف دکھائی دینے لگا۔ کوئی تکیے سے لگا ہوا تھا اور کوئی تکیہ پر بیٹھا تھا، یورپ میں لوگ ''بستر میں سوتے ہیں اور ہندوستان میں بستر پر'' کچھ ایسا ہی معاملہ یہاں بھی تھا۔ کرشنا مینن اپنی جادو کی چھڑی سے کبھی تکیے کو گھسیٹتے دکھائی دیے اور کبھی بازو میں رکھے ہوئے جوتے اور چپلوں کو۔ گویا ایک مداری کی طرح انہوں نے اپنی چھڑی سر سے پیر تک پھرا دی! ..... سیشن کا ایک اہم پہلو بیمار نہرو کی شرکت تھی۔ میرخوار کے خیال میں اہمیت اس بات کی تھی کہ ہندوستان کے ہر علاقے اور ریاست سے آئے مندوبین نے اپنی آنکھوں سے وزیر اعظم کا آنا جانا اور اُٹھنے بیٹھنے کا تکلیف دہ منظر دیکھا۔ اُنھوں نے دیکھا کہ بھبنیشور کی علالت کے بعد سے اب تک ان کے محبوب جواہر لعل نہرو کی صحت کس منزل پر ہے۔ ان کے منہ سے دبے دبے فجائیہ الفاظ ان کی جذبات کی غمازی کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ان کے دل میں نہ جانے کیا کیا باتیں آرہی ہوں گی! اور میرخوار نے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ وہ منظر دیکھا۔ کئی موقعے ایسے آئے جب کہ کافی دیر تک وزیر اعظم تکیہ کا سہارا لگائے یکہ وتنہا خاموش بیٹھے رہے اور دس دس فٹ کے فاصلے تک ان کے پاس فرد واحد بھی دکھائی نہ دیا اور جو اس فاصلے پر بیٹھے بھی تھے، اُن میں سے بہتوں کی پیٹھ جواہر لعل کی طرف

تھی۔ وہ آپس کی گفتگو میں اس طرح مصروف تھے جیسے وہاں پر جواہر لعل
کا وجود نہیں کے برابر ہو۔ آخر اس ''بے رُخی اور سردمہری'' کے
کیا معنی......''

یہ وہ پنڈت جی ہیں جن کی ایک نگاہِ غلط انداز سے ممتاز و مفتخر ہونے کے لیے ''صبرِ ایوب کیا، گریۂ یعقوب کیا'' کی نوبت آجایا کرتی تھی یا جس کی گرم نگاہی سے کیسے کیسے سورماؤں کا پِتّا پانی ہوتا تھا۔ آج وہی پنڈت جی کہاں، کس حال میں تھے اور غاشیہ برادرانِ مرکب اجلال کہاں، کس تفریح سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو!

یہ سب دیکھتے ہوئے دل میں بے اختیار یہ بات آئی، کاش پنڈت جی بیمار نہ ہوئے ہوتے یا اتنے دنوں تک علیل نہ رہتے یا پھر کلیتہً صحت یاب ہو جاتے۔ ایسی شخصیتوں کو جیسی کہ پنڈت جی کی تھی طویل المیعاد اور بالآخر جان لیوا آزار میں مبتلا نہ ہونا چاہیے۔ ایسوں کے مدتِ مدید تک مریض و معذور رہنے سے وہ سارا نظام ماؤف و ابتر ہو جاتا ہے جس کے وہ معمار و مختار رہ چکے تھے۔ اس لیے کہ وہ منافق و مفتری جو اپنے نامبارک اغراض کی خاطر لیڈر کی چھتری کے نیچے پناہ گزین ہوتے ہیں، موقع ملنے پر سب سے پہلے اپنے محافظ و مربّی سے منحرف ہو کر اس کے نام اور کام کو داغ دار کرنے اور اپنے مقاصد کو آگے بڑھانے میں سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جو کام ملک اور اس کے باشندوں کے نفع و نام وری کے لیے لیڈر انجام دے چکا ہوتا ہے اس کا رُخ تمام تر اپنے نفع و نام وری کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ سیاسی شخصیتوں اور اخلاقی شخصیتوں میں کتنا تفاوت ہوتا ہے! پہلا عواملِ طبعی کی زد میں جتنا درماندہ ہوتا رہتا ہے مؤخر الذکر اتنا ہی برگزیدہ!

پنڈت جی خدا یا مذہب کے قائل نہ تھے۔ اس کا وہ آخر وقت تک، کبھی کبھی بے ضرورت بھی اظہار و اعلان کرتے رہے۔ وصیت نامے میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ جتنی اور باتیں جس بصیرت و دردمندی سے کہی ہیں وہ جیسے دل میں اُتر کر رگ و پے میں نفوذ کر جاتی ہوں۔ پنڈت جی نے جیسے یہ باتیں کہی نہ ہوں بلکہ خود اُن کی پوری زندگی وصیت نامے

کی ان سطروں میں سمٹ کر آ گئی ہو اور ہم چاہیں تو حواسِ خمسہ کی ہر حس سے پنڈت جی کو جان اور پہچان لیں۔ کوئی اُن سے واقف نہ ہو جب بھی اس تحریر کو پڑھ کر غائبانہ ان سے محبت کرنے لگے گا، اور اپنی نظروں میں اپنی بڑائی بھی محسوس کرے گا۔

پنڈت جی کی غریبوں سے محبت، مظلوموں کی حمایت، حق کی تائید، خلقِ اللہ کی بھلائی اور ترقی کو اپنی زندگی کا شیوہ بنالینا ایسی باتیں نہیں ہیں جو مذہب کے قلم رُو سے باہر ہوں۔ ان کی تصانیف میں آرٹ، انسانیت اور اقدارِ اعلیٰ کی حمایت کا جو آہنگ ملتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمارے آپ کے خدا یا مذہب پر عقیدہ رکھتے ہوں یا نہیں، اس طرح کی کسی نہ کسی حقیقتِ بسیط سے غیر شعوری طور پر سہی، متاثر ضرور تھے۔

وہ خدا سے چاہے جتنے دور رہے ہوں اس کی مخلوق سے بہت قریب تھے۔ خدا سے انکار اور اس کی مخلوق سے یہ شیفتگی، ایک سوال کی شکل میں اگر خدا کے سامنے پیش کی جاسکتی تو اقبالؔ کی نظم تنہائی میں اللہ کی طرف سے جو اشارہ شاعر کو موصول ہوا یعنی

تبسّم بہ لبِ او رسید و ہیچ نہ گفت!

وہی اس موقع پر بھی ایک اور ہی جہانِ معنی لیے ہوئے ملے گا!

پنڈت جی نے وصیت کی تھی کہ ان کی وفات پر مذہبی رسوم نہ بجالائے جائیں۔ نعش جلا دی جائے۔ اس کی خاکستر کھیتوں پر چھڑک دی جائے۔ البتہ تھوڑی سی مقدار گنگا میں بہا دی جائے اس لیے کہ گنگا سے اُن کو بچپن سے وابستگی رہی ہے۔ یہ ہدایات جس طرح دی گئی ہیں اس سے پنڈت جی کے کردار کا کتنا عظیم، حسین اور قابلِ احترام تصوّر ذہن میں آتا ہے۔ ہندوستان کی زندگی، تاریخ و تہذیب میں گنگا کا کیا رول رہا ہے پنڈت جی اس کے بیان کرنے میں اپنی پوری تخلیقی صناعی، ذہنی توانائی اور تخیّل کی کرشمہ کاری سے مدد لیتے ہیں۔ مذہبی صحائف میں گنگا جی کی تعریف و تقدیس میں ہندوستان کے شاعروں اور رِشیوں نے یقیناً عقیدت کے بے مثل نذرانے پیش کیے ہوں لیکن پنڈت جی نے گنگا کو ہندوستان کا جیسا مظہرِ جلیل و جمیل قرار دیا ہے وہ اس لیے طرفہ تر، عزیز تر اور رفیع تر ہے کہ پنڈت جی اپنے آپ کو خدا اور مذہب سے منسوب نہیں کرتے۔ ہم اُن کو بیسویں صدی کا خالص سائنٹیفک اور حقیقت پسند ذہن بھی قرار دیتے

ہیں۔اس کے باوجود انھوں نے گنگا کی تحریم وتکریم میں جو کچھ لکھ دیا ہے کتنے اہلِ دل اور اہلِ قلم ہیں جن کے بس کی یہ بات ہے!

بہت دنوں کی بات ہے جب گاندھی جی نے اپنا مشہور انگریزی اخبار ''ینگ انڈیا'' نکالا تھا، خیال آتا ہے کسی کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا تھا: ''مجھے یہ تو یقین نہیں آتا ہے جو شخص ہندوستان کی سرزمین سے اُٹھا ہو، وہ خدا پر یقین نہ رکھتا ہو!''

1948 کی ایک شام کو دہلی میں انسانیت کا ایک محسن گولی کا نشانہ بنا۔ٹھیک اُس وقت جب کہ وہ انتہائی مسکنت اور تضرّع سے ایک طرف جابر وقاہر کو رحم اور سچائی کی طرف بلا رہا تھا اور دوسری طرف مسکین ومظلوم کے زخموں پر اپنی محبت کا پھایا رکھ رہا تھا۔

دلّی لرز گئی۔کوئی شخص خواہ کسی حیثیت کا ہو کسی دوسرے لمحے موت کے گھاٹ اُتارا جاسکتا تھا۔ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے اُس رات کو اور کتنے دوسرے دن اور رات کو کوئی شخص اپنے گھر خیریت سے نہ پہنچ سکے گا یا جو لوگ گھر پر ہوں گے وہ محفوظ نہ ملیں گے۔دلّی ہی نہیں دور دور بھی!

اتنے میں بغیر کسی خوف وخطر کے ایک بلند مقام پر یکہ وتنہا، گوشت و پوست ہی کا بنا ہوا ایک انسان مجمع سے اُبھرا، معلوم نہیں کتنی اندرونی طاقتوں سے محکم ومطمئن اُس وقت اس سے زیادہ آسانی سے کسی قاتل کا شاید ہی کوئی اور نشانہ بن سکتا، لیکن اُس سے زیادہ شاید ہی کوئی اور موت سے بے پروا تھا۔ایک بار پھر دلّی لرز گئی!

پھر اس نے وہ سب کہا جو کہہ سکتا تھا، اس اطمینان ویقین سے جیسے اس حادثے نے اس کی اپنی موت کو بازیچۂ اطفال بنا دیا ہو۔

وہ مہاتما گاندھی تھے، یہ پنڈت جی!

مہاتما گاندھی کی شہادت پر پنڈت جی کی اس دلیری کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ حق کی حمایت میں دلیر ہونا کس کو کہتے ہیں!

پنڈت جی کی وفات پر نہ دہلی گیا نہ کہیں اور۔کئی دن تک صرف اخبارات پڑھتا اور ریڈیو سنتا رہا۔تصوّر میں وہ نقشہ طرح طرح سے بنتا بگڑتا رہا جس کا ذکر اُوپر کی سطروں میں کر آیا ہوں۔پھر ایسا محسوس ہوا جیسے راج گھاٹ پر میتّ کو نذرِ آتش کرنے کے بعد ایک صدا بلند ہوئی!

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق ہے[1]

تھوڑی دیر بعد یہی صدا پھر آئی۔ صرف لہجہ بدلا ہوا تھا۔ رنج ہو راحت ہو، تنہائی ہو محفل ہو، آبادی ہو یا ویرانہ کہیں جاؤں کچھ کروں، یہ مصرعہ اپنے آپ کو دُہراتا اور اپنی یاد دلاتا رہتا ہے۔ اُسی بدلے ہوئے لہجے میں! جیسے بیچ سمندر میں کوئی بہت بڑا جہاز ڈوب گیا ہو اور بنات البحر اس پر نوحہ خواں ہوں!

(مطبوعہ۔ فکر ونظر، علی گڑھ، جولائی 1964)

●●●

---

1 کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگنِ عشق   لب ساقی پہ مکرر ہے صدا میرے بعد   (غالبؔ)

محمد فاروق دیوانہ

(1884-1968)

محمد فاروق دیوانہ ناموراد یب ونقاد، مجنوں گورکھ پوری کے والد، عالم اور ریاضی داں اور غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ 1884 میں گورکھ پور میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان اہلِ عالم خاندان تھا۔

ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ 1901 میں انٹرنس اور 1903 میں انٹر پاس کیا۔ علی گڑھ سے 1909 میں سائنس میں گریجویشن اور 1913 میں ایم۔ایس سی کیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین ان کی ریاضی دانی کے معترف تھے۔ وہ یونیورسٹی میں ریاضی کے اُستاد تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے ان کو ''قانون مسعودی'' کے ترجمہ کا کام سپرد کیا تھا۔ غالباً ایک جلد کا ترجمہ کر دیا تھا۔

فاروق صاحب 1925 تا 1929 تک یونیورسٹی سے وابستہ رہے، اور رحمت اللہ کمیٹی کی سفارشات کے نفاذ کے سبب ملازمت سے نکال دیے گئے۔ کچھ عرصہ وہ مولانا محمد علی کے ہمدرد سے اور کامریڈ سے بھی وابستہ رہے۔ ان کی مضطرب اور بے چین طبیعت نے ان کو ایک جگہ چین کے ساتھ رہنے نہ دیا اور وطن گورکھ پور آ گئے اور ریاست امام باڑہ کی منیجری میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بڑا کام کیا۔

1952 میں خاتم زمین داری قانون کے سبب زمین داری نظام درہم برہم ہو گیا۔ وہ گوشہ نشیں ہو گئے اور طویل بیماری کے بعد 1968 میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مرتب o

محمد فاروق دیوانہ مرحوم (ایم.ایس.سی علیگ) کی رحلت کی خبر ہماری زبان سے ملی۔ ایک مدت سے یاد نہ آئے تھے، عرصے سے علیل و صاحب فراش تھے، خط و کتابت بھی نہ تھی۔ لیکن جب کبھی وہ باتیں ذہن میں آتیں جو علی گڑھ کہلاتی ہیں تو مرحوم کا سراپا اور شخصیت سامنے آجاتی۔ کیا بتاؤں جب سے علی گڑھ گردش میں آیا ہے اولڈ بوائز کی نام وری اتنی نہیں یاد آئی جتنی موجودہ نوجوان طلبا کی مصیبت و محرومی مضطرب رکھتی ہے۔

ہر آدمی کی وفات پر خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا، مسلمان کی زبان پر بے ارادہ دعائے مغفرت آتی ہے۔ دعائے مغفرت مانگ کر مرحوم کو جوارِ رحمت میں دے دینا ٹھیک ہے، لیکن مغفور کو محبت و احترام سے اپنے شعر و ادب میں آنے والی نسل کی محبت و احترام کے لیے محفوظ کر دینا اور اس کی امانت میں دے دینا دعا سے آگے کی چیز ہے یعنی دعائے مقبول۔ اپنے ناچیز بندے کو خدا نے یہ ایک اختیار و امتیاز بخشا ہے کہ وہ دعا مانگ کر اسے خود بھی قبول کر سکتا ہے۔ اس عطیۂ الٰہی کی طرف ہمارا دھیان کم جاتا ہے، ورنہ دعا کی طرف سے کبھی کبھی مایوس و بدگمان ہونے کے بجائے ہم ہمیشہ اپنے کو مسرور و مظفر محسوس کریں۔ کبھی کبھی میں اس طرح کی بھی دعائیں مانگ لیتا ہوں۔

مرحوم کتنے ناموں سے مشہور تھے، اور یہ سارے القاب ان کے شیدائیوں نے کس محبت و عزت سے ان کو دیے تھے، حاجی بلغ العلیٰ، حاجی بغلول اور یہ سب غالباً مشہور کلاسیکی بہلول دیوانہ کی یاد و احترام میں، اپنے بارے میں ایک شعر بھی کہا ہے ؎

بلغ العلیٰ تھا نام مرا، اس کو دیکھئے
اتنا بگاڑا لوگوں نے بغلول کر دیا

اگلے زمانے میں جب حکومت مطلق العنان ہوتی تھی مخلص اور عقل مند لوگ دیوانے اور وحوش وطیور کی زبان سے کلمۂ حق کہلواتے اور اس کی تلقین کرتے۔ جابر، آدمی کو نہیں پہچانتا جانوروں سے ڈرتا ہے، ظالموں اور بچوں کو اس زمانے میں اسی طرح اچھی باتیں بتائی سکھائی جاتی تھیں۔ دیوانے کی باتیں فرزانوں کی فرمودات سے زیادہ متاثر کرتی تھیں، اس لیے کہ نالائق سے نالائق بھی دیوانے کو مخلص سمجھتا ہے۔

فاروق صاحب علی گڑھ کے اس زمانے کے طلبا میں سے تھے جب ہم سب علی گڑھ کو مسلمانوں کا اُندلس اور یونان سمجھتے تھے۔ کیسے کیسے ذوق و ذہن اور ہمت و حوصلہ کے طالب علم یہاں تھے کتنے قیمتی اور قومی عوامل وعناصر اور کیسی صحت مند و صحت بخش فضا میں ان کی ذہنی واخلاقی تربیت ہوتی تھی۔ ان میں سے کس کس کے نام لوں اور کہاں تک ان کی تفصیل سُناؤں۔ علی گڑھ کے اس زمانے کے رندانِ باصفا، ان کو جانتے پہچانتے ہوں گے۔ موجودہ صدی کے ابتدائی 35-30 سال میں جتنے نام ور طلبا اس ادارے سے فارغ التحصیل ہوئے وہ پھر کبھی دیکھنے میں نہ آئے۔ جیسے اقدارِ اعلیٰ کے وہ سانچے ٹوٹ چکے ہوں جن میں نوجوانوں کی سیرت وشخصیت ڈھلتی تھی یا وہ روایات اپنا اعتبار کھو چکی ہوں، جن میں ہماری فکر ونظر بیدار و بالیدہ ہوتی تھی، جس نسل کا ذکر کر رہا ہوں وہ اس تہذیب کی شکست وریخت سے برآمد ہوئی تھی جس کو تاریخ میں ایسی تہذیب قرار دیا گیا ہے جو اپنی ترکیب، توانائی اور تازگی کے اعتبار سے تہذیب ہی نہیں تحریک بھی ہے۔ یہ تہذیب اور ایسی تہذیب ختم نہیں ہوتی بلکہ کلامِ الٰہی کے لفظوں میں اپنی شان بدلتی رہتی ہے۔ کم تہذیبیں تحریک رہی ہیں۔

فاروق صاحب ریاضی (میتھ میٹکس) کے ایم.ایس.سی تھے۔ اس زمانے میں کسی مسلمان کا سائنس یا ریاضی میں یہ امتیاز حاصل کرنا بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ ہم میں جو اس علم سے واقفیت رکھتے تھے ان کو کچھ اس طرح کا اسکالر سمجھتے تھے جو ریاضی کا معلّم ہی نہ ہو جیسا کہ اکثر لوگ ہوا کرتے ہیں بلکہ وہ ریاضی کے اداشناس تھے، وہ ریاضی سے دوسرے علوم کی بھی تعبیر و

تصدیق کر سکتے تھے۔ وہ تمام علوم کو ایک دوسرے سے علاحدہ نہیں بلکہ ایک ہی نامیاتی رشتے میں منسلک سمجھتے تھے۔ اس طور پر ریاضی کو انھوں نے اپنے طلبا کے لیے بہت دل چسپ اور سبق آموز بنا دیا تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے ان کو لکچرر شپ کے علاوہ قانون مسعودی کے ترجمے کا کام بھی سپرد کر دیا تھا۔ فاروق صاحب، ڈاکٹر صاحب کے بڑے چہیتے اور لائق شاگرد تھے۔ اُن کا بڑا احترام کرتے تھے اور تمام عمر ڈاکٹر صاحب کے منتخب وفا شعاروں میں رہے۔ ممتاز ہاؤس میں قیام تھا، لیکن دن رات حالتِ سفر میں رہتے۔ کوئی ساتھ نہ ہوتا، صرف ایک کمبل کندھے پر ڈالے ہوتے جس سے وہ جس طرح کا سلوک چاہتے کرتے چلتے ہوتے تو کمبل گردن پر سوار رہتا جہاں بیٹھنے کو ہوتا وہاں کمبل کو پٹک کر اس پر خود سوار ہو جاتے۔ جاڑے، گرمی، بہار، برسات کسی کی قید نہ تھی۔ کمبل ان کا سمبل یا سلف رسپیکٹ بن گیا تھا۔

یاد نہیں آتا ان سے کب، کہاں اور کیسے ملاقات ہوئی، شاید یہ سب کچھ نہ ہوا ہو۔ وہ خود مجھ پر منکشف ہو گئے ہوں۔ اس کا صلہ اس طرح دیا کرتے کہ جب تک علی گڑھ میں رہے، دن رات میں کسی وقت ایک بار مجھے دیکھنے اور اپنے کو دکھانے کے لیے ضرور آ جاتے۔ موجود نہ ہوتا تو بچوں کو طرح طرح کے حرکات وسکنات سے لبھاتے، بچوں سے بھی زیادہ بچوں کی طرح باتیں کرتے اور کھلا ہنسا کر چلے جاتے۔ کوئی نہ ملتا تو نوکروں سے اظہارِ تلطف کی بنا پر کوئی چھوٹی موٹی سی فرمائش کر دیتے اور ان کو خوش کرنے کے لیے اپنے خاص انداز سے پُرسشِ احوال کرتے اور چلے جاتے۔ میں گھر آتا تو یہ ملازم فاروق صاحب کی تشریف آوری کو اس طرح بیان کرتے جیسے فاروق صاحب میرا نہیں ان کا کارنامہ تھے۔ نوکروں اور بچوں میں شاید ہی کوئی فرزانہ اتنا مقبول تھا جتنا یہ دیوانہ!

جیسا کہ اُوپر بیان کر آیا ہوں وقت کا زیادہ حصّہ گھومتے پھرتے کاٹ دیتے جیسے کوئی ناقابلِ تسخیر باطنی تقاضا یا طاقت چین سے بیٹھنے نہ دیتی جو نو وارد طلبا یا اجنبی اشخاص سے راستے میں کھڑے کھڑے گفتگو کرنے لگتے جو اُن کی ہیئت اور اُکھڑی اُکھڑی باتیں سُن کر ان کو نیم پاگل سمجھتے، لیکن مخاطب کو وہ باتیں اتنی عجیب اور دل کش معلوم ہوتیں کہ ان سے اُس وقت تک جدا نہ ہوتے جب تک یہ خود گفتگو کے دوران ہی میں ان کو متحیّر چھوڑ کر کسی اور طرف نہ نکل جاتے۔

فاروق صاحب کا سراپا اور طور طریق دیکھ کر قدیم یونان کے اربابِ دانش اور اہلِ فن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا، ترشا ہوا نقشہ، متناسب اعضا، کھلتا ہوا رنگ، آنکھیں متجسس، کبھی اتنی گہری اور پُر اسرار اور ٹھہری ہوئی جیسے گہرا، خاموش بے کنار سمندر، غیر معمولی طور پر نمایاں، چوڑی ہموار پیشانی، سر کے بال صاف، لمبی گھنی ہوا میں بکھرتے رہنے والی کھچڑی داڑھی جو اُن کے اندازِ گفتگو کے ساتھ اس طرح متحرک رہتی اور خفیف سے خفیف ارتعاش کو ریکارڈ کرتی، جیسے راگ آواز ہی نہیں جنبش (رقص) بھی ہو۔ اوسط عمودی قد، آواز بھاری نہیں تھی لیکن اشعار ہمیشہ ایسی گمبھیر آواز و انداز میں پڑھتے جس میں گونج اور گمک ہوتی، بالعموم ایسے ہی شعر پڑھتے جن میں صوری اور معنوی دونوں ہی اعتبار سے جزالت ہوتی۔ ان کی زبان سے شاید ہی میں نے کبھی ایسا شعر سُنا ہو جس میں غزل کا رنگ و آہنگ ہو۔ پتلے دُبلے لیکن ہلکے پھلکے نہیں، اعضا اور عضلات میں بڑی لچک اور توانائی معلوم ہوتی تھی، یونانی دانش وروں ہی کی طرح مسائل کو سنجیدہ گفتگو اور سوال جواب سے منقح کرتے، کیسے ہی غبی یا برخود غلط سے کیوں نہ سابقہ ہو، نہ اُکتاتے تھے نہ بیزار ہوتے تھے۔

یونیورسٹی میں اکثر رزم و بزم کے معرکے پیش آتے رہتے۔ ایسے مواقع پر بعض محترم مہمانوں کا اجتماع میرے یہاں ہو جاتا۔ فاروق صاحب حسبِ معمول گھومتے پھرتے گنگناتے آنکلتے۔ ان کی پذیرائی جس رکھ رکھاؤ، لطف، شگفتہ روی اور شائستہ بے تکلفی سے ہوتی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے ظاہر و باطن دونوں میں مہمان اکابر کے لیے کتنی کشش و احترام تھا۔ فاروق صاحب کو جس نے قریب سے دیکھا ہے وہ جانتا ہوگا کہ ان کے ظاہر اور باطن میں اختلاف ہوتے ہوئے کتنا اتحاد تھا۔ ایسا اتحاد جس کو اتنا آرٹسٹ نہیں جانتا جتنا عارف سمجھ سکتا تھا۔ تاوقتیکہ آرٹسٹ اور عارف ''بیک ناقہ و محمل'' نہ ہوں، یہ قر ان ''ولی پوشیدہ اور کافر کھلا'' ذرا کم ہی دیکھا گیا ہے۔ اس صحبت میں کوئی نہ کوئی سیاسی، علمی یا تہذیبی مسئلہ بغیر ارادے کے چھڑ جاتا۔ فاروق صاحب ان لوگوں میں تھے جن کی موجودگی میں موضوعِ گفتگو کچھ ہی ہو اُس کی سطح ہمیشہ بلند ہوتی۔ یہ بڑی معتبر پہچان حقیقی آرٹسٹ، اسکالر یا شخص کی ہے۔ باتیں سنجیدہ اور شگفتہ ہوتیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال سے لے کر آخرت میں اُن کے عروج تک کے سارے

مسائل زیرِ بحث آ جاتے۔ درمیان میں تفنن کی پھلجھڑیاں چھوٹتی رہتیں۔ فاروق صاحب کہیں بند نہ تھے۔ یکا یک پہلو بدلتے، مجلس برخاست ہو جاتی اور اس طرح رُخصت ہو جاتے جیسے جھونکا نسیم کا تھا، ادھر آیا اُدھر نکل گیا۔

سال نہیں یاد آ رہا تقریب یاد ہے۔ طلبا نے اسٹریچی ہال میں ڈرامہ کیا تھا۔ فاروق صاحب چیف ایکٹر تھے۔ ایسے ایکٹر جس کے ''روئے زیبا'' کے لیے مزید کسی ''آب ورنگ و خال وخط'' کی حاجت نہ تھی، وہ سماج ہی نہیں سنسار کے سنسرا یکٹر تھے۔ اسٹیج پر نمودار ہوئے تو پورا ہال تحسین اور تالیوں سے ہلنے لگا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے فاروق صاحب اپنے حلیہ و ہیئت اور اپنے سے متعلق جس حرف و حکایت کی صدائے بازگشت میں نمودار ہوئے تھے وہی بھرپور ڈرامہ تھا۔ از اوّل تا آخر! جیسے مشیّت میں مدت گم یا مشتمل ہو۔ پھر اپنا خطبہ پڑھا جو صنعتِ ''متشابہات'' میں لکھا گیا تھا۔ اس صنعت کی کھوج میں نہ پڑیئے، فاروق صاحب کو نظر میں رکھیے۔ پہلے ہی فقرے سے متشابہ لگنا شروع ہوا۔ ہر متشابہ کی برجستگی پر سامعین دل کھول کر داد دیتے اور لطف اُٹھاتے۔ اس صنعت کو فاروق صاحب نے کہیں سے کھوکھلی یا آورد سے بے کیف نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے سامعین جن میں کبھی وہ خود رہ چکے تھے، بڑے سخت گیر اور صرف آمد کے قائل تھے، آورد اور پینترے کو کسی حال میں گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے ہر موڑ پر ہر لفظ اور ہر فقرے میں کوئی نہ کوئی گدگدی، چٹکی یا چبھن رکھ دی تھی۔ معلوم نہیں یہ خطبہ کہیں محفوظ ہے یا نہیں۔ یہ صنعت اتنی صنعت نہیں ہے جتنا لطیفہ یا تفریح، ضلع جگت سے ملتی جلتی ایک چیز اس سے کام لینے والا اگر کوئی اچھا فن کار ہو تو وہ اپنے عہد کے اہم اور دل چسپ واقعات حالات و تجربات کی نشان دہی کر سکتا ہے۔ اس خطبے کا اختتام کچھ اس طور پر ہوا تھا.... ''الخاتون والشیخ عبداللہ'' اُس زمانے میں ویمنز کالج علی گڑھ کے بانی اور سکریٹری خان بہادر شیخ عبدالغفور ایک رسالہ 'خاتون' نکالتے تھے۔

فاروق صاحب اچھے شاعر تھے اور ایسے ہی شعر کہتے جس کے بارے میں ان کو یقین ہوتا کہ وہ شاعر، شاعری اور سامعین سب کا حق ادا کر رہا ہے۔ لکھے اور بار بار کے پڑھے ہوئے اشعار مجھے یاد نہیں رہتے۔ چہ جائیکہ سُنے سُنائے، سر راس مسعود مرحوم کے اسکول کے ساتھی تھے

اور ان کی بڑی عزّت کرتے تھے۔ وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو اسٹاف کلب میں فاروق صاحب نے بڑی دھوم کا خیر مقدمی قصیدہ پڑھا۔ کس اعتبار وافتخار سے یہ مصرعہ پڑھا تھا ع

بہ ہمت جواں و بہ تدبیر پیر!

اس وقت جنگ بلقان کے زمانے کی ایک نظم کا مشہور شعر یاد آرہا ہے جو مدتوں ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر رہا۔

اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ نظم فاروق صاحب ہی کی تصنیف تھی یا کسی اور کی۔ عام طور سے منسوب ان ہی کی طرف کی جاتی تھی۔ ان کی اُردو نثر میں بڑی جان اور روانی تھی جس میں جا بجا طنز وظرافت کے جگنو جگمگاتے تھے۔ طنز وظرافت کے لیے نہ چہرہ باندھتے نہ مواقع تصنیف کرتے۔ ان کی تحریر سے طنز وظرافت اسی طرح برآمد ہوتی جیسے پیڑ پودوں سے پھل پھول۔ مولانا محمد علی کے اخبار ''ہمدرد''[1] سے کچھ دنوں وابستہ رہے۔ اُردو کے بیش تر مضامین اسی میں شائع ہوئے۔ بات میں بات نکلتی ہے اور جب ''دیوانے کا پاؤں درمیان ہو'' تو ایسا ہونا تعجب کی بات نہیں، میرے نزدیک ظرافت طنز سے مشکل فن ہے۔ ہنس ہنس کے اور ہنسا ہنسا کے مار ڈالنا بہرحال فساد کرا کے مار ڈالنے سے بہتر اور بڑا کارنامہ ہے۔ متشابہات کا تعلق ظرافت سے ہے اور متشابہات میں پتے کی بات کہتے جانا آسان نہیں ہے، لیکن یہ کوئی اعلیٰ اُسلوب نہیں ہے البتہ اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ کوئی اچھا لکھنے والا ہو تو وہ اپنے عہد کے اہم واقعات، حالات و تجربات کی نشان دہی اس پیرائے میں دل نشیں انداز میں کر سکتا ہے۔

ہمدرد کے دفتر دہلی میں ایک بار فاروق صاحب کا مہمان ہوا، فاروق صاحب اپنے (Cell) حجرہ یا زاویۂ زہدان میں زیادہ تر چارپائی پر لیٹے چھت کو تکتے اور گنگناتے رہتے، اُکتا جاتے یا خیالات یک سُو ہو جاتے تو سر سے پاؤں تک کمبل اوڑھ لیتے۔ یہ ایک طرح کا

---

1. مولانا محمد علی نے 1913 میں ہمدرد جاری کیا تھا۔ ہمدرد سے میر محفوظ علی بدایونی، جالب دہلوی اور قاضی عبدالغفار جیسی شخصیات وابستہ رہیں۔ ہمدرد مولانا محمد علی کی سیاسی مصروفیات کی بنا پر زیادہ عرصہ تک نہ چل سکا۔

نوٹس تھا کہ جو کچھ سوچ لیا ہے وہ دم مخت ہو رہا ہے۔ پھر یک لخت اُٹھ بیٹھتے اور پنسل سے کٹے پھٹے کاغذ پر جلد جلد لکھنا شروع کر دیتے۔ دو چار صفحے لکھے کاتب آیا مسودہ لے گیا۔ محمد علی صاحب کے احکام دُشنام پائدار آواز سے مسلسل براڈ کاسٹ ہوتے رہتے۔ شام ہو رہی تھی مولانا کی آواز گونجی "دیکھو فاروق کیا کر رہا ہے؟" پاس سے شاید کسی نے کہہ دیا ہو، کمبل میں روپوش ہیں موسمی خلفشار کو روندتا پسپا کرتا ہوا محمد علی صاحب کا تڑاقا موصول ہوا جیسے ریڈیو پر بجلی کے بجائے آواز گری ہو۔ "ارے اس سے کہو اُٹھ بیٹھے ورنہ دیوانہ تو ہے ہی پاگل ہو جائے گا۔"

محمد علی جیسے تھے، سب جانتے ہیں۔ ایسی کھلی کتاب کہاں ملتی ہے۔ زندگی کی جس منزل اور زمانے کی جس گردش سے گزر رہا ہوں، اور علی گڑھ کو جس درماندگی میں پاتا ہوں، اس میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اب کسی محمد علی کو نہ دیکھ پاؤں گا۔ مرحوم کے بارے میں متضاد رائیں ملتی ہیں۔ مجھے تو ان کی خامیاں ایسی معلوم ہوتی ہیں، جیسے وہ ان میں نہ ہوتیں تو شاید ان کی شخصیت اتنی مسحور کن، ناقابلِ تسخیر اور دلآویز نہ ہوتی جتنی کہ تھی۔ کاش ناظرین نے ان کو اپنے خوردوں میں سے کسی پر برہم ہوتے پایا ہو۔ اس کے بعد یہ دیکھا کہ اس برہمی کے طفیل اور اس کی تلافی میں محمد علی کی شرافت، شجاعت اور سخاوت کا کیا عالم ہوتا تھا۔ کیسے کہوں کہ اب ایسے لوگ نہ پیدا ہوں گے، اس لیے کہ مشیّت مٹاتی ہے، لیکن مٹنے نہیں دیتی، وہ مٹاتی ہے بنانے کے لیے، شاید طرفہ تر اور عظیم تر شے یا شخصیت بنانے کے لیے۔

محمد علی مرحوم تین شخصیتوں کا غیر معمولی لحاظ کرتے تھے۔ میرے علم میں یہی تین ہیں۔ بہت ممکن ہے دوسرے بھی ہوں۔ سید محفوظ علی بدایونی[1]، راجہ غلام حسین[2] اور فاروق صاحب کا، راجہ غلام حسین کامریڈ میں محمد علی کے دستِ راست تھے۔ تھوڑے سے وارستہ مزاج بھی۔ محمد علی صاحب ایک دن ان کی تلاش میں پتہ لگاتے لگاتے بام نشینوں تک جا پہنچے، راجہ مرحوم کو پکڑ لائے اور یہ مصرعہ پڑھتے ہوئے دفتر پہنچے۔ ع

میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

---

1 محفوظ علی بدایونی (1870-1943)

2 راجہ غلام حسین

غلام حسین کا ایک حادثے میں انتقال ہوگیا، محمد علی صاحب بے قرار ہوگئے۔
جاں گداز مرثیہ لکھا۔ایک شعر یاد آرہا ہے۔

خوب کتنا بہشت کا رستہ
ہم کو بھی ساتھ گر لیے ہوتے

ان دنوں کبھی کبھی بے اختیار جی چاہنے لگتا کہ ایک دفعہ پھر یونین میں محمد علی کی زبان سے وہ شعر سُن سکتا جس کا قصہ یہ ہے، چندواڑہ میں طویل نظر بندی سے رِہا ہوکر علی گڑھ پہنچے تھے، علی گڑھ کے طلبا علی گڑھ کے محراب و منبر، علی گڑھ کی فضا، علی گڑھ کے تقاضے، اس سے بہتر کون با موقع ہوسکتا تھا جب محمد علی اپنی محبت، مسرّت اور افتخار کا اظہار کرتے جیسے ع

ابر اُٹھا تھا کعبے سے جھوم پڑا مے خانے پر

شعر کا پہلا مصرعہ پڑھا ع

شہر کے لڑکوں کی بر آئی مراد

دیر تک اور طرح طرح سے اُسے پلٹے دیتے رہے، کبھی سنجیدہ ہوکر کبھی بلند بانگ ہوکر کبھی بڑے ہلکے پھلکے تفریحی انداز سے اور ہم سب کے شوق کو مہمیز کرتے رہے۔ جب دیکھا کہ پیالے کے چھلکنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی تو دوسرا مصرعہ پڑھا اور اس طرح پڑھا اور ایسے ادا کیا کہ کیا کوئی مشاق شاعر یا ایکٹر ادا کرے گا۔ اس سے پہلے انیسؔ نے اتنا اور کہہ دیا، صاحبو یہ شعر میرے وطن رام پور کے ایک شاعر کا ہے۔ اتنا کہہ دینے سے شعر کی تاثیر اس موقع پر جتنی بڑھ گئی، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پورا شعر یہ ہے۔

شہر کے لڑکوں کی بر آئی مراد
بند سے دیوانہ رِہا ہوگیا

کیا بتاؤں محفل کا کیا حال ہوا، ثانی مصرعہ طرح طرح سے بار بار پڑھتے، کیسا مژدہ اور کیسی دعوت تھی، یہ اَسیری اور رِہائی جس کا احساس و اظہار جگر صاحب کے اس شعر میں ملے گا۔

اُس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رِہائی ہے

یہ ان اشعار میں ہے، جسے اچھے شاعر بھی اتفاقیہ ہی کہہ پائے ہیں ہم میں پا کر اور ہم میں پہنچ کر محمد علی سے زیادہ دھوم مچانے والا، جان چھڑکنے والا اور فخر کرنے والا مجھے تو اب تک ملا نہیں، جیسے ان کی ساری اعلیٰ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہوں اور ہاں یہ کہنا تو بھولا ہی جاتا تھا کہ کیسا ہی سورما کیوں نہ ہو، محمد علی کو (Patronise) نہیں کرسکتا تھا۔

1929 میں اوور ہالنگ کمیٹی نے جتنے اراکینِ اسٹاف کو یونیورسٹی کی ملازمت سے برطرف کیا، ان میں ایک فاروق صاحب بھی تھے۔ علی گڑھ چھوڑنے کا ان کو بڑا صدمہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے علم وفن اور دیدو دانش کی جتنی رنگین روشن عفیف اور کشادہ آغوش وادیاں تھیں، ان سب کو اپنے اوپر ہمیشہ کے لیے بند کرلیا ہو۔ اس حادثے پر فاروق صاحب کا قلندر جاگ پڑا اور یہ پکار کر کہا ع

تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

ان کو عرش پر سے فرش پر اُتار لایا اور ایک نیا رول تفویض کیا۔ اس قلندر نے ان سے پہلے اور سب سے پہلے ہمارے جدِّ اوّلین کو بھی یہی کہہ کر سہارا دیا تھا اور زمین پر اُتار لایا تھا۔ پھر معلوم نہیں کتنے بہانے اور کیسے کیسے بھیس میں اس کارگاہِ عمل کو وہ حیثیت یا منزلت بخشی جس کا بارگاہِ عبادت میں تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

لیکن یہ داستان لمبی ہے اور رات تھوڑی، قصہ کوتاہ فاروق صاحب اپنے وطن گورکھ پور کو مراجعت کر گئے، شاید پھر کبھی نہ آئے۔ انھوں نے شکر سازی کے ایک کارخانے کی منیجری قبول کر لی اور فیکٹری کو ایسا عروج دیا کہ اس زمانہ اور اس کے نواح میں ان کے اس کارنامے کی دھوم مچ گئی۔ علی گڑھ کے رندانِ قدح خوار کے ایسے کتنے کارناموں میں ایک اور کا اضافہ ہوا۔

یہ سب تو ہوا لیکن اس سوسائٹی کو کیا کہیے جہاں ہر عظمت کی تقدیر میں عبرت لکھی ہو!

(مولوی محمد فاروق، دیوانہ گورکھ پوری۔ مطبوعہ: ہماری زبان، علی گڑھ، مئی 1968)

●●●

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی

(1912-1974)

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی 1912 میں کان پور میں پیدا ہوئے۔ اُن کا آبائی وطن سندیلہ تھا۔ ان کے آباو اجداد کا پیشہ خوش نویسی تھا۔ اُن کے پردادا فرمان نویسی پر مامور تھے۔ اُن کے والد محکمہ عدلیہ میں ایک ذمہ دار منصب پر فائز تھے۔

فریدی صاحب نے 1929 میں لکھنؤ کے اسلامیہ انٹر کالج سے ہائی اسکول پاس کیا اور انٹرمیڈیٹ کرسچن کالج لکھنؤ سے پاس کیا۔ ایم۔ بی۔ ایس میڈیکل کالج لکھنؤ سے کیا اور مزید تعلیم کے لیے ولایت گئے اور واپس آ کر لکھنؤ میں پریکٹس شروع کی۔

ڈاکٹر فریدی صاحب کی سیاسی اور سماجی خدمات بے شمار ہیں۔ وہ مسلم مجلس کے بانی اور صدر رہے۔ مسلم پرسنل لا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اقلیتی کردار کی بازیابی کے سلسلہ کی تحریکات کے نتیجہ میں جیل بھی گئے۔ امریکہ مشرق وسطیٰ اور دنیا کے مختلف ممالک کے سفر بھی کیے۔ 1973 میں اُن کا انتقال ہوا! مرتب

o

آج کم و بیش بیس سال ہوئے ہوں گے قلب کی شکایت کے سلسلے میں سردی کی ایک رات کو ایک دوست کی وساطت سے پہلی بار ڈاکٹر صاحب کی کلینک پہ حاضر ہوا تھا، کس شرافت و شگفتگی سے مرحوم نے پذیرائی کی تھی۔ غیر معمولی توجہ اور ہمدردی سے تمام حالات سُنے، جتنے طریقے چیک اَپ کے ہو سکتے تھے، وہ عمل میں لائے۔ جن میں ایک الکٹرک کارڈیوگراف E.C.G. بھی تھا۔ دوائیں اپنے پاس سے دیں پھر جس عزّت و محبت سے ساتھ لے کر کلینک سے باہر آئے اور خدا حافظ کہا وہ تمام باتیں اس وقت کس بے قراری سے یاد آتی ہیں جب سے تا دمِ آخر مرحوم نے اس تعلق کو اس طرح نبھایا جیسے وہ میرا شمار اپنے مخصوص دوستوں اور عزیزوں میں کرتے ہوں۔

مرحوم جتنے اچھے شخص تھے اتنے ہی اچھے مسلمان۔ وہ ہر ایک کے درد و دشواری میں سہل الحصول تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جن نعمتوں سے نوازا تھا ان کو انھوں نے دوسروں کے لیے مستقلاً وقف رکھا۔ فرض شناسی، کردار کی بلندی اور پاکیزگی، دلیری اور دریا دلی کا موقع یا معرکہ ہو تو مرحوم کسی قسم کی تفریق، دوست دشمن تک کی تفریق کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کا دشمن بھی ان کی دوستی کو اپنی دشمنی سے بالاتر سمجھنے پر مجبور تھا۔ اس بارۂ خاص میں وہ مسلمانوں کی عظیم روایات کے بڑے معتبر نمائندہ تھے۔ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کے احتجاج میں جو بڑا اجتماع لکھنؤ میں ہوا تھا اور ڈاکٹر صاحب نے آزارِ قلب کے شدائد اور خطروں کی مطلق پرواہ نہ کرتے ہوئے اور ان رعایتوں کے باوجود جو حکام اعلیٰ ان کی صحت اور سلامتی کے پیشِ نظر ان کے لیے

ملحوظ رکھنا چاہتے تھے اپنے آپ کو رضا کارانہ نہیں بلکہ زبردستی قید و بند میں دے دیا اور اس کے بعد بھی جب تک ان کے تمام ساتھی باہر نہیں آگئے، انھوں نے جیل کے باہر قدم نہیں رکھا اور حکام کی اس پیش کش کو منظور نہیں کیا کہ وہ ساتھیوں سے پہلے جیل سے باہر آ جائیں۔ ایسا واقعہ ہے جو نہ ہم کبھی بھلا سکیں گے نہ اس عہد کی ہماری تاریخ فراموش کر سکے گی۔ علی گڑھ کے نہ ہوتے ہوئے علی گڑھ سے مرحوم کا یہ شغف و شیفتگی ایک بڑی حقیقت کی دلیل ہے جو سمجھ میں آتی ہے بیان میں مشکل سے آتی ہے۔ مثلاً جیسے علی گڑھ ہماری حمیت کی نشانی، ہماری زندگی کی دلیل اور ہماری پائندگی کی بشارت ہو۔

دہلی کے مشہور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو بھی میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور ان کے مہر و محبت سے بہرہ مند ہوا ہوں۔ انھوں نے میرا علاج جس شفقت سے کیا وہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا اور یہ اُس وقت کی بات ہے، جب میں ایم۔ اے۔ او کالج کا معمولی طالب علم تھا اور ڈاکٹر انصاری کا شمار ملک و ملّت کے سر برآوردہ پیشواؤں میں ہوتا تھا۔ بڑائی کی ان میں بڑی نشانیاں تھیں، وہ نشانیاں ڈاکٹر فریدی مرحوم میں بھی جس درجہ واضح ملتی ہیں۔ ان کا خیال کرتا ہوں تو کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے، کیسی خوشی ہوتی ہے، لیکن اس خوشی کا حزیں احساس بھی کچھ کم نہیں ہے، دونوں کی خدمات، اخلاص، شہرت، شخصیت یہاں تک کہ مردانہ اور شریفانہ شباہت میں بھی مماثلت ملتی ہے۔ دونوں بڑے کھلے ہاتھ اور کھلے دل کے تھے۔ دونوں امراضِ قلب کے ماہر معالج تھے، دونوں آزارِ قلب کے بہانے اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے۔ سیاست کے فساد اور فضیحتے سے نمٹنے کی مجھ میں مطلق صلاحیت نہیں، اس وادی میں کبھی قدم نہیں رکھے لیکن اتنا بڑے اعتماد اور افتخار سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر فریدی کی سیاست اور سیرت دونوں ایک ہی سکہ کے دو رُخ تھے۔ سکہ بھی زرِ کامل عیار! ڈاکٹر انصاری کی وفات پر دعا مانگی تھی کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو ان کے حسنات کی فردوس میں جگہ دے، ڈاکٹر فریدی مرحوم کے لیے بھی خدا سے اسی رحمت و مرحمت کا خواستگار ہوں۔

آزادی ملنے اور ملک کے تقسیم ہو جانے کے بعد سے مسلم سیاست کے کاروبار میں کسی مسلمان لیڈر کا کھرا اور نڈر رہنا معمولی بات نہیں تھی۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر فریدی یقیناً غیر معمولی

تھے۔ان کی سیاست الہامی ہو یا نہیں اس میں کسی قسم کا کھوٹ کھا چا نہ تھا۔ایک مدت سے ایسے ہندو یا مسلمان لیڈر نہیں دیکھے گئے جن کو ہر شخص ہندو مسلم تفریق کے الزام سے اُونچا جانتا اور مانتا ہو،ڈاکٹر فریدی اس الزام سے بری اور برتر تھے۔ان کے اس مسلک کی تعریف وتصدیق ہر مسلک خیال کے رہبر ورہنما نے کی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے حصولِ آزادی کے بعد ڈاکٹر فریدی نے مسلمانوں کی تنظیم وترقّع کی خاطر اپنی دولت جس طرح بے دریغ صَرف کی ہے کم ہی مسلم لیڈروں نے کی ہوگی۔مرحوم سے دوسرے درجے کا فعل مشکل ہی سے سرزد ہوا ہوگا۔حق و باطل کے معرکے میں بڑے نڈر تھے اور جہاں خلق ومروّت کا سوال ہے اتنے ہی نرم دل اور فیاض تھے۔

لکھنؤ کے اوّل درجے کے ڈاکٹروں میں شمار ہوتا ہے لیکن برخلاف اوّل درجے کے ڈاکٹروں کے وہ مریضوں کو ذریعۂ آمدنی واستحصال نہیں سمجھتے تھے۔ان کی نظر مریضوں کی تھیلی پر نہیں اُن کے دُکھ درد پر ہوتی۔ یہ سعادت وسرفرازی آج کل کے بہت کم ڈاکٹروں کو نصیب ہے۔کیسی باغ وبہار طبیعت پائی تھی،لیکن بے تکلفی،بے اختیاری یا برہمی میں بھی زبان سے کوئی غیر متوازن کلمہ نہ نکلتا،نہ آدابِ محفل کی خلاف ورزی ہوتی۔لکھنؤ کے متوسط طبقہ کی بڑی دیر میں آنے والی اور بہت دیر میں جانے والی تہذیب کا بڑا اکمل اور دل کش نمونہ تھے۔تہذیب کا معیار اور اس کی محافظت متوسط طبقہ کی ہی ذمہ داری ہے اور اس کا امتیاز بھی۔

کوئی موقع ہو،وقت کتنا ہی تنگ ہو،علی گڑھ آنا ہوتا تو ملنے ضرور آتے۔ بہت خوش ہوتے اور اس کا اظہار ہنس بول کر اس طرح کرتے،جیسے نہ ان کو کسی بات کا فکر وغم تھا،نہ کسی فکر و غم کو میرے پاس آنے دیں گے۔آج کل دنیا جس ناگفتنی میں مبتلا ہے اور اچھے لوگ جس بڑھتے ہوئے مصائب ومحرومی سے دوچار ہیں،اس کا جب کبھی غیر معمولی احساس ہوا،دل نے پناہ ڈھونڈی اور ہمت خواہ ہوا تو دور اور نزدیک کے اعلیٰ اور اولوالعزم اشخاص یاد آنے لگتے تھے۔ ان میں ایک ڈاکٹر فریدی ضرور ہوتے۔سوچتا ہوں ڈھونڈتا ہوں اور آواز دیتا ہوں کہ اب یوپی کے مسلمانوں کی سیاسی رہبری کے لیے کون سربکف میدان میں آئے گا،تو لکھنؤ ہی کے ایک نام ور شاعر کا مصرعہ یاد آتا ہے ع

اللہ رے سنّاٹا آواز نہیں آتی

کچھ دن ہوئے مرحوم کا ایک خط ملا تھا، حسبِ معمول میری صحت کے بارے میں دریافت حال کیا تھا۔ مسلمانوں میں سیاسی انتشار کا ذکر تھا، جس سے وہ دوچار تھے۔ اپنی بعض تحریروں وتقریروں کی نقلیں بھی بھیجی تھیں، میں نے اکبر کا یہ شعر لکھ کر بھیج دیا تھا۔

ہر چند بگولہ مضطر ہے اِک جوش تو اس کے اندر ہے
اک رقص تو ہے اک وجد تو ہے، بے چین سہی برباد سہی

اور عرض کیا کہ صحرائے نجد میں بگولہ ہی کا رول ادا کرنے میں بڑائی ہے جہاں انجام کو نہیں دیکھتے۔ فریضہ کی بجا آوری کو دیکھتے ہیں، آج بگولہ ساکت اور صحرا سنسان ہے۔ دیکھیے اب ع
کون ہوتا ہے حریف مے مردافگنِ عشق؟

بیگم فریدی کے نام اپنے مکتوب میں پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب نے لکھا ہے:

''خدا کے فضل سے ہر سانحہ کا کرب رفتہ رفتہ دور نہیں تو بہت کم ہو جاتا ہے۔ زندگی کا یہی دستور ہے لیکن اس کے ساتھ ایک گراں قدر فریضہ بھی لازم آتا ہے۔ مرحوم کی شخصیت بیش بہا صفات سے آراستہ اور بے نظیر خدمات سے مستحکم تھی۔ ان کی زندگی خیر و برکت کا سرچشمہ تھی، اس لیے پس ماندگان کو وہی راستہ اور روایت اختیار کرنا پڑیں گے جو مرحوم نے چھوڑے ہیں۔ جس طرح قانون کی رو سے مرحوم کی مالی ملکیت پر قبضہ پانے کا حق ان کے ورثا کو حاصل ہوتا ہے اس سے کچھ زیادہ ہی اخلاقی ذمہ داری ورثا پر مرحوم کی چھوڑی ہوئی اعلیٰ روایات اور خدمات کی طرف سے عائد ہوتی ہے۔ مرحوم کی چھوڑی ہوئی روایات معمولی نہیں ہیں، ان کی روایات کو ہر حال میں ہر قیمت پر نباہنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے! آپ اور آپ کے خاندان کے چھوٹے بڑوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور ہماری تربیت اور ترقی کے لیے ایک نیا ڈاکٹر فریدی جلد ظہور میں لائے۔ آمین!''

(مطبوعہ۔ روزنامہ 'دعوت'، دلی، 12 جون 1974)

●●●

شیخ نیازی

نیازی رشید، رشید صاحب کے چوتھے بیٹے کا نام ہے۔ نیازی رشید 1932 میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے علی گڑھ سے ایم۔اے انگلش میں کیا، اور آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ پیڑ پودوں کی دیکھ بھال اور آرائش (Floticulture) کے شوقین اور ماہر ہیں۔

رشید صاحب نے ان ہی نیازی کے بچپن کی داستان کو مزاحیہ انداز میں تحریر کیا تھا جو سب سے پہلے 'پیامِ تعلیم'، دہلی، کے سال گرہ نمبر نومبر دسمبر 1937 میں شائع ہوا تھا۔

رشید صاحب نے کئی اور مضامین بچوں کے لیے لکھے تھے جو 'پیامِ تعلیم' میں شائع ہوئے۔ دو مضامین 'طوطا کہانی' اور 'مسجد کا قیدی' شامل کر کے شیخ نیازی کو کتابی صورت میں پہلی بار سرسید بک ڈپو، علی گڑھ سے 1958 میں شائع کیا۔ جامعہ اُردو علی گڑھ کے نصاب برائے ادیب میں بھی شامل ہے۔ مرتب

o

کچھ دن ہوئے میری ملاقات شیخ نیازی سے ہوئی۔ ایسی حالت میں کہ اُن کی آنکھیں تھیں لیکن کسی کو پہچان نہیں سکتے تھے۔ کان تھے لیکن کسی کی سنتے نہ تھے۔ زبان تھی لیکن بول نہ سکتے تھے۔ ناک تھی لیکن خوشبو، بدبو میں فرق نہ کر پاتے، ہاتھ پاؤں تھے لیکن چل پھر نہ سکتے تھے۔ ان باتوں کے ہوتے ہوئے بھی اُن سے دوستی ایسی ہوئی کہ ان کے بغیر مجھے چین نہیں۔ گو اب تک یہ نہ معلوم ہو سکا نہ یہ بات کبھی دھیان میں آئی کہ خود شیخ صاحب کا میرے بارے میں کیا خیال ہے۔

شیخ کو کھانے پینے کا شوق ہے۔ اگر روک تھام نہ کی جائے تو کھانے پر کبھی ترس نہ کھائیں، اس لیے اُن کو بے تک بے تکان کھانے پینے سے باز رکھا جاتا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو اس سلوک سے اس درجہ ناراض ہوتا کہ تمام عمر میرا منہ نہ دیکھے لیکن شیخ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا میں ہر چیز کھانے پینے کے لیے بنائی گئی ہے، چاہے مار ہی کھانا کیوں نہ ہو۔ شیخ کی شکل وصورت بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ تربوز جیسا منہ ہونٹ موٹے جیسے تنوری روٹی کے حاشیے، ناک چھوٹی، گاجر کی مانند، دہانہ ایسا کہ مسکرائیں بھی تو باچھیں کانوں کی لو تک پہنچ جائیں اور رونے میں اسے کھول دیں تو خاصا بڑا ٹماٹر منہ میں آجائے۔ آواز ایسی پاٹ دار کہ ایک ہی نعرہ میں پاس پڑوس کے سارے شیخ شودر ہی نہیں چرند پرند تک چونک پڑیں اور ادھر اُدھر دیکھنے لگیں، لمبے کم چوڑے زیادہ، نہ سردی کی خوشی نہ گرمی کا غم، آنکھیں نڈر اور بہت بڑی۔

ایک بار ایک صاحب نے بہت قریب سے ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ شیخ صاحب آنکھ تو کیا جھپکاتے ٹارچ کی طرف اس طرح دیکھتے رہے گویا وہ بھی کھانے کی کوئی چیز تھی، لیکن ذرا دور تھی!

شیخ کو اچھا پہننے اوراوڑھنے کا بالکل شوق نہیں۔ اکثر دوسرے بھائی کا کپڑا اُلٹا سیدھا پہنا دیا جاتا ہے تو اسی میں مگن رہتے ہیں۔ لوگ چڑاتے یا طعنہ دیتے ہیں کہ فلاں بھائی یا بہن کی اُترن ہے تو اُن کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کہتے ہیں: ''اُترن کیا! یہ صدری ہے۔ خود اماں بی نے پہنائی ہے۔''

لیکن آدمی کی طبیعت کچھ اس طرح بنی ہے کہ شک شبہ کی کوئی بات کان میں ڈال دی جائے تو وہ کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی رنگ لا کر رہتی ہے۔ چنانچہ اُترن والی بات اُن کے ذہن سے اُتری نہ تھی بلکہ کسی کونے میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ البتہ وہ جس رنگ میں ظاہر ہوئی وہ طعنہ دینے والوں کے لیے مایوسی کا باعث ہوئی۔ ایک دن اُن کے بڑے بھائی ستھرے اور خوش لباس میں نظر آئے، دوسرے دن انھوں نے کہا۔ ''اب پہن چکے اُتارو، میں پہنوں گا!'' بھائی نے اُن کا مذاق اُڑایا۔ شیخ نے ذرا بھی بُرا نہ مانا بلکہ تھوڑا مسکرائے کچھ پینترا بدلا اور چھلانگ مار کر عذرا پر جا گرے۔ یہ کہتے ہوئے کہ اچھا میلا ہونے دو تب اُتارو گے۔

شیخ کو صاف ستھرا رہنے کا بالکل شوق نہیں، جہاں کہیں مٹی، کوڑا، کیچڑ، پانی دیکھا بیٹھ گئے، اور داس گیان دھیان اور لطف و اطمینان سے گویا صاف ستھری چاندنی قالین پر گدّے پر براجمان ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ جتنے زیادہ میلے کپڑوں میں یا ناصاف جگہوں پر نظر آئیں، اتنے ہی مجھے خوب صورت اور بھاری بھرکم معلوم ہوتے ہیں۔ دوسروں کا بھی یہی خیال ہے کہ اس حلیہ میں شیخ کا رعب زیادہ پڑتا ہے۔

ایک دن میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ''شیخ تم نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ نہانے دھونے کے بعد ذرا دیر تو صاف ستھرے رہا کرو۔'' انھوں نے ڈرتے ڈرتے اپنی ناک پر ہاتھ پھیرا اور اس کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد کچھ اس انداز سے بولے جیسے انھوں نے میرا کہا سُنا معاف کر دیا ہو۔'' میں کب نہایا تھا، عذرا نے نہلا دیا تھا؟ صاف رہنے کے لیے جو بار بار تاکید کی

جاتی ہے اور کہنا نہ ماننے پر اُن سے سختی سے پیش آیا جاتا ہے اس سے یہ بہت گھبراتے ہیں۔ کھل کر کچھ نہیں کہتے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے صفائی کی طرف سے اُن کے دل میں میل آ گیا ہو۔ ایک دفعہ انھوں نے کافی دیر تک صاف ستھرا رہنے کی مصیبت جھیلی، ماں نے یہ دیکھ کر اُن کی بڑی تعریف کی اور گود میں لے کر پیار کیا۔ یہ تکلفات ختم ہوئے تو بڑی حیرت سے بولے۔ ''اماں جی اب یہ کپڑے میلے کب ہوں گے۔''

شیخ کے دو بڑے بھائی، اقبال اور احسان ہیں اور دو بڑی بہنیں سلمیٰ اور عذرا۔ گھر بھر میں شیخ کو صرف عذرا پر اعتبار ہے۔ یہ شیخ کی تمام کمزوریوں اور کارناموں سے واقف ہیں۔ بہت دنوں بعد اُن کی یہ عادت چھوٹی، ورنہ ہر چھوٹی بات کے آخر میں ضرور کہتے تھے ''ہاں عذرا'' اور عذرا شاید ہی کبھی ان سے اختلاف کرتیں۔ عذرا اُن کی عمر کی تھیں۔ ایک دن مجھے عینک اُتارتے ہوئے دیکھ کر بولیں۔ ابّا میاں آپ عینک اُتار دیتے ہیں تو دوسرے کے ابّا میاں معلوم ہونے لگتے ہیں۔ عذرا کی بڑی بہن سلمیٰ ہیں ان کا کام دونوں کو چڑانا اور اُن پر ہنسنا ہے۔

دونوں بہنیں اسکول کی ابتدائی جماعتوں میں ایک کلاس آگے پیچھے تھیں۔ سلمیٰ ایک سال اپنے درجے میں رہ گئیں۔ اس کا انھوں نے بڑا غم منایا۔ ہم سب نے ان کو سمجھایا اور تسلی دی تو کچھ سنبھل گئیں۔ شام کو عذرا کو خیال آیا کہ چھوٹی بہن کی حیثیت سے انھوں نے سلمیٰ کا غم غلط کرنے میں حصہ نہیں لیا، اور یہ بہت بڑی چوک ہوئی۔ چنانچہ بڑی یگانگت سے سلمیٰ کے پاس بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر تک اپنے ہاتھ کے ناخن اور سلمیٰ کی تیوریاں باری باری دیکھتی رہیں اور جب دونوں طرف سے اطمینان ہو گیا تو بولیں کہ آپا روتی کیوں ہیں؟ یہ تو بڑا اچھا ہوا۔ اب ہم ایک کلاس میں بیٹھا کریں گے۔ اپنی کتابیں مجھے دے دو، میں اپنی آپ کو دے دوں گی۔ میری کتاب پڑھ کر میری طرح آپ بھی پاس ہو جائیں گی۔

ہمدردی کی یہ باتیں سن کر سلمیٰ نے اُن کو ایک چانٹا رسید کیا اور پھر سے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ عذرا بے چاری بھونچکا ہو کر ایک طرف جا کھڑی ہوئیں، کہ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

شیخ کی بڑی کمزوری ان کا کھانے پینے کا شوق ہے۔ اس شوق کے پیچھے ایک بار ہاضمہ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اُن کے کھانے پینے کی نگرانی کی جانے لگی اور شیخ کی زندگی تنگی تُرشی سے

بسر ہونے لگی۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دست آنے کو کھانے پینے سے کیا سروکار۔ عذرا سے پوچھا! کیوں آپا یہ دست کیوں آتے ہیں؟ انھوں نے بتایا زیادہ کھا جانے سے کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر بولے۔ ''اور زیادہ کس کو کہتے ہیں۔'' عذرا نے اُکتا کر کہا زیادہ کہتے ہیں کبابوں پر کباب ٹھونسے جانے کو۔ یہ سن کر شیخ کے چہرے پر رونق آ گئی اور مسکرا کر بولے، جیسے عقل کے معاملے میں عذرا منہ دکھانے کے قابل نہ رہ گئی ہوں۔ آپا کباب نہیں، میں نے تو گولریں کھائی تھیں۔''

شیخ کو دست آتے رہے۔ ایک دن ماں سے پوچھنے لگے، دست آنے سے کیا ہوتا ہے؟ ان کو بتایا کہ اس سے آدمی کمزور ہو جاتا ہے، کھیل کود نہیں سکتا۔ اس کو گھومنے پھرنے اور کھانے پینے نہیں دیا جاتا۔ پوچھا یہ کب بند ہوں گے؟ کہہ دیا کہ دوا پیتے رہو گے اور کھانا پینا کم کردو گے تو بند ہو جائیں گے۔

اتفاق سے اس زمانے میں میرے ہاں ایک شاعر آئے۔ دُبلے پتلے چھوٹے قد کے، طور طریقہ نہایت نپا تُلا بات بات پر ہاتھ جوڑتے اور تعظیم دیتے اور جیسا کہ شاعروں کا قاعدہ ہے مصرعہ اُٹھانے، کرایہ ادا کرنے اور دسترخوان پر ہاتھ بٹانے کے لیے کچھ شاگردوں اور ہاں میں ہاں ملانے والوں کو بھی ساتھ میں لائے۔ تھوڑی دیر تک میں اُن کی اور وہ میری تعریف کرتے رہے۔ انھوں نے میری تعریف جلد ختم کردی، لیکن میں باز نہ آیا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ میں نے تعریف بند کی تو ان کے شعر کی تعریف کرنی پڑے گی۔ اس دوران میں اللہ کی رحمت کا منتظر رہا کہ ان کے مصرعہ اُٹھانے سے قبل وہ مجھے ہی اُٹھا لے۔

اتنے میں اندر سے آواز آئی اور میری جان میں جان آئی۔ چائے کے ساتھ کچھ پھل مٹھائی اور آگے پیچھے شیخ صاحب تھے۔ مہمان عزیز کو جو چیز پیش کی جاتی، ہاتھ جوڑ کر بڑی مسکینیت کے ساتھ رد کردیتے۔ میں گھبرا رہا تھا کہ وار خالی گیا تو میں مارا گیا۔ چنانچہ جان پر کھیل کر اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ حضور التفات نہ فرمائیں گے تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ شیخ صاحب کے کان کھڑے ہوئے اور سیدھے میری گود میں آ کر بیٹھ گئے اور ہاتھ سے میرا منہ اپنی طرف کرتے ہوئے بڑے پیار کے لہجے میں بولے۔ ''ابا میاں ان کو کچھ نہ دیجیے ان کو دست آتے ہیں۔ ان کی اماں بی نے کھانے کو منع کردیا ہے۔''

شاعر، ان کے ساتھیوں اور اس خاکسار پر کیا گزری، اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔

محفل[1] درہم برہم ہوگئی اور شیخ مجھے اور چائے کے خوان کو میدانِ جنگ سے صاف نکال لائے۔

دن کسی کے ایک سے نہیں رہتے۔ شیخ کے دستوں کا بھی یہی حال ہوا۔ ایک دن پائخانہ میں آواز دی۔ عذرا آپا۔ اے عذرا آپا۔ دوڑ و جلدی آؤ۔ عذرا گرتی پڑتی پہنچیں اور ان کو جیتا جاگتا پاکر خاصی بے لطف اور کسی قدر تُرش[2] ہوکر بولیں۔ ''بولو کیا آفت آگئی ہے؟'' انھوں نے بغیر کچھ بُرا مانے کہا۔ ذرا قدمچہ[3] میں تو دیکھئے عذرا نے دیکھ کر کہا۔ ''دیکھ تو لیا کیا ہوا ہے؟'' بولے۔ ''دیکھتی نہیں پاخانہ گُھل ہوگیا۔ اب تو گوشت کھانے کو ملے گا؟''

شیخ صاحب کو پہلے پہل الموڑا جانے کا اتفاق ہوا۔ سادھو سنت کو گرہستی سے کیا سروکار، ایک دن جڑی بوٹی کی تلاش اور پرماتما کی یاد میں

نکل گھر سے بس راہ جنگل کی لی[4]

کسی جھاڑی میں خوش رنگ پھل لگے ہوئے تھے۔ دنیا پھر دنیا ہے۔ شیخ نے پھل توڑ کر منہ میں رکھ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منہ کے اندر آتما پرماتما کی کھینچ تان شروع ہوگئی۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے۔ زبان کھنچنے لگی۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ گرتے پڑتے گھر واپس آئے۔ دوڑ دھوپ کی گئی۔ تھوڑی دیر میں آنکھیں کھول دیں اور چند دنوں تپسیا[5] کرکے اچھے ہوگئے۔ شیخ صاحب کچھ

---

1. تتر بتر

2. تُرش کھٹے کو کہتے ہیں۔ یہاں خفا ہونے سے مُراد ہے۔

3. چھوٹی اُونچی چبوتریاں جن پر پاخانے کے لیے پاؤں رکھ بیٹھتے ہیں۔

4. میر حسن کا پورا شعر یہ ہے:

نکل گھر سے بس راہ جنگل کی لی — نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی

5. ہندی لفظ ہے اس کا مطلب ریاضت و عبارت سے ادا ہوتا ہے بس یوں سمجھ لو کہ فقیر یا سادھو اپنے دل کی خواہشوں کو مارنے مٹانے یا خدا کو خوش کرنے کے لیے جو مشقت کرتے ہیں اس کو تپسیا کہتے ہیں۔

دن قید و بند میں رکھے گئے۔ ایک دن ہر طرف بادل چھایا ہوا تھا۔ روئی کے گالوں کی طرح نزدیک کی چیز بھی بھائی نہ دیتی تھی۔ شیخ صاحب آنکھ سے اُوجھل ہو گئے مکان کے اندر شور اُٹھا

ع بند سے دیوانہ رہا ہو گیا[1]

مکان کے کچھ فاصلے پر ایک ڈھلوان پر گہرا کھڈ تھا جس پر کٹیلے درخت اور جھاڑیوں کا سلسلہ دور تک جا کر گہرائی میں گم ہو گیا تھا۔ جھاڑیوں میں جنگلی بیر لگے ہوئے تھے۔ شیخ مدتوں سے ان کی تاک میں تھے، آج موقع مل گیا۔ اُچک کر پیڑوں پر ہاتھ مارا کہ بابا آدم[2] بہشتی ڈراما آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ آدم تو اس گناہ کی سزا میں آسمان سے پھینکے گئے تو سیدھے زمین پر آ رہے۔ شیخ صاحب آسمان سے گرے تو ببول میں[3] اٹکے۔ گلے بازی کام آ گئی۔ لوگ تلاش میں تھے ہی۔ آواز سن کر دوڑے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ شیخ ایک جھاڑی میں خرگوش بنے لٹکے ہوئے ہیں۔ خیریت یہ ہوئی کہ جو کملی جسم پر تھی اُس نے اس طرح کی اونچ نیچ بہت دیکھی تھی۔ اس نے آخری بار جان پر کھیل کر شیخ کو بچا لیا۔ بڑی مشکل سے گھسیٹ گھسات کر باہر نکالے گئے۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ صرف جہاں تہاں کچھ کھر ونچے آ گئے تھے۔ البتہ پوشش ایسی نہیں رہ گئی تھی کہ پھر شیخ صاحب کے لیے کام میں لائی جا سکے۔ اس کو پورے فوجی رکھ رکھاؤ کے ساتھ جھاڑی پر لٹکا دیا گیا تاکہ دوسرے شیخ صاحبان کو معلوم ہو کہ اس سے پہلے گزرنے والوں نے کہاں تک راستہ طے کر لیا تھا اور اس منزل کے کتنے کانٹے شیخ وحشی کے ساتھ نکل چکے تھے۔[4]

---

1 پورا شعر یوں ہے:

شہر کے لڑکوں کی آئی مراد بند سے دیوانہ رہا ہو گیا

2 بتایا گیا ہے کہ حضرت آدم نے بہشت میں گیہوں کو ہاتھ سے توڑا تھا اس لیے ان کو سزا کے طور پر زمین پر پھینک دیا گیا۔

3 آسمان سے گرا ہوا ببول میں اٹکے، کا مطلب یہ ہے کہ ایک مصیبت سے چھوٹے دوسری مصیبت میں پھنس گئے۔

4 ثاقب کا یہ شعر یاد رکھیے اور اس کا مطلب اپنے بزرگوں سے پوچھیے۔

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

کچھ دیر تک ہم سب شیخ صاحب سے اُلجھتے رہے۔ پھر یہ دیکھا کہ اس حادثے کا اثر ان پر کافی ہے۔ ڈھول دھپے کے بجائے دل لگی و دلاسے سے کام لیا گیا اور ان کو عذرا کے سپرد کر دیا گیا جنھوں نے ہم کو دکھانے کے لیے اُن کو تھوڑا سا جھڑکا جھنجھوڑا۔ لیکن جب ان کو لے کر آگے بڑھیں تو ان کے سر اور چہرے کو اپنے دوپٹے سے پونچھا اپنی انگلی اُن کے ہاتھ میں دی۔ مکان پہنچ کر منہ ہاتھ دُھلوایا، کپڑے بدلے اور کھلا پلا کر ان کو پھر ویسا ہی کر دیا جیسے کہ پہلے تھے۔

شیخ صاحب شاعر اور گپّی بھی واقع ہوئے ہیں۔ عام طور پر ہمارے شاعر بھوکے اور گپّی پیٹ بھرے ہوتے ہیں، لیکن شیخ صاحب شعر اسی وقت کہتے ہیں جب پیٹ بھرا ہو۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ شیخ صاحب جس عمر اور حلیے کے ہیں، اس کے ہوتے ہوئے یہ شعر کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ سمجھ کا پھیر ہے۔ بچے بڑے اچھے شعر کہتے ہیں۔ جو بات دل کو بھائے یا بہلائے وہی تو شعر ہے۔ کسی بھولے بھالے تندرست بچّے کو دیکھیے اس کی ہر بات شعر میں ڈوبی ڈھلی ہوئی ملے گی۔ اپنے زمانے کے سب سے بڑے آدمی سے کسی نے پوچھا۔ آپ کو سب سے زیادہ خوب صورت کیا چیز نظر آئی تو انھوں نے جواب دیا۔ ''تندرست بچّہ تندرست ماں کی گود میں'' رہا حلیہ کا معاملہ تو بات یہ ہے کہ شاعر حلیہ کا ہوتا ہے یہی نہیں بلکہ وہ حلیہ بدلتا رہتا ہے۔ شعر کہتے وقت اس کا حلیہ کچھ ہوتا ہے، سُناتے ہوئے کچھ اور شعر کے دام مانگتے ہوئے تو بس اللہ دے اور بندہ لے۔[1]

شیخ کے کارنامے، ان کی زبان سے سنیے تو معلوم ہوگا کہ ایسی باتیں نہ کبھی ہوئیں اور نہ ہونا ممکن ہے۔ مثلاً ایک بھیڑیا آیا اور شیخ صاحب اُسے کھا گئے۔ چیونٹی نے ان کو ڈنڈا مارا اور انھوں نے ڈنڈا چھین کر پھینکا تو وہ الموڑہ جا گرا۔ حالاں کہ شیخ نے کبھی کوئی بھیڑیا نہ دیکھا تھا۔ صرف اس کا تذکرہ سنا تھا۔ اُن کو بتایا گیا تھا کہ بھیڑیا چھوٹے بچوں کو جو کہنا نہیں مانتے اُٹھا لے جاتا ہے اور کبھی کبھی کھا جاتا ہے۔ خیال یہ تھا کہ یہ بات اُن کے کان میں پڑے گی، تو یہ وقت بے وقت گھر سے باہر نکل جانے یا دوسروں کے حصے کی چیزیں کھا جانے سے باز رہا کریں گے۔

---

1. پریشانی اور مصیبت کے موقع پر بولتے ہیں۔

اس کا توڑ انھوں نے اس طرح کیا کہ خود بھیڑیے کو کھانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ صاحب کے ماں باپ جس تردّد میں مبتلا تھے وہ تو رہا اپنی جگہ پر، بھیڑیے کے ماں باپ اور تردّد میں پڑ گئے۔

اب رہا یہ کہ انھوں نے چیونٹی پر کیسا الزام لگایا اور ڈنڈے کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ یہ کچھ اس طرح کی باتیں ہیں جن کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتا۔ کھوج سے اتنا پتہ ضرور چلا کہ ایک دفعہ گھر میں شیخ ایسی جلیبیاں کھاتے پکڑے گئے جن پر کثرت سے چیونٹیاں چھائی ہوئی تھیں۔ نوکر نے شور مچایا تو گھر کے سارے چھوٹے بڑے جمع ہو گئے اور قریب تھا کہ اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا جو انھوں نے چیونٹیوں کے ساتھ کیا تھا کہ عذرا نے ایک قانونی پیچ ڈال دیا۔ انھوں نے کہا معاملہ عدالت ماتحت[1] کا نہیں بلکہ عدالت عالیہ[2] کا تھا۔ اس لیے ابّا میاں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ میں آیا تو یہ حاضر کیے گئے۔ جواب طلب کرنے پر انھوں نے ایک دوسرا جھگڑا شروع کر دیا۔ بولے، چیونٹیاں بھی تو جلیبی کھا رہی تھیں۔ اس کے جواب سے میری حالت کچھ ایسی ہوئی کہ اگر میں اس کو ظاہر ہو جانے دیتا تو شیخ صاف بری ہو جاتے۔ عدالت کا فضیحتا ہو جاتا۔ اتنے میں سلمٰی نے کہا۔ تمہارا قصور یہ نہیں کہ تم نے جلیبی کھائی بلکہ تم نے چیونٹیاں کھائیں۔ بے چاری چیونٹیوں نے تمہارا کیا قصور کیا تھا۔ عذرا نے جواب دیا۔ سلمٰی تمہاری زیادتی ہے، تم نے چہرۂ مبارک ذرا پہلے دیکھا ہوتا۔ چیونٹیوں نے بھی تو ان کو کھا جانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ کوئی شریف آدمی ہوتا تو صورت نہ پہچانی جا سکتی۔

میں نے دیکھا کہ عدالت نہیں رہ گئی تھی بلکہ مشاعرہ برپا ہو گیا تھا۔ اور اس طرح کے شوشے[3] نکلتے رہے تو معاملہ عدالت اور عوام دونوں کے قابو سے باہر ہو جائے گا۔ میں نے حکم دیا کہ آئندہ ایسا انتظام رکھا جائے کہ شیخ، جلیبی اور چیونٹیاں اکٹھا نہ ہونے پائیں۔

شیخ کا یہ بھی خیال ہے کہ ان کے بیوی بچے ہیں جن کے حصہ کی یہ مٹھائی اور پھل وغیرہ وصول کرتے رہتے ہیں اور خود ہی کھا پی لیتے ہیں۔ اس طرح کی بے جا تقسیم پر بعض لوگوں نے

---

1. عدالت ماتحت چھوٹی کچہری۔
2. عدالتِ عالیہ سب سے بڑی کچہری۔
3. شوشہ، جھگڑے کی بات۔

اعتراض کیا۔ اعتراض اس پر اتنا نہ تھا کہ ان کے بیوی بچّے ہیں یا نہیں، جتنا اس پر کہ یہ اپنی بیوی بچوں کا حصہ لیتے ہیں تو ان کو دیتے کیوں نہیں، خود کھا لیتے ہیں۔ اُن کو بُلا لیا گیا اور یہ گفتگو ہوئی۔

''تمھارے بیوی بچے ہیں؟'' ''ہاں ہیں۔'' ''کہاں ہیں؟'' ''الموڑہ میں''۔ ''کیا کرتے ہیں۔'' ''آڑو کھاتے ہیں۔'' ''اُن کا حصہ ان کو کیوں نہیں دیتے۔ خود کیوں کھا جاتے ہو؟'' ''وہ جو نہیں دیتے۔'' ایک طرف سے آواز آئی۔ ''ان کے بیوی بچّے بھیک مانگتے ہوئے پائے گئے ہیں۔'' اس کا جواب طلب کیا گیا تو سوچ میں پڑ گئے، لیکن جلد ہی بڑی بے فکری کے انداز میں فرمایا۔ ''ارے وہ کسی اور کے ہوں گے۔'' اور بغیر انتظار کیے ہوئے کہ اس جواب سے دوسرے مطمئن ہوئے یا نہیں، خود مطمئن ہو گئے۔

شیخ صاحب شاعر کے علاوہ گویّے بھی ہیں۔ شاعر کا گویّا یا گویّے کا شاعر ہونا تو کوئی اچنبھے کی بات ہے، نہ بُری بات۔ بڑے ہو کر سوچیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ صرف بات کا پھیر ہے ورنہ دراصل دونوں قریب قریب ایک ہیں۔ البتہ شیخ کا حال یہ ہے کہ وہ اُوٹ پٹانگ نثر میں ایک مصرعہ لیتے ہیں اور اپنے ہی بنائے ہوئے طرح طرح کے سُروں میں الاپ کر اس کے موزوں ہونے ہی کا نہیں بلکہ بھر پور شعر ہونے کا یقین کر لیتے ہیں۔

اس طرح کی دھاندلی شیخ بار بار کرتے رہتے ہیں۔

پُرانی چال کا معلّم ہونے کی وجہ سے میں نے شیخ کے اس فن میں فی[1] نکالی تو جواب میں انھوں نے پھر اسی طرح کا ایک شعر کہہ دیا۔ میں چپ ہو گیا اس لیے نہیں کہ شیخ کی بات میرے ذہن میں اُتر گئی تھی۔ بلکہ شیخ کی اس حرکت پر چھوٹے بڑے کچھ اس طور پر ہنس پڑے کہ میرے دل میں یہ شک گزرا کہ اس ہنسی کا رُخ کچھ میری طرف بھی تھا۔ اس لیے ایک خاص طرح کا گھونٹ پی کر چپ ہو گیا۔

شیخ تلفظ[2] کا جھگڑا کبھی مول نہیں لیتے، جس لفظ کو جس طرح چاہتے ہیں بولنے لگتے ہیں۔ اُن کی یہ حرکت مجھے اکثر کھٹکی اور میں نے اس کی کوشش کی کہ یہ لفظوں کی آبرو کا خیال

---

1. فی نکالنا۔ اعتراض کرنا، عیب نکالنا۔

2. لفظوں کو زبان سے ادا کرنا۔

رکھیں، لیکن سوچنے پر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ قدرت شیخ کے ذریعہ اپنی بات منوانا چاہتی تھی۔ یعنی وہی کرو اور ویسے ہی کرو جس میں آسانی ہو یا آرام ملے، جیسے دور اور پھیر کا راستہ ہو تو سڑک پر چلنے کے بجائے جلد سے جلد پہنچ جانے کے لیے ہم پگڈنڈی بنا لیتے ہیں اور اسی پر چلتے ہیں۔ اگر زبان سے کوئی لفظ مشکل سے ادا ہوتا ہے تو ہم سب کا دل یہی چاہتا ہے کہ اسے کسی طرح پیٹ یا چھانٹ کر ایسا بنالیں کہ زبان سے آسانی سے اور جلدی سے جلدی ادا ہو جائے۔ اسی لیے زبان کے جانکاروں کا کہنا یہ ہے کہ وہی زبان اچھی ہے جو آسانی سے بولی اور سمجھی جائے۔ شیخ نے اس بھید بھاؤ کو خود سمجھا ہو یا نہیں ہم کو سمجھایا بڑے مزے سے ہے۔

شیخ پانی برسنے کو ہمیشہ ''پانی بسرنا'' کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ الفاظ میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ سننے والے سمجھ دار ہوں تو کام بن جاتا ہے۔ بارش کا ہونا نہ ہونا اس پر نہیں ہے کہ پانی برسے یا بسرے۔ ایک بار عذرا سے بولے۔ آپا دِپ دِپو چلوگی؟ عذرا نے کہا۔ ''بُک ڈپو؟'' اُکتا کر بولے۔ ہاں ہاں وہی ''دِپ دپو'' جہاں کے منشی جی ہیں۔[1]

ایک دن سولن میں بارش ہو رہی تھی۔ بادل اور کُہر سے چاروں طرف دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ ہوا میں نمی اور تازگی تھی، دور سامنے پہاڑی پر رنگ برنگ کے گھر ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ہرے بھرے درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ میں تلے اُوپر کبوتر کے کابک رکھ دیے گئے ہوں۔ پہاڑی ریل اس طور پر گھڑگھڑاتی گونجتی گنگناتی گزرتی تھی، جیسے بڑے بڑے گورے یا بھونرے ایک کے پیچھے ایک چلے جا رہے ہوں۔ پاس کی پہاڑی سے مویشیوں کا گلہ سر جھکائے دھیرے دھیرے نیچی اُونچی پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔ جس کے گلے کی چھوٹی بڑی گھنٹیاں بجتی جاتی تھیں، جیسے پہاڑ کی دیوی پر سے آرتی اُتاری جا رہی ہو۔ چرواہا کوئی پہاڑی گیت گا رہا تھا۔ جس کی گونج پہاڑی کے معلوم نہیں کن کن دور اور نزدیک کے گوشوں سے ٹکراتی پھیلتی سننے والوں کے دل کی معلوم نہیں کن کن گہرائیوں میں ڈوبتی اُبھرتی، اس کو آس اور نراس کی وادیوں میں پہنچا دیتی۔

مکان سے ملا ہوا نیچے کی جانب مکّا کا کھیت تھا جس کی جتائی بوائی گھر والوں کی طرف سے ہوئی تھی، اور اس کا بٹوارہ اس طور پر کر دیا گیا تھا کہ ہر چھوٹا بڑا بچہ اپنے اپنے ٹکڑے کا زمین دار

1۔ جو شیخ صاحب کی بہت سی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔

اور کاشت کار دونوں تھا۔ کھیت کے بیچ میں ناشپاتی کا ایک چھوٹا سا درخت تھا، جس پر بیٹھ کر شیخ کھیت کی رکھوالی کرتے تھے۔ شیخ کے سپرد جو کام کیا تھا اس میں بھید یہ تھا کہ اس طرح ان کی اور کھیت دونوں کی رکھوالی ہوگی، اور ناشپاتی کی رونق بڑھتی رہے گی۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ ناشپاتی کی رونق جس تیزی سے بڑھتی گئی اس سے کہیں زیادہ تیزی سے اس کے پھلوں کی تعداد گھٹتی گئی۔

ایک دن شیخ صاحب جگر کا مصرعہ ''ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے'' گلے کی پوری طاقت سے اَلاپنے لگے۔ عذرا بولیں، ''کباب ہے۔'' شیخ فوراً شراب سے منہ موڑ کر کباب پر زور لگانے لگے، اتنے میں ایک طرف سے کڑاکا ہوا۔ اچھا بچہ پانی میں خوب بھیگو، کباب کے ساتھ ذرا جوتے کا بھی خیال رہے۔ شیخ سناٹے میں آگئے۔ نوکر کو آواز دی گئی جو انھیں اس طرح لایا جیسے بہت سا جھاڑ جھنکاڑ اکھیڑ لایا ہوں۔ بھیگے کپڑے اُتروائے گئے تو شراب یا کباب کے بجائے صرف ایک بُھٹا برآمد ہوا۔ ان کی حالت دیکھ کر اُن کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا گیا جو عموماً شرابی کبابی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بُھٹا چوں کہ انھوں نے اپنے ہی کھیت سے توڑا تھا اس لیے انھیں واپس کر دیا گیا۔ شیخ صاحب سر سے پاؤں تک بھیگے ہوئے تھے، اس لیے انگیٹھی لائی گئی اور یہ اس کے سامنے بٹھائے گئے۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ شیخ اسی انگیٹھی پر اپنا بُھٹا بھون رہے تھے۔ عذرا قصہ سنا رہی تھیں، اور کبھی کبھی شیخ کے بُھٹے میں شریک ہو جاتیں۔

ایک دفعہ ملازم چشمے سے پانی لینے جا رہا تھا، شیخ بھی ساتھ ہو لیے۔ ملازم اُن کی طرف سے غافل ہو گیا۔ چشمے سے ملا ہوا گڈھا تھا، جس میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ مچھلیوں نے آنکھ ماری یا شیخ نے، ٹھیک سے نہیں کہا جا سکتا۔ ''کود اترے گھر میں کوئی یوں دھم سے نہ ہوگا۔'' کہتے ہوئے شیخ مچھلیوں کی محفل میں جا دھمکے اور ڈبکیاں کھانے لگے۔ نوکر نے دیکھ لیا اور اُن کو پانی سے باہر کھینچ لایا۔''

نوکر سمجھ دار تھا۔ اس نے اپنی اور شیخ دونوں کی خیر اس میں دیکھی کہ ان کو چپکے سے عذرا کے سپرد کر دیا اور واقعہ سنایا۔ عذرا نے ان کو ٹھیک ٹھاک کر دیا تو یہ بولے۔ ''عذرا آپا پانی میں

ڈوبنے سے بڑا مزہ آتا ہے بس ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آسمان پر اُڑے چلے جارہے ہیں۔ ہے نہ عذرا۔'' عذرا نے ان کی شاعری کو سراہا، لیکن اس خیال سے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جو شاعر کو اس کی شاعری پر مار بیٹھتے ہیں۔ شیخ کو مشورہ دیا کہ اس کا حال اماں بی سے نہ کہنا ورنہ واقعی تم کو آسمان کی سیر کرادیں گی۔

شیخ کو ترتیب کے ساتھ صرف پندرہ تک گنتی آتی ہے۔ یوں گننے پر آتے ہیں تو لاکھوں کروڑوں تک گن ڈالتے ہیں۔ اسکول میں بارہ بجے چھٹی ہوجاتی تھی، اور یہ واپس آکر سیدھے کھانے پر ٹوٹ پڑتے۔ عذرا کے اسکول میں تین بجے چھٹی ہوتی تھی۔ وہ آتی تو اس کے لیے ناشتہ علاحدہ ہوتا۔ شیخ بھی پہنچ جاتے اور کھانے پینے میں زبردستی شریک ہوجاتے۔ روک تھام کی جاتی تو وہ دھینگا مشتی کرتے۔ یہ جھگڑا میرے سامنے لایا گیا۔ قہرن بولیں، اس طباقی[1] کو دیکھنا بارہ بجے آکر سب کچھ چاٹ پونچھ کر برابر کردیتا ہے۔ عذرا غریب تین بجے آتی ہے تو یہ اس کے کھانے پر بھی ڈاکہ ڈالتا ہے۔ شیخ غرا کر بولے۔'' عذرا تو تین ہی بجے آتی ہیں۔ میں جو بارہ بجے آتا ہوں۔'' عددوں کے اس پھیر کا کسی کے پاس جواب نہ تھا۔

شیخ صاحب ایک دن کودتے پھاندتے چلے جارہے تھے۔ ایک جگہ بڑا جغادری مینڈک بیٹھا ہوا تھا۔ چلائے عذرا دوڑو۔ عذرا پہنچیں، ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی آگئے۔ دیکھا تو شیخ مینڈک کے گرد شیو[2] کا رقص کررہے ہیں۔ عذرا بولیں، ارے یہ تو مینڈک ہے۔ فرمایا اور کیا دیکھو کیسا بیٹھا ہے، جیسے ''ثمر بہشت'' (آم) اس فقرہ کی سب نے اس طرح تعریف کی جیسے کسی اچھے شعر پر دل کھول کر مشاعرہ میں داد دیتے ہیں۔ اسی دوران سلمٰی نے پکارا۔'' اماں بی! ذرا چلی آیئے، وہ دوڑتی بھاگتی پہنچیں تو سلمٰی نے مینڈک کی طرف اشارہ کیا اور کہا دیکھئے منآ (شیخ کا گھریلو نام) بیٹھے ہیں۔

1۔ مولوی عنایت اللہ بی۔ اے دہلوی نے ایک انگریزی کتاب کا بچوں کے لیے ترجمہ کیا ہے جس کا نام زلفی ہے۔ یہ کتاب بڑی دلچسپ ہے۔ اس میں قہرن وطباقی کا حال پڑھو۔

2۔ شیو جی کے رقص (ناچ) ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کی ایک نظم ہے جو یوں ہے۔'' تصویر برنجی میں ہے رقصاں تن شیو جی''

شیخ کے معاملے میں سلمیٰ اور ان کی ماں میں اکثر نوک جھونک رہتی تھی، لیکن آج کے اس فقرے نے اماں کو اس طرح زچ کیا کہ وہ اپنے اَن گنت اور من مانے اختیارات ہوتے ہوئے کچھ نہ کر پائیں۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے انھیں کیا جانئے کیا خیال آیا اُٹھے اور اسکول چلے گئے۔ کسی کا کوٹ، کسی کی ٹوپی، ایک جوتا اپنا ایک کسی دوسرے کا، کمر بند ڈالنے کی سلائی بطور قلم، کتاب یا کاپی کے بجائے کوئی پھٹا پُرانا رسالہ کچھ دنوں اسی طرح آتے جاتے رہے۔ ایک دن واپس آئے تو کہنے لگے۔ ''میڈم نے بارہ روپے مانگے ہیں۔ داخلہ ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''ایسے اسکول میں داخلہ سے کیا فائدہ جہاں میڈم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ شیخ صاحب کے داخلے کی فیس لی نہیں بلکہ دی جاتی ہے۔'' فرمایا اور کیا۔ میں نے کہا، شیخ صبر کرو۔ بولے صبر کیا؟ میں نے کہا۔ ''وہی جس کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ بولے، اور کیا۔ میں نے کہا۔ ''پڑھ لکھ کر کیا کرو گے، قوم کو تم سے اور تم کو قوم سے اور کام لینے ہیں۔'' بولے، ''قوم کسے کہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ اس کا قصہ پھر کبھی سناؤں گا۔ اس وقت اتنا سمجھ لو کہ ایک طرح کی رسّی کو کہتے ہیں۔ جس کے سہارے جادوگر طرح طرح کے کرتب دکھاتے ہیں! شیخ نے کھڑے کھڑے ایک چھلانگ لگائی اور غائب ہو گئے۔

پڑوس میں ایک جگہ عورتوں کی پارٹی ہو رہی تھی اور جیسا کہ ایسی پارٹیوں کا قاعدہ ہے کہ عورتوں سے زیادہ تعداد بچوں اور بچیوں کی ہوتی ہے۔ ان سے زیادہ مکھیوں کی اور سب سے کم کھانے پینے کی چیزوں کی، شیخ صاحب بھی ایک طرف دم سادھے پر ماتما سے لو لگائے بیٹھے تھے۔

ایک بی بی نے کسی بچہ کو کچھ دینا چاہا۔ بچہ کی ماں بولیں۔ ''اسے مت دیجیے نقصان کرے گا۔'' اسی طرح وہ چیز بچوں کے سامنے پیش کی جاتی رہی، لیکن اُن کی ماؤں نے یہ کہہ کر دینے سے انکار کر دیا کہ شاید نقصان پہنچائے۔ ابھی شیخ صاحب کی باری نہیں آئی تھی، لیکن انھوں نے خطرہ بھانپ لیا اور فیصلہ کیا کہ گیان دھیان کا وقت نکل چکا۔ اب ہاتھ پاؤں مارنے کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ ایک بی بی نے اپنے بچّے کے لیے عذر کیا ہی تھا کہ ایک طرف سے آواز

آئی۔ ''مجھے نقصان نہیں کرتی'' شیخ کی آواز تھی۔ ساری محفل ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئی سوائے عذرا کے جو اپنے ہیرو کی اس حرکت سے بہت خفیف ہوئیں اور ایک طرف دُبک سی گئیں۔ تھوڑی دیر میں شیخ قریب آ گئے، منہ ناک ٹھوڑی اور دونوں ہاتھ اچھی طرح سے سَنے ہوئے ہانپتے ہوئے بولے۔ آپا منہ دُھلاؤ۔ عذرا بھری بیٹھی تھیں بولیں۔ ''جہنم میں جاؤ''۔ شیخ نے فرمایا۔ ''نہیں آپا اب گھر چلیے۔''

جس زمانے میں شیخ ماں کا دودھ پیتے تھے، ان کے سر اور چہرے پر کثرت سے پھنسیاں نکل آئیں۔ جن میں بڑی ٹیس اور جلن تھی، اور رات دن بے قرار رہتے۔ انہی دنوں ان کی ماں بھی بیمار پڑ گئیں اور تکلیف اتنی بڑھی کہ ہسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ شیخ کی پھنسیوں کا زور کم نہ ہوتا تھا۔ دودھ پیتا بچہ ہر تکلیف سے پناہ لینے کے لیے ہمیشہ ماں کی چھاتی کا سہارا ڈھونڈتا ہے، وہیں اس کو سکون ملتا ہے۔ شیخ کا بھی یہی حال تھا۔

ایک دن شام کے قریب ہسپتال پہنچا تو دیکھا کہ شیخ کی پھنسیوں پر کسی کالی دوا کا لیپ کر دیا گیا ہے۔ کسی نے ایک خاص پھل کو کوئلہ کر کے تیل میں ملا کر لگانے کو بتا دیا تھا۔ سر چہرہ اور گردن سیاہی سے بھر گئی اور مشکل سے جہاں تہاں کی جلد نظر آتی تھی۔ ماں کی چھاتی ان کے منہ میں تھی اور ماں بیٹے دونوں نڈھال ہو کر تھوڑی دیر کے لیے غافل ہو گئے تھے۔

شیخ کا یہ کالا پھنسیوں سے لدا ہوا ڈراؤنا چہرہ جو مشکل سے آدمی کے بچّے کا چہرہ معلوم ہوتا تھا! دوسری طرف ماں کا صاف شفاف خوب صورت سینہ بے قراری اور بے کسی میں کھلا رہ گیا تھا جس کا سِرا شیخ کے اَدھ کھلے منہ میں دکھائی دیتا تھا۔ کیسے بھیانک منہ میں کتنی حسین اور پاکیزہ چیز تھی، لیکن وہ بھیانک چہرہ تو ماں کے بچّے کا تھا جس سے زیادہ دنیا جہان میں اُس چھاتی کا کوئی حق دار نہ تھا۔ وہ سینہ اُس ماں کا تھا جو اس بھیانک چہرہ سے زیادہ دنیا کی خوب صورت اور قیمتی سے قیمتی چیز کو خاطر میں نہ لا سکتی تھی۔

کھلی ہوئی خوب صورتی اور کھلی ہوئی بدصورتی کا اس طرح اکٹھا ہو کر آدمی اور آدمیت کے لیے ایک چھپی ہوئی انمول سچائی بن جانا کیسی انوکھی بات تھی، اور ایک انوکھی بات سے دنیا کی کتنی اور کھلی اور چھپی ہوئی انمول سچائی کا بھید کھلتا تھا۔

لیکن دل پھر دل ہے وہ بھی مجھ جیسے معمولی آدمی کا دل اس نے پلٹا کھایا۔ شیخ اور ان کی بیمار ماں کی بے بسی کا یہ عالم دیکھ کر میرے دل میں غم و غصہ کے بھورے کالے بادل اس طرح اُمنڈنے لگے جیسے پورب دیس کی بھری برسات میں کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں، اور یہ وسوسہ پیدا ہوا جیسے میری غیر حاضری میں کسی آسیب نے دونوں کو بے بس پاکر اُن پر ظلم توڑا ہو اور اُن سے مجھے جو گہرا لگاؤ تھا اس کا مذاق اُڑایا ہے۔ پھر کچھ ایسا لگنے لگا جیسے میری محبت اور غیرت اس کا بدلہ لینا چاہتی ہے، اور جب تک بدلہ نہ لے لوں گا چین نہ آئے گا۔

یہ حالت بھی دیر تک قائم نہ رہی بس جیسے سورج پر سے بادل کا ٹکڑا گزر گیا ہو، جس طرح محبت اور غیرت کا جذبہ نفرت اور انتقام پر اُکساتا ہے اسی طرح خدمت اور قربانی کی اَتھاہ طاقتوں کو بھی اُبھارتا ہے۔ میرے دل میں یہ بات آئی کہ ان دونوں سے مجھے جو محبت ہے اس کو کسی سے نفرت اور عداوت کا بہانا بنانا ٹھیک نہیں۔ محبت کو تو خدمت ہی میں ڈھلنا چاہیے۔

میں نے شیخ کو آہستہ سے گود میں اُٹھالیا۔ انھوں نے آنکھیں کھول دیں اور مجھے دیکھ کر مسکرا دیے جیسے میرا شکریہ ادا کیا ہو۔ میں اتنا ان کو نہیں جتنا اپنے آپ کو ہمت دلانے کے لیے کہا۔ ''شیخ گھبرانا نہیں میں آگیا ہوں'' تم اچھے ہو جاؤ گے! توبہ توبہ یہ کس نے تمہاری صورت بگاڑ دی، ابھی دھو کر صاف کرتا ہوں۔ میں سر اور چہرے کو صابون اور گرم گرم پانی سے آہستہ آہستہ دھو ڈالا، اور زخموں پر پوڈر چھڑک دیا۔ اپنی شکل میں نظر آئے تو ایسا معلوم ہوا جیسے یہ اچھے ہونے لگے ہوں۔ ماں نے دیکھا تو ان کی بھی ڈھارس بندھی۔ کچھ دنوں میں اچھے ہو گئے، خوش خوش گھر واپس آگئے!

شیخ صاحب جن دنوں سولن میں تھے، لوگوں میں یہ چرچا تھا کہ سولن میں سکھ اور مسلمانوں میں جھگڑا ہوگا۔ شیخ نوکروں میں زیادہ اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ ان کو بتایا گیا تھا کہ سکھوں کے پاس کرپان ہوتی ہے، جسے وہ ہر وقت پاس رکھتے ہیں اور لڑائی میں کام میں لاتے ہیں۔ ایک دن شیخ صاحب ہم سب کے ساتھ گھر سے گھومنے پھرنے نکلے۔ اتفاق سے ان کا پاجامہ ڈھیلا ہو گیا۔ میں نے کہا۔ شیخ آؤ، کمر بند باندھ دوں۔ انھوں نے منع کیا، لیکن میرے اصرار پر قریب آئے۔ قمیص اور اچکن اوپر اُٹھائی تو نیفے سے لوہے کی چٹخنی (بولٹ) لٹکی نظر آئی۔

میں نے پوچھا، یہ کیا ہے۔تو کچھ چپ ہوئے کچھ ڈرے اور کچھ شرمائے۔آخر میں عذرا نے بتایا کہ ہم مئی گڑھ میں تھے تو باورچی نے ان کو بتایا تھا کہ سکھوں کے پاس کرپان ہوتی ہے، یہ اُس کا توڑ ہے۔ جب کبھی گھر سے نکلتے ہیں تو چٹخنی پاجامے میں لٹکا دیتے ہیں۔ ان کی جیب سے دیکھیے، دیکھا گیا تو بسکٹ کا ڈبہ کھولنے کا نوک دار ٹن اور چند ٹیڑھے سیدھے پتھر بھی برآمد ہوئے۔

عمر کے ساتھ شیخ کی عقل اور لمبائی چوڑائی بھی بڑھ گئی ہے، آواز زیادہ پاٹ دار ہوگئی ہے۔ابھی یہ اتنا لکھ پڑھ نہیں پائے تھے کہ ان کے بارے میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اُسے یہ خود پڑھ سکیں۔جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں نے ان کی جو باتیں ادھر اُدھر لکھیں، اس کو ان کے بھائی بہن کچھ اس طرح نمک مرچ لگا کر ان کو سناتے ہیں کہ یہ جامے سے باہر ہو جاتے ہیں اور اس کا اندازہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے کہ جامے سے باہر ہو کر شیخ کیا رنگ لاتے ہوں گے۔

اوّل تو میں نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی تھی جس سے یہ ناراض ہوتے، دوسرے یہ مجھ سے اکثر اقرار کر چکے ہیں کہ ان کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا وہ سب صحیح تھا۔البتہ عذرا نے مجھے بتایا کہ شیخ نے ایک دن ان سے کہا کہ ابّا میاں نے اور باتیں تو ٹھیک لکھیں صرف ایک بات خراب تھی۔عذرا نے پوچھا، وہ کیا۔تو بولے، وہی گتھل والی۔

شیخ صاحب کو گھر والے کبھی کبھی یوں بھی چھیڑ دیا کرتے ہیں۔اس وقت یہ ایک نعرہ لگاتے ہیں، جس سے سارے محلّہ میں خبر ہو جاتی ہے کہ شیخ نے ملک کی آزادی میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔لوگ جلد از جلد اپنے بچوں اور مرغیوں کو گھر کے اندر بلا لیتے ہیں۔ایسی حالت میں کوئی شخص شیخ کے قریب نہیں جاتا۔کچھ تو اس سبب سے کہ ان کے نعرہ میں ایکسرے[1] کی خاصیت ہے جو جسم سے پار ہو جاتی ہے۔آواز کو روشنی میں تبدیل کرنے کا سہرا چاہے جس کے سر ہو، یہ خیال اس نے کسی نہ کسی طرح شیخ کی چنگھاڑ سے لیا ہوگا۔یہی سبب ہے کہ لوگ چنگھاڑ کی سیدھ میں نہیں آتے۔دوسرے یہ کہ اس حال میں یہ کسی کو پکڑ پائیں تو پھر اسے اس طرح جھنجھوڑ ڈالتے ہیں کہ بہت دنوں تک زندگی کی ہر لذّت سے دل کھٹّا رہتا ہے۔

---

1 ایک مشین ہوتی ہے جس کے ذریعہ جسم کے اندر کی چیزیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اسی طرح ایک حادثہ کا حال سُن کر ایک دن میں نے جھنجھلا کر کہہ دیا اور میں یقین دلاتا ہوں، اس سے ان کی توہین نہیں بلکہ اپنی جھنجھلاہٹ دور کرنی تھی کہ پکڑ لاؤ اس گوریلے کو ذرا اس کی مرمّت کردوں۔ بات ختم ہوگئی تھی لیکن بعض باتوں کا خاصا یہ ہے کہ آپ چاہیں یا نہ چاہیں، وہ ختم نہیں ہوتیں، اور بعض لوگوں کا بھی خاصا ہوتا ہے کہ وہ بات ختم نہیں ہونے دیتے۔ چنانچہ گوریلے کے لفظ پر لوگوں نے چپکے چپکے ہنسنا شروع کیا۔ شیخ کے کان کھڑے ہوئے، ظاہر ہے جب کان کھڑے ہوئے تو بے تکی سے بے تکی بات بھی کان میں داخل ہو جاتی ہے۔

شیخ صاحب میرے پاس آئے اور نہایت غصیلی اور گونجیلی آواز میں بولے۔ دیکھئے سب لوگ مجھے گوریلا کہتے ہیں۔ شیخ کا تیور دیکھ میں خود سٹ پٹا گیا۔ میں نے کہا۔ ''آؤ بیٹھ جاؤ، سب نالائق ہیں، کب سے پانی مانگتا ہوں، کوئی سنتا نہیں۔ ذرا تم پانی لا دو، میں اس کا قصہ سناؤں۔'' شیخ کچھ ڈھیلے پڑے اور گلاس میں پانی لائے۔ میں نے پانی پیا اور جو بچ رہا اس کو اُن کے سر پر چھڑک دیا۔ میری اس بے تکلفی پر ہنس پڑے تو مجھے اطمینان ہوا۔

میں نے کہا۔ تم کو معلوم ہے گوریلا کہتے کس کو ہیں۔ انھوں نے جواب دیا۔ اقبال احسان ان کے دو بڑے بھائی کہتے ہیں کہ گوریلا ایک طرح کا ڈراؤنا بدشکل بندر ہوتا ہے۔

میں نے کہا۔ ان کو کیا معلوم گوریلا کسے کہتے ہیں۔ گوریلا معنی ہیں ''غوریلا'' پوچھا، غوریلا کیا ہے؟ میں نے عرض کیا۔ غور کرنے کے بڑے فائدے ہیں۔ ایک تو یہی دیکھو غوریلا ہمیشہ اچھے اچھے پھل کھاتا ہے۔

پوچھا۔ کون کون سے پھل؟ میں نے کہا۔ ''بس یہی امرود، آڑو، ناشپاتی، بھٹّے، اچھا بتاؤ تم کو کون سا پھل پسند ہے۔ فوراً بولے، ''امرود'' میں نے جیب سے اکنّی نکال کر اُن کے حوالے کی اور تاکید کردی کہ جوں ہی پھل والا آئے امرود خرید لینا۔ انھوں نے قہقہہ لگا کر ایک چھلانگ ماری اور میری جان بچ گئی۔

ایک بار شیخ کے دو بڑے بھائی کسی پارٹی میں بلائے گئے تھے۔ شیخ کو تاکید کردی گئی تھی کہ پارٹی میں نہ جائیں ورنہ خیر نہیں۔ بھائیوں کے چلے جانے کے بعد معلوم ہوا کہ شیخ غائب ہیں۔ سب نے ٹھان لیا کہ اگر یہ پارٹی میں گئے ہوں تو اس کا مزہ ان کو اچھی طرح چکھا دیا

جائے۔ تھوڑی دیر میں یہ کچھ تھرکتے، گنگناتے گھر میں داخل ہوئے۔ سب لوگ بھرے بیٹھے تھے۔ ایک دم اُن پر ٹوٹ پڑے۔ شیخ صاحب کچھ ایسے بھونچکے ہوئے کہ ہاں یا نہیں کی بھی طاقت نہ رہی۔ جرم یہ لگایا گیا تھا کہ یہ چھپ کر پارٹی میں گئے ہیں اور کھا پی کر واپس آئے ہیں۔ شیخ کا یہ حال تھا کہ ہر ایک کا منہ دیکھتے اور دنیا کی بے وفائی اور اپنوں کی بدنگاہی پر حیران تھے۔ میں داخل ہوا۔ ایک طرفہ بیان سُن کر میرے بھی پاؤں اُکھڑ گئے۔ میں نے کہا۔ سچ سچ بتا دو گے کہ پارٹی میں گئے تھے تو چھوڑ دیے جاؤ گے، ورنہ آج تمہاری خیریت نہیں۔ شیخ نے ایک بار ہر ایک کے چہرے کی طرف دیکھا۔ نرمی اور دوستی کا کہیں کسی پر نشان نہ تھا۔ تھوڑی دیر رُک کے پھر بولے۔ ہاں گیا تھا، لیکن شیخ نے جس طرح گناہ کا اقبال کیا تھا اور بے کسی و بے گناہی کی جو دھوپ چھاؤں اُن کے چہرے پر ہی نہیں سارے جسم پر نظر آئی، اس سے میں کھٹکا۔ دل میں یہ بات آئی کہ شیخ نے جان بچانے کے لیے وہی راستہ اختیار کیا جو ہم سے شاید ہر ایک کرتا۔ پھر میں نے جو شرط لگا دی تھی، وہ بھی نامناسب تھی یعنی صرف پارٹی میں شریک ہونا سچ تھا، باقی سب جھوٹ۔

مجھے رُکتا دیکھ کر مجمع کا جوش بھی ٹھنڈا پڑنے لگا۔ عذرا محافظ فرشتے کی طرح، شیخ سے ملی ہوئی اُن کے پیچھے کھڑی تھی۔ سلمیٰ نے دیکھ کر مسکرانا اور منہ بنانا شروع کر دیا۔ سلمیٰ کی یہ حرکت دونوں کی برداشت سے باہر معلوم ہو رہی تھی۔ عذرا اس کی منتظر تھیں کہ خطرہ دور ہو جائے تو سلمیٰ کو صلواتیں سناتے سناتے خود رو پڑیں، اور شیخ اس پر تُلے ہوئے تھے کہ ''رہائی کا حکم ملے تو سلمیٰ کو اس طرح بھنبھوڑ ڈالیں کہ مسکرانے کے نشان پھر کبھی ان کے چہرے پر نہ پیدا ہو سکیں۔''

اتنے میں دونوں بھائی پارٹی سے واپس آ گئے۔ اُن کو دیکھتے ہی شیخ نے چنگھاڑ ماری اور یہ کہتے ہوئے اُن پر ٹوٹ پڑے۔ ''کیا میں پارٹی میں گیا تھا؟'' یہ سارے لوگ ہائیں ہائیں کرتے دونوں کو بچانے کے لیے جھپٹے، لیکن شیخ نے اتنی ہی دیر میں ایک کی ٹوپی نوچ لی تھی اور دوسرے کی ناک۔ بیچ بچاؤ کرنے پر معلوم ہوا شیخ پارٹی میں نہیں گئے تھے بلکہ اس عرصہ میں جامن کے ایک درخت پر تشریف رکھتے تھے جہاں سے پارٹی نظر آ رہی تھی۔

شیخ اب اسکول جانے لگے ہیں۔ بڑی پابندی سے جاتے ہیں، اور بڑی مستعدی سے واپس ہوتے ہیں اور سیدھے وہاں پہنچتے ہیں جہاں سے کھانا تقسیم ہوتا ہے۔ سب سے اچھی پلیٹ

چُنتے ہیں، اور سب سے زیادہ کھانا لینا چاہتے ہیں۔ ایک دن اسکول سے جھومتے اکڑتے واپس آئے۔ بستہ ایک طرف ڈالا، ٹوپی دوسری طرف پھینکی، پوچھا۔ عذرا آپا کہاں ہیں؟

جواب کا انتظار نہ کر کے پکارا عذرا آپا آجایئے۔ ''آج بے ڈھب بات ہوئی۔'' عذرا آئیں، تو بولے۔ کھانے پر چلیئے تو بتاؤں گا۔ سب لوگ کھانے پر جمع ہوئے تو دیکھا کہ شیخ آج ہر کھانے پر بڑے فاتحانہ انداز سے ہاتھ مارتے ہیں اور کوئی روکتا ہے تو اس طرح گھور کر دیکھتے ہیں، گویا اُسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائیں گے۔

عذرا نے پوچھا۔ ''بھئی کیا بات ہے بولتے نہیں اور کھاتے چلے جا رہے ہو۔ بولے، آپ کو کیا معلوم'' آٹھ ہزار اور ہزار کو اس طرح کھینچا کہ خالی پلیٹیں اور گلاس کھڑکھڑاتے معلوم ہوئے۔ عذرا اُکتا سی گئیں اور کہا۔ ''سر پھر گیا ہے۔'' کہتے کچھ نہیں اور آٹھ ہزار کی رٹ لگائے جا رہے ہو؟ بولے۔ آج میڈم نے آٹھ ہزار کا جوڑ دیا تھا سب لوگ منہ دیکھتے رہ گئے۔

کھانا ختم ہونے پر اُن کے بھائی بہنوں نے مجھ سے کہا۔ ابّا میاں نیازی کا حساب بڑا اچھا ہے۔ آپ امتحان لیجیے۔ میں تیار ہو گیا۔ شیخ صاحب بلائے گئے، تیور سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی آٹھ ہزار کا نشہ نہیں اُترا ہے۔ میں نے کہا۔ بھئی شیخ تمہارے حساب جاننے کا سب پر بڑا رُعب ہے ایک آدھ سوال میں بھی کروں۔ کڑک کر بولے۔ ہاں ہاں! میں نے پوچھا۔ تمہاری عمر کیا ہے؟ بولے۔ چھ برس کی! میں نے پوچھا۔ ''عذرا کی؟'' بولے، مجھے نہیں معلوم! میں نے کہا۔ پوچھ کر بتاؤ؟ عذرا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ہاں آپا!'' عذرا نے کہا۔ ''سمجھ لو آٹھ برس!'' میں نے کہا۔ ''اچھا اب یہ بتاؤ کتنے سال میں تم عذرا کے برابر ہو جاؤ گے؟'' فوراً بولے۔ ''دو برس میں۔''

سوا عذرا کے سب نے اس جواب پر شیخ کو مبارک باد دی۔ میں نے عذرا سے پوچھا۔ ''کیوں عذرا تم نے اس سوجھ بوجھ کی تعریف کیوں نہیں کی تھی، تو سلمیٰ نے جواب دیا۔ ''ان کو اس بات کی کوفت ہوئی کہ نیازی ان کے برابر کیوں ہو گئے۔ عذرا گُھٹ کر رہ گئیں۔

کچھ دن پہلے شیخ کی حساب کی قابلیت کا معاملہ پھر سامنے لایا گیا اور مجھ سے فرمائش کی گئی کہ شیخ کا ایک بار امتحان اور لوں! میں نے پوچھا۔ ''شیخ تم کو اپنی عمر تو معلوم ہے۔'' بولے،

جی ہاں چھ برس کی۔ میں نے سوال کیا اور تمہاری اماں بی کی کیا عمر ہے؟ بولے۔ مجھے کیا معلوم! ''میں نے حیرت سے کہا، پوچھ کر بتاؤ۔''

اتنے میں ایک دوسرا حساب کتاب شروع ہو گیا۔ ماں بگڑ کر بولیں، یہ تم عمر کا جھگڑا کیا کھڑا کر دیتے ہو، کچھ اور پوچھنے کو نہیں رہا۔ میں نے عرض کیا، یہ تو بچوں کا کھیل ہے۔ اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے۔ بولیں، اگر بچوں کا کھیل ہے تو بچوں کو کھیلنے دو۔ تم کہاں سے عمر پوچھنے آ گئے۔ میں نے بھی کچھ گرم، لیکن جلد ہی اس سے زیادہ نرم ہو کر کہا۔ شادی کے وقت تو تمہارے ماں باپ نے میرے پوچھے بغیر تمہاری عمر بتا دی تھی اور آج اپنے بچوں کے پوچھنے پر بھی اپنی عمر نہیں بتاتیں۔ اس پر اور خفا ہو کر کہا۔ اچھا! میری عمر پچاس سال کی ہے بتاؤ؟ میں نے کہا۔ مجھے تو یاد آتا ہے،'' یہ عمر تم نے اپنی والدہ کی بتائی تھی۔'' غصہ میں رونے کے قریب ہو کر بولیں۔'' مجھے کیا پڑی تھی، میں کیوں بتاتی۔'' میں نے کہا۔'' اچھا جانے دو۔ کسی اور نے اور کی بتائی ہوگی۔''

اتنے میں شیخ نے پکارا۔'' ابّا میاں جلدی پوچھئے عذرا آپا نے انعام دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میں نے کہا۔ اچھا قریب آ جاؤ۔ آئے تو میں نے کہا۔'' اس وقت تمہاری عمر چھ سال کی ہے نا! کہا جی ہاں! میں نے کہا۔ فرض کرو تمہاری اماں کی چھبیس سال ہے، خوب سمجھ گئے۔ ہاں سمجھ گیا! میں نے پوچھا۔ اچھا اب بتاؤ جب تم پیدا ہوئے تھے تو تمہاری اماں کی کیا عمر تھی؟

شیخ نے سوچا۔ چہرہ پر مسکراہٹ آئی ناک، ہونٹ، دہانہ، ٹھوڑی، گال دھیرے دھیرے بڑھنے پھولنے لگے۔ کچھ جھومے اور قہقہہ لگا کر لوٹ گئے۔ پھر بولے سمجھ گیا، مجھ کو دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ ہاں عذرا آپا؟ عذرا نے اُکتا کر کہا۔ آخر کیا دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ جواب دو! بولے دیکھئے جب میں پیدا ہوا تھا تو بالکل ننھا منا سا تھا جیسے احمد، اُن کا چھوٹا بھائی جس کی عمر مشکل سے ڈیڑھ دو مہینے کی تھی۔ مجھے کیا معلوم اماں کی کیا عمر تھی۔

اس جواب کی ہر شخص نے داد دی، کسی نے چیخ کر کسی نے اُچھل کر اور بعضوں نے لوٹ پوٹ ہو کر۔ میں نے شیخ سے ہاتھ ملایا اور اُن کے سامنے جھک کر تعظیم دی۔ شیخ نماز کا بڑا خیال رکھتے ہیں، اتنا خیال کہ وقت ہو یا نہ ہو، جی میں آ گیا تو نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ پچھم

کی طرف منہ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتے، چاہا تو ہاتھ سامنے باندھ لیے چاہا تو پیچھے، کبھی کبھی بالکل چھوڑے رکھتے ہیں۔ ایک آدھ بار سر پر باندھتے ہوئے پائے گئے۔ جتنی دیر چاہتے ہیں کھڑے جھکے یا سجدہ میں رہتے ہیں۔ ایک دن میلے کپڑوں میں سے میز پوش نکال لائے اور اس پر نماز شروع کر دی۔ عذرا نے ٹوکا اور بتایا جس کپڑے پر نماز پڑھی جاتی ہے اسے صاف ستھرا ہونا چاہیے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ عذرا نے اپنا دوپٹہ رنگ کر سوکھنے کے لیے ڈال دیا تھا۔ شیخ نے اسی کو بچھا کر نماز شروع کر دی۔ عذرا سب کچھ برداشت کر سکتی تھیں، اپنے کپڑوں کے ساتھ اس طرح کی بے تکلفی گوارا نہ کر سکتی تھیں۔ اپنے کپڑوں کے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر شیخ کے قریب کھڑی تلملا رہی تھیں کہ باہر سے میں آ گیا۔ عذرا کو اس طرح بے بس اور بسورتے دیکھ کر لطف آیا، لیکن میں نے انجان بن کر پوچھا۔ خیریت تو ہے، اتنی پریشان کیوں ہو؟ شیخ کی طرف اشارہ کر کے بولیں۔ ''وہ دیکھئے۔'' میں نے کہا۔ شیخ کی نماز کا آدھا ثواب تم کو ملے گا۔ بڑے دردناک لہجہ میں جس میں جھنجھلاہٹ ملی ہوئی تھی، وہ تو ٹھیک ہے لیکن دیکھئے تو اس بے وقوف نے اپنے پاؤں تک نہیں دھوئے۔ میں نے کہا۔ ''ڈھکیل کیوں نہیں دیتیں۔'' بولیں۔ ''اس کا انتظار کر رہی ہوں، ذرا دوپٹے پر سے ہٹے تو۔'' ایک بار شیخ سجدے میں تھے وہ بھی اس طور پر کہ صرف رکوع کو لمبا کر دیا تھا، یعنی سوا دونوں ہتھیلیوں اور تلووں کے جسم کا کوئی اور حصہ فرش پر نہ تھا۔ کچھ پڑھتے جاتے اور سر کو گھٹنوں کے درمیان یہاں تک لانے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ ٹانگوں کے درمیان سے صحن میں اپنی کیاری کے گلاب گننے لگے۔ اتفاق سے میں گزر رہا تھا۔ بولے، ابا میاں میری کیاری میں گلہری ہے۔ ذرا نکال دیجیے گا۔'' ان کی آواز سے میں سمجھا کہ شاید کسی چارپائی یا تخت کے نیچے سے بول رہے ہیں۔ اب جو دیکھتا ہوں تو یہ ایک طرف تخت پر ''غ سے غبارہ'' میں نے پکارا۔ کیوں حضرت یہ نماز پڑھی جا رہی ہے، یا جمناسٹک ہو رہی ہے۔ اسی حالت میں جواب دیا۔ ''کیا کروں سب سے پوچھتا ہوں، نماز میں منہ پھیر کر کے سلام کروں۔ کوئی بتاتا نہیں۔''

ایک دن باہر سے آئے، چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ غصہ کا یہ حال جیسے کوئی جوالا مکھی پہاڑ پھٹ پڑنے والا ہے۔ نتھنوں اور آنکھوں سے چنگاریاں نکلتی معلوم ہوئیں۔ لوگوں نے پوچھا،

شیخ صاحب مزاج کیسا ہے؟ بولے۔ اب میں نماز نہیں پڑھوں گا۔ عذرا نے سنا تو بدحواس ہوگئیں۔ کہنے لگیں، ارے توبہ کرو توبہ کرو۔ یہ کیا بات تم نے منہ سے نکالی ہے۔ بپھر کر بولے۔ فلاں نے مجھے گالی دی۔ ایک طرف سے آواز آئی، تم نے کیوں نہیں گالی دی۔ یہ سننا تھا کہ چیخ پڑے اور عذرا پر اس طرح جھپٹے گویا ان کا تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ بولے، کیسے گالی دوں۔ اس نے (عذرا کی طرف اشارہ کر کے) جو کہہ دیا ہے کہ جو نماز پڑھتا ہے وہ گالی نہیں دیتا، ورنہ نماز اکارت جاتی ہے۔

ایک دن ان کے کلاس کے کچھ ساتھی لڑکے ہمارے ہاں آئے۔ شیخ اپنی کیاری کے پھول پودے سب کو دکھا رہے تھے، اور ہنسنے بولنے میں مشغول تھے۔ میں نے لڑکوں سے پوچھا۔ ''تم لوگوں میں سے کون کون کلاس میں مار کھاتا ہے، اور مار کھانے پر روتا ہے۔ سب نے اقرار کیا۔ مار بھی کھاتے ہیں اور روتے بھی ہیں۔ ایک نے کہا نیازی بھی تو مار کھاتے ہیں۔ شیخ صاحب چونک کر بولے، لیکن روتا تو نہیں۔ میں نے پوچھا۔ روتے کیوں نہیں؟ بولے، رونے سے اور مار پڑتی ہے۔ ماں نے پوچھا۔'' آخر اس کا کیا سبب ہے کہ گھر پر بغیر مار کھائے بھی روتے ہو۔ لڑکوں کی طرف چپکے سے اشارہ کر کے بولے، یہ جو وہاں ہوتے ہیں۔''

فرمائش کرنے میں شیخ سب سے آگے رہتے ہیں۔ ایک دن میں شہر جا رہا تھا، کہنے لگے۔ میرے لیے فٹ بال لائیے گا۔ میں نے کہا۔ اچھا! اب میری خدمت خاطر میں مصروف ہو گئے جوتا لا کر سامنے رکھ دیا۔ ٹوپی ہاتھ میں لے لی۔ کسی مکھی کی مجال نہ تھی کہ دو دو چار گز تک میرے قریب آسکے۔ اس دوران برابر فٹ بال کی شکل، رنگ، فٹ بال، میچ اپنے کھیلنے کی تعریف، فٹ بال کے گم ہو جانے کے اندیشے اور اس کے محفوظ رکھنے کے تدبیریں، اپنے دوستوں کی بُرائی، ماں کو دوا نہ پینے پر ملامت خود ہر طرح کی دوا پینے پر آمادہ رہنا۔ غرض کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس پر ایک ہی سانس میں یہ اپنے سارے خیالات نہ ظاہر کرتے جا رہے ہوں۔ اتنے میں عذرا میرے قریب آئیں۔ شیخ نے لپک کر ایسا دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچیں۔ بولے دیکھتی نہیں ہو ابّا میاں میرا فٹ بال لینے جا رہے ہیں۔

میں تانگے میں سوار ہوا، تانگے تک یہ بھی آئے اور برابر فٹ بال کے مسئلہ پر گفتگو کرتے رہے۔ تانگہ کچھ آگے بڑھا کہ انھوں نے پکارا اور دوڑ پڑے۔ میں رُک گیا، بولے۔ یہ کہنا تو بھول ہی گیا تھا کہ فٹ بال کا فیتا بھی لائیے گا۔ میں نے کہا۔ اچھا، گھر تک پہنچے تھے کہ پھر پکارا۔ ابّا میاں جلدی جلدی جایئے، زور کی بارش آرہی ہے۔ میں شہر سے دیر میں واپس ہوا، اندھیرا ہوگیا تھا۔ دیکھا تو شیخ دروازے پر اندھیرے میں کھڑے ہیں۔ تانگہ آتے دیکھ کر پکارا۔ ''ابّا میاں! فٹ بال۔'' میں نے برآمدہ میں پہنچ کر بھرا ہوا فٹ بال اُن کے حوالے کیا۔

فٹ بال پا کر اُن کے چہرے پر خوشی کی جو کرنیں پھوٹی ہیں اور میرے احسان اور اپنی شکر گزاری کے اظہار میں یہ جس طرح تھرکے ہیں اور حلق سے جیسی سُریلی اور گونجیلی آوازیں لگائی ہیں، مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے یہ ساری دنیا ایک فٹ بال ہے، جسے خدا نے اسی طرح تحفہ میں دیا ہے۔ جس طرح میں نے شیخ کو فٹ بال دیا تھا۔

گھر میں فٹ بال آنے سے نت نئی آفتیں آنے لگیں۔ اس لیے کہ شیخ نے فٹ بال کھیلنے کے لیے وقت اور مقام اور کھیلنے کے جتنے طور طریقے قانون اور ضابطے ہیں۔ سب کی قیدیں اُٹھا دی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا گھر والوں پر زندگی دوبھر ہوگئی۔ معاملہ میرے سامنے لایا گیا۔ فریاد کا خلاصہ یہ تھا کہ گھر میں پہلے ہی سے ایک بال (شیخ صاحب) جان کے لیے کیا کم وبال تھا کہ اس پر ایک ''بال'' اور زیادہ کر دیا گیا۔ اس لیے یہ تحفہ ضبط کر لیا جائے اور آئندہ سے یہ سلسلہ بند کیا جائے۔

کسی طرح جھنجھلاہٹ مجھے پہلے سے تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی یہ جھگڑا سامنے لایا گیا۔ تو بے قابو ہو کر میں نے حکم دیا کہ جہاں اور جس حال میں ہوں حاضر کیے جائیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کو آواز دی کہ فوراً چلے آئیں۔ میری آواز سنتے ہی شیخ نمودار ہوئے۔

ہیئت یہ تھی کہ جسم پر صرف پاجامہ تھا جس کا کمربند باندھ نہ پائے تھے۔ اس لیے ایک ہاتھ سے قابو میں کیے ہوئے تھے۔ دوسرے ہاتھ سے فٹ بال بغل میں دبائے ہوئے تھے اور پورا منہ کھلا ہوا تھا۔

شیخ کے اس حلیے نے عدالت کو جب مشکل میں پھنسا دیا۔ یعنی ملزم جس شکل میں حاضر ہوا تھا اس کی بنا پر توہینِ عدالت[1] کا مقدمہ چلایا جائے یا عدالت اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکے تو توہینِ ملزم[2] کا قصوروار ٹھہرے، جیسے عدالت کی دشواری ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک طرف سے بھائیوں میں سے کسی کی آواز آئی۔ حضرت ایسا بھی کیا تکلف فٹ بال کو منہ میں رکھ لیا ہوتا۔ اس پر عدالت اور مجمع دونوں بے قابو ہو چلے تھے کہ سلمیٰ نے چپکے سے شیخ کے پیچھے جا کر فٹ بال کو ہلکے سے ٹھیل دیا اور وہ فرش پر لڑھک گیا۔ شیخ دھاڑ کر فٹ بال پر جھپٹے اور کمر بند ہاتھ سے چھوٹ گیا۔''

عدالت کے عمال[3] مجمع سب چاروں شانے چت تھے اور بار بار نعرہ بلند ہو رہا تھا شیخ زندہ باد۔

اس سال جنگ حبشہ کا خاتمہ اور شیخ نیازی کا ختنہ ہوا، اور جیسا کہ ہر بڑے واقعہ کا حال ہوتا ہے کہ اس کی آمد کی تیاریاں بہت پہلے سے کی جاتی ہیں، لیکن پیش زدہ اچانک ہی چلا آتا ہے۔ شیخ کے ختنے کے بھی بڑے بڑے منصوبے باندھے جا رہے تھے، لیکن کچھ نہ بن پڑی تھی۔ ایک دن خدا کا کرنا ایسا ہوا، بوڑھے نائی اور تیز اُسترے نے وہ کر دکھایا جس کے لیے ہم سب فکرمند تھے۔ بے فکروں نے ٹھیک کہا ہے۔

نائی[4] ازغیب بروں آید وختنہ بکند

شیخ صاحب کو ختنہ کی اطلاع دی جا چکی تھی اور اس پر اُن کی رائے بھی لے لی گئی تھی، لیکن جیسا کہ زبردست کا ہمیشہ قاعدہ رہا ہے وہ فیصلہ پہلے کر لیتا ہے، رائے بعد میں لیتا ہے۔ شیخ کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر یہاں اس بات کا اقرار نہ کر لیا جائے کہ شیخ کی کمزوری جان کر

---

1. عدالت کی بے عزّتی کرنا۔
2. ملزم کی بے عزّتی کرنا۔
3. عدالت میں کام کرنے والے۔
4. فارسی میں مولویوں سے مراد ہے ''ازغیب بروں آید کارے بکند۔'' جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مشکل آن پڑتی ہے تو کوئی آدمی کہیں نہ کہیں سے آجاتا ہے اور مشکل کو آسان کر دیتا ہے۔

ختنہ کا مسئلہ اُن کے سامنے اس طرح رکھا گیا تھا کہ ختنہ کیا وہ اس سے بھی بڑھ کر حادثے سے گزرنا قبول کر لیتے۔ ختنہ کے بدلے میں انھیں جو سبز باغ دکھایا گیا تھا، اس میں پھل اور نعمتوں کی قسمیں اور مقدار اتنی زیادہ دکھائی بتائی گئی تھی کہ شیخ صاحب ختنہ فروشی[1] پر خوشی سے تیار ہو گئے۔

چنانچہ ایک ختنہ پر موقوف ہے گھر کی رونق۔ ہم سب ایک یوم ختنہ منانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس دن شیخ نے جتنی شرارتیں چاہیں کر ڈالیں۔ جس کی چیز پر چاہا قبضہ کر لیا اور جس کو جو جی میں آیا کہہ ڈالا۔ گھر آنگن کو اس طرح روندتے پھرتے تھے جیسے ملک پر سے خدا کا سایہ اور پولیس کا پہرہ اُٹھا لیا گیا ہے۔ گھر کے سارے فدوی فرعون

ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم[2]

میں مبتلا رہے۔ یہاں تک کہ ختنہ کرنے والا نائی ایک میلی بقچی، سفید پگڑی اور چڑھی ہوئی داڑھی لیے گھر کے دروازے پر نمودار ہوا۔ نائی کی سج دھج اور تیور دیکھ کر شیخ تو کیا شیخ کے بزرگوں کے بھی ہوش اُڑنے لگے۔ اس کے بعد جو پکڑ دھکڑ اور چیخ و پکار مچی ہے اس سے بچّے ہی نہیں ان کی سات پشت واقف ہے۔

شیخ صاحب نے اس وقت جیسے تابڑ توڑ نعرے لگائے، اس کا تذکرہ بیکار ہے۔ بس معلوم ہوتا گویا شہر کی گھنی آبادی میں بم پھٹ رہے اور بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔ جب ذرا شور و غل کم ہوا اور انجمن ختنہ[3] احمر کے رضا کار[4] شیخ صاحب کو میدانِ جنگ سے اُٹھا کر بستر پر لائے تو شیخ صاحب نے دیکھا کہ وہ تمام وعدے جو اُن سے اس سلسلے میں کیے تھے پورے کیے گئے ہیں، اور چاروں طرف کھانے پینے اور تفریح کی چیزیں موجود ہیں۔ شیخ نے لیٹے لیٹے ہر ایک کا

---

1. ختنہ کرنے کا نام لیا۔

2. غالب کا مصرعہ یوں ہے۔ ''ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی زینت'' مطلب یہ ہے کہ ہر چھوٹے بڑے کا چپ چاپ دیکھتے رہنا اور دم نہ مارنا۔

3. لڑائی میں فوجیوں کی خدمت کرنے والی جماعت جس کو ریڈ کراس یا صلیبِ احمر کے نام سے ساری دنیا جانتی ہے۔

4. ایسے لوگ جو اپنی خدمت کا کوئی بدلہ نہیں چاہتے۔

جائزہ لیا، وہ بھی اس طور پر کہ دیکھ لیا اور مطمئن ہو گئے۔ بلکہ جسے دیکھ لیا اُسے کھا لیا اُسے ہضم کر ڈالا۔

شیخ صاحب مٹھائی کھاتے رہے اور ختنہ اچھا ہوتا رہا۔ ہر وقت پاس رہنے کے لیے ایک ملازم لڑکا مقرر تھا، جس سے یہ قصہ سنتے رہتے اور اپنے کارنامے سناتے رہتے۔ عذرا چار آنے ماہوار پر بطور نرس مقرر کی گئیں۔ یہ رقم ایسی نہ تھی جو نرس کی بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھا لیتی، لیکن شیخ کے لیے چڑھاوے میں جو پھل اور مٹھائی آتی وہ اس کمی کو پورا کر دیتی۔

اس زمانے میں عذرا کا معمول تھا کہ وہ اسکول جانے لگتیں تو شیخ کو کچھ ہدایت دے جاتیں، یعنی خبردار ہاتھ پاؤں نہ جھٹکنا، نہ اُٹھنا بیٹھنا، جس کا عذرا کے بعض نامعقول بھائی بہن یہ مطلب نکالتے کہ ان کی غیر حاضری میں شیخ پھل یا مٹھائی وغیرہ پر ہاتھ صاف نہ کر سکیں اور اس کے ثبوت میں یہ لوگ کہتے کہ عذرا اسکول سے واپس آتیں تو سیدھی شیخ کے پاس پہنچتیں اور معمولی مزاج پرسی[1] کے بعد اور کبھی کبھی اس کے بجائے پھلوں اور مٹھائیوں کے واحد[2] حاضر یا جمع غائب پر بحث ہوتے ہوئے تکرار کی نوبت آجاتی۔

عذرا نے تیمارداری[3] سے کیا فائدہ اُٹھایا یہ مسئلہ طے نہ ہو سکا، لیکن یہ ضرور ہے کہ انھوں نے چار آنے کبھی طلب نہیں کیے جس سے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ عذرا کی آمدنی یا اہل کاروں کی اصطلاح میں یافت[4] کافی تھی، اس کے ساتھ یہ ضرور ہے کہ عذرا نے اس دوران میں شیخ کو لکھنے پڑھنے کے چکر میں ڈال دیا۔

ایک زمانے میں ہمارے ملک کے بڑے بڑے سردار وطن کو غلامی سے چھڑانے کے لیے جیل خانے جانے لگے تو وہاں بھی انھوں نے بے کار رہنا پسند نہ کیا، بلکہ کتابیں پڑھتے

---

1. مزاج پُرسی، مزاج پوچھنا۔
2. واحد حاضر جمع غائب، یہ قواعد حرف کے دو صیغے ہیں۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ کبھی تو ایک ہی پھل یا مٹھائی موجود ملتی کبھی سب غائب۔
3. تیمارداری، بیمار کی دیکھ بھال اور خدمت کرنا۔
4. یافت۔ تنخواہ کے علاوہ جو رقم اوپر سے آجائے۔

اور لکھتے رہے۔ اس طرح جب وہ قید سے باہر نکلے تو ان کی بڑائیوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ شیخ نیازی نے بھی جتنے دن ختنہ کے سلسلے میں چار پائی پر گزارے، ان میں طرح طرح کی کہانیاں سنتے سنتے عذرا کی کوشش سے لکھنے پڑھنے میں کچھ شدت پیدا کرلی۔ چنانچہ صحت یاب ہو کر دنیا کی چھین جھپٹ میں آئے تو پہلا خط انھوں نے اپنے چچا کے نام لکھا۔ اس خط میں انھوں نے لکھاوٹ کی بہت ساری ایسی اُلجھنیں دور کرنے کی کوشش کی تھی جو ہم جیسے لکھے پڑھے جاہلوں نے پھیلا رکھی ہیں۔ یہ خط پنسل سے کاغذ کے ایسے پرزے پر لکھا گیا تھا جو سوا تحریر کے ہر مصرف میں آچکا تھا۔ جس بات کو ہم یوں لکھتے ''جواب دو'' اس کو انھوں نے یوں لکھا تھا ''ج واب ۲''

اس حادثے پر شیخ کو ہموار کرنے میں جب ان کے تمام بھائی بہنوں کا ہنسنا، سمجھنا اور غرّانا بےکار ثابت ہوا تو یہ مسئلہ میرے سامنے لایا گیا۔ میں نے شیخ کو سراہا اور کہا۔ شیخ تم نے جس طرح لکھا ہے وہ صحیح ہو یا نہ ہو۔ اس کے معقول ہونے میں شبہ نہیں، لیکن ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ لوگ اس کو سمجھیں یا مانیں کیوں کہ اس دنیا کا جس میں ہم تم آ پھنسے ہیں، قاعدہ یہ ہے کہ ایکا ایکی نہ تو یہ سیکڑوں ہزاروں سال پیچھے ڈھکیلی جاسکتی ہے، اور نہ سینکڑوں سال آگے بڑھائی جاسکتی ہے۔ اُردو لکھنے کا جو طریقہ تم نے نکالا ہے وہ اردو املا کا پورن راج کا طریقہ ہے۔ بولے، ''پورن راج'' کسے کہتے ہیں؟ میں نے کہا۔ شاید ایسے زمانے کو کہتے ہیں جب دنیا میں اچھائی کا راج ہوگا اور بُرائی دیکھنے کو نہ ملے گی۔ بولے ختنے بھی نہ ہوں گے؟ لوگ ہنسنے سے باز نہ آئے اور مجھ سے کوئی ٹھکانے کا جواب نہ بن پڑا تو میں نے کہا۔ ''دیکھو بات ختم ہو لینے دیا کرو۔''

پورن راج میں کبھی کوئی آدمی بات کے بیچ میں نہیں ٹوکے گا۔

اچھا سنو! تم جو چائے پیتے ہو اس میں کیا کیا چیزیں ملی ہوئی ہیں؟ بولے۔ پانی، چائے، شکر، دودھ۔ میں نے کہا۔ اگر یہ چیزیں میز پر علاحدہ علاحدہ رکھ کر تمہارے سامنے پیش کی جائیں تو تم کتنے جز بز[1] ہو گے۔ نوکر سے کہو گے کہ چائے کہاں ہے، اگر وہ کہے کہ سامان رکھا ہے۔

---

[1] جز بز ہونا۔ ناخوش ہونا، ناک بھوں چڑھانا، ناراض ہونا۔

چائے بنا لیجیے تو تم اس طرح دہاڑو گے کہ ہم سب[1] اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ چائے کو پینے کے لائق بنانے کے لیے قاعدہ کے مطابق چائے، پانی، شکر، دودھ کو ملانا چاہیے۔

چائے کا نسخہ جب شیخ کے حلق سے نیچے اُتر گیا تو میں نے کہا۔ اس طرح ہر حرف کو موقع موقع سے ملا کر علاحدہ علاحدہ لکھتے ہیں تو پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے اور مطلب صاف ہو جاتا ہے۔

جیسے ہر چیز ٹھیک طور پر ملانے سے گوشت، کباب، کھچڑی، نہاری تیار ہو جاتی ہے اور علاحدہ علاحدہ رکھنے سے نہ تو کھانا تیار ہوتا ہے، نہ بھوک دور ہوتی ہے، نہ جی بھرتا ہے۔ اسی طور ان کو 2 اور دو کا مطلب سمجھایا گیا۔

ان سے بعد میں یہ تو نہیں پوچھا کہ ساری باتیں سمجھ میں آئیں یا نہیں، لیکن جس طور پر انھوں نے اپنے اطمینان کا اظہار کیا اس سے یقین آ گیا کہ بات سمجھے ہوں یا نہیں، ہاں طرح طرح کے کھانوں کے ذکر سے مزا ضرور آیا۔ چہرہ پر چمک آئی اور باچھیں کھل گئیں اور ''آہا'' کو بڑے راگ رس سے ادا کر کے تخت پر لوٹ گئے۔ پاؤں کو چھت کے سمت اس طور پر اونچا کر دیا کہ چھت گرنے لگے تو ان کے پیروں پر ٹِک جائے۔

شیخ صاحب کے منجھلے بھائی احسان ہیں۔ اپنے چچا کو خط لکھا تھا بس کے صلے[2] میں ان کو پانچ روپے کا منی آرڈر موصول ہوا۔ اس واقعہ سے شیخ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ چنانچہ انھوں نے بھی ایک خط لکھا جس کا مضمون تھا کہ میں نے تو ختنہ کرایا ہے احسان نے کیا کرایا؟ اس پر میں نے یہ طے کیا کہ احسان کے پانچ روپے میں سے ڈھائی روپیہ شیخ کو ملیں اور جب شیخ کے روپے آئیں تو احسان کے روپے واپس کر دیے جائیں، احسان مان گئے۔ اتفاق سے شیخ کے نام بھی پانچ روپے آئے۔ تقسیم کا وقت آیا تو شیخ صاحب کی نیت ڈانواڈول ہو گئی۔ کہنے لگے ''میں تو نہیں دیتا'' پوچھا گیا کیوں؟ بولے۔ ''میں نے تو ختنہ کرایا احسان نے کیا کرایا؟ کہا گیا آخر

---

1. اللہ کو پیارے ہونا۔ مرنا۔

2. انعام۔

احسان کے روپے میں کیوں شریک ہو گئے۔'' میں نے جو ختنہ کرایا۔ کہا گیا یہ تو صحیح ہے لیکن تمہارے ختنہ کرانے سے احسان کیوں گھاٹے میں رہیں۔ کہنے لگے، میں نے جو ختنہ کرایا۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ ''ختنہ'' تکیہ کلام[1] بن چکا ہے تو معاملہ میرے سامنے لایا گیا۔ میرے سامنے بھی انھوں نے ''ختنہ'' گفتاری[2] شروع کی تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے میں گالی گفتار پر اُتر آؤں گا لیکن پھر سوچ کر گالی کو چھوڑا اور گفتار پر آ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ شیخ صاحب آپ کے ختنے کا بکھیڑا تو کچھ رومن[3] تہذیب سے لگا کھا رہا ہے جس کی آڑ میں آپ ہمارے مختصر اور مسکین[4] خاندان کو ''حبشا'' بنا ڈالنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کی نیت یہی ہے تو یہ بھی معلوم رہے کہ میں کچھ ''انجمن اقوام''[5] یا دیہات کے روشن چوکی والوں میں نہیں ہوں کہ بارات کے ساتھ بھی ہیں اور جنازے کے ساتھ بھی سمجھے۔ آپ کی خُرافات بالکل پسند نہیں۔ سیدھے سے ڈھائی روپیہ دھر دیجیے۔''

شیخ نے میرے تاؤ اور تیور کو بالکل خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔ ''روپے کس کے پاس ہیں؟'' میں نے یہ بھی بے خبری میں دُہرایا۔ ''کس کے پاس ہیں۔'' بولے، ''اماں بی کے پاس''۔ ڈرتے ڈرتے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس طرح کی ساری رقمیں ڈوب چکی ہیں۔ میں نے غصہ نہایت احتیاط کے ساتھ تھوک دیا۔ تھوکنے میں یوں بھی احتیاط برتتا ہوں۔ اس لیے کہ اوپر منہ کر کے تھوکیے تو اپنے ہی اوپر آتا ہے اور ادھر اُدھر تھوکیے تو بیماری پھیلتی ہے، اور بیماری

---

1. تکیہ کلام۔ وہ لفظ ہے جو زبان پر چڑھ گیا ہو اور بولنے میں بے ارادہ بار بار زبان پر آ جاتا ہو۔
2. ختنہ کے بارے میں گفتگو کیے جانا۔
3. روم اٹلی کی راجدھانی ہے۔ پرانے زمانے میں روم کی تہذیب کی بڑی مان تان تھی۔ زیادہ دن کی بات نہیں ہے۔ اٹلی کے حاکم مسولینی نے کمزور ملکوں کو اس بہانے ہتھیانا شروع کر دیا کہ وہاں اٹلی کی پرانی تہذیب پھیلائی جائے گی۔ اس بہانے اس نے حبش کے ملک کو تہس نہس کر ڈالا تھا۔
4. بے چارہ غریب۔
5. پہلی جنگِ عظیم کے بعد یورپ کی بڑی بڑی حکومتوں نے مل کر ایک انجمن اس غرض سے بنائی تھی کہ آئندہ دنیا میں امن و سلامتی قائم رکھی جائے گی اور خون خرابے کی نوبت نہ آنے دیں گے۔

کی سب سے بڑی آفت یہ ہے کہ بیمار کوئی پڑے، تیمارداری مجھے کرنا پڑتی ہے۔ میں نے سارے قرض خواہوں[1] کو بلا کر سب کی رقمیں معلوم کیں اور قبلہ گاہ[2] بینک کی حیثیت سے جس کا ٹوٹا مفہوم[3] رزرو بینک[4] ہو سکتا ہے ہر ایک کو اقرار نامہ لکھ کر دے دیا کہ اتنی رقمیں ان کی جمع ہیں۔ عندالطلب[5] ادا کی جائیں گی۔ یہ شیخ صاحب کی کم سمجھی یا تنگ ظرفی[6] تھی کہ انھوں نے اس اقرار نامے کو دوست دشمن سبھی کو اس طور پر اس نیت سے دکھانا شروع کر دیا جیسے خطاب یافتہ[7] اپنا تمغہ یا سند اپنے دوسرے کم نصیب ساتھیوں یا رشتہ داروں کو دکھلاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دشمنوں نے سازش کر کے عندالطلب نامہ کو اڑا دیا اور شیخ نے ایک فلک شگاف[8] نعرہ لگا کر اپنے سارے روپے مجھ سے رکھوا لیے۔ شیخ کی اس حرکت سے میرے جاری کیے ہوئے عندالطلب اقرار ناموں کی ساکھ گر گئی اور ہر ایک نے اپنے اپنے روپے مجھ سے وصول کر لیے۔ دیکھتے دیکھتے رزرو بینک کا دیوالہ نکل گیا۔

شیخ صاحب نے وہ خط لکھنے کے بعد جس کا ذکر ابھی کیا گیا، عذرا کو دکھایا۔ عذرا نے بتایا کہ اس پر اپنا نام بھی لکھو۔ شیخ نے جواب دیا۔ نام لکھنے کی کیا ضرورت ہے، جب خود میں نے لکھا ہے۔ عذرا نے بہت سمجھایا، لیکن شیخ اس پر اڑے رہے کہ چوں کہ انھیں نے لکھا ہے اس لیے نام لکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ لطیفہ میرے سامنے پیش کیا گیا۔ میں نے شیخ کو بلایا اور کہا کہ یہ ٹھیک ہے خط تم نے لکھا ہے، لیکن تم کو یہ معلوم ہے کہ تمہارا نام منا بھی ہے اور یہ نام جلیل صاحب کے

---

1. جس کے روپے دوسروں پر آتے ہیں۔
2. بڑا بزرگ۔
3. مطلب۔
4. گورنمنٹ کا سب سے بڑا بینک جہاں کاغذی سکوں کی ساکھ رکھنے کے لیے سونا چاندی رکھا جاتا ہے۔
5. جب مانگی جائے۔
6. طبیعت کا اُوچھا پن۔
7. جس کا خطاب ملا ہے۔
8. ایسا نعرہ جس سے آسمان پھٹ جائے۔

چھوٹے لڑکے کا بھی ہے۔ اگر تمہارے چچا نے بھولے سے یہ سمجھ لیا کہ یہ تمہارا نہیں بلکہ جلیل صاحب کے منا کا ختنہ ہوا ہے اور انھوں نے روپیہ جلیل صاحب کے منا کو بھیج دیا تو کیا ہوگا؟ یہ بات شیخ کے دل میں اُتر گئی پھر جس طور سے مسکرائے اور سر کو جنبش دی، اس سے اتنا یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے آپ کو نقصان سے بچایا جتنا یہ کہ جلیل صاحب کے منا کو نیچا دکھایا۔

گھر کے صحن میں پھولوں کی کیاریاں تھیں اور ہر کیاری ہر بچے کے قبضہ میں دے دی گئی تھی۔ البتہ یہ شرط لگا دی گئی تھی کہ پودوں کو ہاتھ نہ لگائیں۔ شیخ صاحب کو اس طرح کا قبضہ اور اس طرح کی بے دخلی[1] قابل اطمینان نہ معلوم ہوئی، وہ کچھ اس طرح سوچتے تھے کہ جب کیاری ان کی ہے تو ان کو اس کا اختیار ہونا چاہیے کہ وہ جب چاہیں خود پودوں پر بیٹھ رہیں اور جب چاہیں پودوں کو اپنے اوپر بٹھالیں۔ ان کو اس کا بالکل یقین نہیں تھا کہ خود کیاری اور پودوں سے رائے لی جائے تو وہ بھی شیخ صاحب کے اس سلوک کو پسند نہ کرتے۔

انھوں نے یہ طے کیا کہ ادھر اُدھر سے گھاس پات اکھیڑ کر اپنی کیاری میں لگائے اور ان کو اپنی پسند کے پھل پھول اور ترکاریوں کے نام دینے شروع کر دیے۔ مثلاً گوکھرو کو رس بھری کہنے لگے اور پتھر چٹے کو سلاد کے نام سے یاد کیا۔ یہاں تک تو کوئی حرج نہ تھا، لیکن جب شیخ نے اس بات کی کوشش شروع کر دی کہ دوسرے بھی ان کی گھاس پات کی وہی مان تان کریں جو یہ خود کرتے تھے تو جیسا کہ عام قاعدہ ہے۔ لوگوں نے ان کی کیاری کے اچھے بھلے درختوں کو بھی بدنام کرنا شروع کر دیا۔ اب یہ بڑے زچ ہوئے۔[2]

شیخ نے اس کا توڑ یوں کیا کہ آس پاس کے کسی درخت یا جھاڑی سے کوئی شاخ توڑی اور اسے نہایت احتیاط اور بھروسے کے ساتھ گھر لا کر اپنی کیاری میں گاڑ کر پانی دے دیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر تک اس کے گرد ناچتے رہے جس طرح انسان نے سب سے پہلے کھیت کیاری کے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے کیا ہوگا۔ اس کے بعد رات کے وقت جب کھا پی کر سونے کے لیے چارپائی پر لیٹے تو عذرا سے اپنی باغبانی کی ترقی کی اُمیدوں پر اس طرح گفتگو کرتے،

1۔ بے دخلی قبضہ کی چیز پر اختیار نہ رہنا۔

2۔ تنگ ہوئے گھبرائے۔

جیسے یہ دونوں سو کر صبح کو اُٹھیں گے تو دنیا جہان کے قلاش[1] قلا قند کھاتے اور کپڑے کبڈی کھیلتے ہوں گے۔

ایک دن جب میں نے شیخ سے عرض کیا۔ حضرت میں نے کیاریوں میں جو گلاب لگا رکھے ہیں اور آس لگائے بیٹھا ہوں کہ کچھ دنوں بعد ان میں نہایت خوب صورت کلیاں اور پھول نظر آئیں گے آپ کی حرکت سے ان تمام اُمیدوں پر پانی پھرتا معلوم ہوتا ہے، اور آپ کی کیاری پر میونسپلٹی کا دھوکا ہونے لگا ہے۔ فرمایا، ''آپ درخت ہونے کیوں نہیں دیتے۔ دو ہی چار دن میں ان کو اکھیڑ کر پھینک دیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں انھیں اسی وقت علاحدہ کرتا ہوں، جب وہ بالکل سوکھ جاتے ہیں۔ سوکھی ٹہنی لے کر کیا کرو گے۔'' بولے، میں نے خود دیکھا ہے۔ تھوڑی تھوڑی جڑ نکل رہی تھی۔ کچھ دنوں بعد سارا درخت ہرا ہو جاتا۔ میں نے کہا۔ تم کو کیسے معلوم ہوا کہ جڑ نکل رہی تھی۔ فرمایا، ''ہر روز تھوڑا سا اکھیڑ کر دیکھ لیتا ہوں۔''

پھر فرمایا۔ ''ایک دن میں نے ٹہنی کے پاس کھودنا شروع کیا تو خوب بڑی بڑی جڑیں نکلیں! سنتے ہی سناٹے میں آ گیا اور رویا تو نہیں، لیکن رونے والوں کی صورت بنا کر بولا۔ آپ کو کس نے بتایا کہ وہ جڑیں آپ کی سوکھی ٹہنیوں کی تھیں، جن کے آس پاس آپ نے باغبانی پروجیکٹ[2] کا دھندا کھول رکھا ہے۔ خدا کے لیے اپنے خیال سے باز آ جائیے۔ میرے گلاب کی جڑیں آپ کی سوکھی ٹہنیوں سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتی ہیں۔ یہ آپ نے کیاریوں یا عوامی کلچر قسم کا کیا کھڑاگ پھیلا رکھا ہے۔ بولا، ''کلچر کسے کہتے ہیں؟''

میں چُپ ہو گیا اس لیے .... کہ میرا ناراض ہونا ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ کلچر کی بات چھڑ گئی، جسے سمجھانے کے لیے مزاج میں نیکی اور نرمی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جن کو میں اس وقت اپنے قریب نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔ دوسری یہ کہ تھوڑی ہی دیر پہلے ایک صاحب سے اس عوامی[3] کلچر پر گفتگو ہو چکی تھی۔ انھوں نے جو بحث کی وہ عوامی زیادہ تھی

---

1. کنگال۔

2. بچوں میں باغ کے کاموں سے دلچسپی پیدا کرنے کا تعلیمی طریقہ۔

3. عام لوگوں کا۔

کلچر[1] کی بہت کم تھی۔ اور مجھے گوارا نہ تھا کہ وہ جھگڑا پھر چھڑے۔ شیخ کے سوال پر چُپ تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اب گردن بھی جھکالی۔ شرم سے نہیں بلکہ غصہ سے سر جھکا لینے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ آدمی کا رعب بھی قائم رہتا ہے اور نبٹنے سے بھی بچ جاتا ہے۔

عذرا نے مجھے اس طرح بے بس، شیخ کو بے پروا دیکھ کر شیخ کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف کو لے کر چلیں۔ شیخ نے پوچھا، آپا۔ ابّا میاں یہ کیا باتیں کر رہے تھے؟ عذرا نے کہا۔ کوئی بات نہیں، اخباروں میں پڑھا ہوگا۔

آج کل مکان بننے والا ہے۔ زمین کی صفائی ہو رہی ہے۔ گدھے اور خچر مٹی اور اینٹیں لا کر ڈال جاتے ہیں۔ بچوں کی عید ہے، اس لیے نہیں کہ نیا مکان بننے والا ہے۔ بلکہ والدین کے بجائے اب گدھوں اور خچروں سے یاری ہے۔ تمام دن مٹی پر لوٹتے ہیں، خچر اور گدھے پر سواری کرتے ہیں۔ ہر بچہ نے اپنا خچر اور گدھا چُن لیا ہے۔ شیخ نے جس گدھے کو اپنایا ہے وہ سب سے زیادہ غریب صورت، لیکن سب سے زیادہ دولتی جھاڑتا ہے۔ لدا پھندا جوں ہی پہنچا، شیخ نے بڑھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بوجھ اُتارنے میں گدھے کی مدد کی اور فوراً گدھے پر قابض ہو گئے۔

شیخ صاحب کو گدھے کا تجربہ نہ تھا اور انصاف کی بات یہ ہے کہ گدھوں کو بھی شیخ صاحب کا تجربہ نہ تھا۔ پہلے دم کی طرف سے چڑھنے کی کوشش کی، اُس نے دولتی جھاڑی اور یہ زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ ادھر اُدھر دیکھ کر جلدی سے اُٹھ بیٹھے اور اس کے منہ کی طرف سے چڑھنے لگے۔ گدھے نے منہ مارا تو پھر زمین پر آ رہے۔ گدھے نے فتح کی خوشی میں اپنا ترانا الاپنا شروع کیا تو وہ بھی غرّا کر بولے۔ ''واہ بے گدھے، مارتا بھی ہے اور شور بھی مچاتا ہے۔ اب انھوں نے گدھے کا آگا پیچھا دیکھ کر اور اپنا آگا پیچھا سوچ کر پہلو سے حملہ کیا اور اس کی پیٹھ پر بیٹھ گئے۔ دو چار قدم چلنے کے بعد گدھے نے جھرجھری لی اور شیخ مٹی کے ایک بڑے ڈھیلے کی طرح زمین پر لڑھک گئے۔

---

1 اس کے بہت سے معنی و مطلب ہیں۔ عام طور پر اس کا مطلب بھلمنساہت کے طور طریقے سمجھ لینا کافی ہے۔ کسی چیز کے اُگانے بڑھانے کو بھی کہتے ہیں۔

شام کو گھر واپس آئے، حلیہ بتا رہا تھا کہ تمام دن اُن کا گدھوں سے اور گدھوں کا اُن سے کیا سابقہ رہا ہوگا۔ معمول کے خلاف چُپ چُپ سے رہے اور کھا پی کر سو رہے۔ سویرے اُٹھے تو چہرہ پر ایک خاص طرح کی سوجھ بوجھ یا پیچ اُونچ اور چال ڈھال میں خاص انداز کی لٹک نظر آئی۔ دوستوں کا خیال تھا کہ شیخ کے دھیان میں کچھ اونچی باتیں تھیں۔ دشمن یہ کہتے تھے کہ کچھ نہیں فقط گدھے کی لاتیں تھیں۔ ناشتہ وغیرہ کے بکھیڑوں سے جلد از جلد اور چُپ چاپ گزر گئے اور گھر سے چلتے ہوئے عذرا کو بھی اپنا پروگرام نہ بتایا۔

عذرا کو شبہ ہوا، پوچھا۔ کیوں منا کیا بات ہے، کدھر کا ارادہ ہے اور بغل میں کیا دبا رکھا ہے۔ شیخ نے ادھر اُدھر دیکھا، اطمینان کر لینے کے بعد بغل سے قینچی نکالی۔ اس میں ماں کا موباف! اور عذرا کا میلہ دوپٹہ تھا۔ عذرا نے گھبرا کر پوچھا۔ یہ تم کیا کرنے والے ہو۔ کہا، ''کل گدھے نے بڑی بدمعاشی کی، پہلے تو چڑھنے نہیں دیتا تھا، اور لاتیں اوپر سے مارتا تھا۔ آج میں (موباف دکھا کر) اس سے تو اس کی ٹانگیں باندھوں گا اور دوپٹہ منہ پر لپیٹ لوں گا تاکہ لاتیں نہ لگیں۔ عذرا نے جل کر کہا۔ تم بھی کیسے گدھے ہو، اس کی ٹانگ باندھ دوگے تو وہ چلے گا کیسے، اور اپنا منہ لپیٹ لوگے تو دیکھو گے کیسے کہ گدھا کدھر لیے جا رہا ہے یا کیا کر رہا ہے۔ میرا دوپٹہ اس کام کے لیے نہیں ہے۔

اتفاق سے ادھر ماں کا گزر ہوا، جہاں گدھے کے خلاف دونوں میں گفتگو ہو رہی تھی۔ انھوں نے اپنے موباف کا یہ مصرف سنا تو شیخ کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہا جو اُن سے پہلے گدھا کر چکا تھا۔ ادھر دوپٹہ کا پیچ کچھ اس طرح آن پڑا کہ عذرا کے دل میں شیخ کے لیے محبت کے جتنے خانے تھے ان میں بہت سے سونے ہو گئے۔ لیکن جتنے آباد رہ گئے تھے، وہ رہ رہ کے اپنا رنگ دکھا جاتے۔ یعنی ماں باپ کی طرح سے جو ہلّہ شیخ پر ہوتا تھا، اس کی روک تھام تو کرتیں لیکن اپنے دل کا جو بخار اُٹھتا اس کو قابو میں نہ رکھ پاتیں۔ یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ میں پہنچ گیا۔ دوپٹہ میں نے عذرا کے حوالے کیا۔ انھوں نے اسے پہلے کھول کر اور بعد میں اچھی طرح جھٹک کر اپنا اطمینان کر لیا کہ اس میں گدھا یا شیخ صاحب تو بندھے ہوئے نہ تھے۔ پھر شیخ کو اپنے ہمراہ لے کر واپس چلی گئیں۔ ماں کی برہمی ابھی دور نہیں ہوئی تھی، میں نے کہا۔ شیخ صاحب پر تمہارا بگڑنا بجا ہے،

لیکن وہ ابھی نا سمجھ ہے۔ وہ کیا جانے موباف کا کتنا بڑا احترام[1] ہم نور باف[2] کرتے ہیں۔ یہ دنیا ہے۔ شیخ گدھے کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہتے تھے یا گدھے نے اُن کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، وہ بالکل ایسا ہے جیسا تم نے دیکھا ہوگا کہ میاں بیوی یا لیڈر اور قوم ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ اس طور کی کھڑ کھڑاہٹ ہوتی ہے جیسے ریڈیو سیٹ میں ہوتی ہے اور وہ یک بہ یک رُک جاتا ہے۔

مکان بنے ہوئے کتنے سال ہوگئے۔ بالکل نا سمجھ بچے بچیاں آج سیانے ہوگئے اور زندگی کے ایسے کاموں میں لگ گئے جس میں ان کو خوشی اور نیک نامی نصیب ہے، جب کبھی اکٹھا ہوتے ہیں اور مکان کے خوب صورت خوب صورت کشادہ[3] اور آرام دہ ہونے کی بات نکلی ہے تو اس زمانے کا ذکر کرنے لگتے ہیں جب مکان کے لیے نیو کھد رہی تھی اور وہ اس کے اندر بھاگے بھاگے پھرتے اور طرح طرح سے دھومیں مچاتے تھے۔

عذرا کا چھوٹا بچہ طارق ہے۔ اس کے کھانے پینے رہنے سہنے کے انتظام میں دن رات اس درجہ سر کھپاتی ہیں کہ دوسرے بھائی بہن ان کو اکثر چڑا کر خفا کر دیتے ہیں۔ بچوں کی تندرستی برقرار رکھنے کے لیے میں بھی یہی سب کرتا تھا، اب بھی کرتا ہوں اور اس سلسلے میں دوستوں بلکہ ڈاکٹروں، حکیموں تک نے میرا مذاق جب بھی اُڑایا تھا اور اب بھی اُڑاتے ہیں۔

حال ہی میں طارق نے ایک خوانچہ والے کی ریوڑیوں کے لیے جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ شور مچانا شروع کیا، بہلانے چمکارنے سے نہ مانا، اور شور وغل زیادہ ہوا تو عذرا پہنچیں۔ کچھ دیر چپ کھڑی رہیں اور پھر خرید کر بچے کو دی! واپس آئیں تو سلمٰی کو بڑا اچنبھا ہوا اور اُس کی وجہ پوچھی۔

عذرا کے آنسو نکل آئے جسے وہ جلد ہی پونچھ کر ہنس پڑیں، اور کہنے لگیں۔ ''سلمٰی وہ دن بھی یاد ہیں جب یہ مکان بن رہا تھا، مزدوروں کے ننگ دھڑنگ میلے کچیلے بچے بچیاں موجود

---

1 ماں۔

2 کپڑے بننے والے۔

3 کھلا ہوا۔

ہوتیں۔ جن کے پاس ہم کس بے فکری اور بے تکلفی سے کھیلا کودا کرتے تھے۔ کوئی خوانچہ والا آتا تو مزدوروں کے بچّے کس طرح ٹوٹ کر گرتے، خوانچہ والے کو گھیر لیتے۔ ماں باپ کچھ نہ دلوا سکتے اور بچوں کے بلکنے پر ان کو جھڑکتے، گالیاں دیتے اور کبھی ایک آدھ تھپڑ مار دیتے، مایوس ہوتے اور بجھ سے جاتے۔ ہم تم بھی خوانچہ والے کی ریوڑی کے لیے بے قرار ہوتے تھے۔ ابّا میاں کی تاکید اور نوکروں کی نگرانی کی وجہ سے ریوڑیوں تک نہ پہنچ پاتے تو کیسی مایوسی اور بے بسی کا سامنا ہوتا۔ مجھے اس وقت وہ زمانہ یاد آ گیا اور وہی باتیں نظر کے سامنے آ گئیں اور دل نہ مانا کہ طارق کو ذہنی تکلیف ہو۔

عذرا کے یہ کہنے پر میں چونک پڑا اور دل کو بڑا دھچکا سا لگا۔ زندگی کا یہ کیسا انوکھا پھیر تھا کہ جو کام اپنے خیال میں ماں باپ بھولے بھالے ناسمجھ بچّے کی بھلائی کے لیے پیار اور سمجھداری سے کرتے ہوں وہ بچّے کو اتنا دُکھ پہنچاتا ہے۔ تھوڑی دیر تک وہ باتیں یاد آئیں جو میں نے ان بچوں کو اپنے خیال میں دُکھ سے بچانے اور آرام پہنچانے کے لیے کی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی ستانے لگا کہ ان کے کہنا نہ ماننے پر میں نے کبھی کبھی ڈانٹا اور مارا بھی تھا۔ اُن کے دل پر کیا گزری ہوگی۔

اتنے میں سلمٰی نے کہا۔ اقبال ذرا ان منا صاحب کو دیکھنا، اس وقت کتنے ماڈرن[1] اور مہوکا[2] سے نظر آ رہے ہیں اور کھیل کود، دوڑ دھوپ، سوجھ بوجھ اور میل محبت میں اپنے ساتھیوں کی آنکھ کا تارا اور میری نظر میں صرف آلو بخارا ہیں۔ تم کو وہ واقعہ یاد ہے۔ ایک دوپہر کو خوانچہ والا دہی بڑے لایا۔ جسے دیکھ کر ہم سب کتنا للچائے اور تم کیسے بلبلائے تھے۔ اب میں سوچ کے سمندر میں ہچکولے کھاتا، ڈبکیاں لگاتا کنارے آ لگا تھا۔ میں نے پوچھا کیوں سلمٰی وہ کیا واقعہ تھا؟

سلمٰی نے کہا۔ ''خوانچہ والے کو دیکھ کر ہم سب اس فکر میں ہوئے کہ کسی طرح نوکروں کی نظر بچا کر دہی بڑے تک پہنچیں تو دام کہاں سے لائیں۔ اس طرح کی کوئی مشکل آن پڑی تھی تو ہم سب اقبال ہی کے سامنے پیش کرتے تھے۔ کچھ تو اس لیے کہ ہم کو ان کی عقل پر بھروسہ تھا اور

---

1. نئے رنگ ڈھنگ یا نئی چال کا۔

2. کوئے کی برابر کتھئی رنگ کی ایک چڑیا۔

کچھ یوں کہ یہ آپ کے اور اماں بی کے بڑے چہیتے تھے۔ ہماری سازش اور شرارت کی تہہ میں اکثر اقبال ہی ہوتے تھے۔ اس لیے معمولی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد ہم سب کی جان بچ جاتی۔''

مکان بننے کے روزانہ خرچ کا حساب کتاب کمال بھائی کے سپرد تھا۔ اقبال نے کہا کہ سب سے پہلے تو پیسے کی فکر کرنا چاہیے۔ تھوڑی دیر تک سوچتے رہے پھر بولے، اچھا ایک بات کرو۔ میں پیسے کی فکر میں جاتا ہوں تم سب کہیں چھپ جاؤ[1]۔ کوئی نوکر کسی کو دیکھنے نہ پائے، چنانچہ ہم سب ذرا دور اینٹوں کے ایک لمبے اونچے چٹے کے پیچھے چھپ گئے۔ اقبال نے گھر میں جا کر کمال بھائی کو جگایا اور بتایا کہ فلاں مزدور کو بڑے زور کا بخار آ گیا ہے۔ چودھری اس کو اسپتال لے جا رہا ہے۔ دو آنے یکہ کا کرایہ مانگ رہا ہے۔ کمال بھائی نے آنکھ کھولے بغیر دو آنے جیب سے نکال کر دے دیے۔

اقبال واپس آئے تو ان کے ایک ہاتھ میں دو آنے پیسے اور دوسرے میں باورچی خانے کی صافی تھی۔ انھوں نے منّا کو بلا کر کہا۔ شیخ سارے کپڑے اُتار دو۔ انھوں نے بے تکلف اُتار دیے۔ اقبال نے ان کے صافی کی لنگوٹی باندھ دی۔ کچھ مٹی، ان کے جسم پر مل دی اور کچھ سر پر ڈال دی۔ دو آنے پیسے ہاتھ پر رکھ دیے اور کہا بس چلے جاؤ اور دہی بڑے خرید لاؤ۔ کسی کا دھیان اس طرف نہ گیا کہ یہ کون تھے۔ سارے نوکر دیکھتے ہی رہے اور یہ دہی بڑے لائے اور ہم سب نے مزے لے لے کر کھائے۔

ایک زمانہ ایسا آیا جب شیخ پیامِ تعلیم[2] کسی نہ کسی حد تک پڑھ لیا کرتے تھے۔ نیم حکیم[3] کی طرح نیم خواندہ[4] بھی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتا۔ شیخ صاحب ایک دن میرے پاس آئے اور بگڑ کر بولے ابّا میاں اب پیامِ تعلیم میں کچھ نہ لکھیے گا۔ یہ لوگ بہت بُرے ہیں، میں نے کہا۔ ''کیوں کیا بات ہے؟'' بولے، دیکھیے لکھتے ہیں۔

---

1. کسی کام کو چوری چھپے کرنا یا منصوبہ یا ارادہ۔

2. اس نام کا جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے بچوں کا ایک رسالہ نکلتا ہے۔

3. ادھورا حکیم۔

4. ادھورا پڑھا لکھا۔

''بے نیازی'' میں نے کہا۔ ''نہیں یہ بات نہیں ہے۔ اس بے نیازی کا کوئی تعلق تم سے نہیں ہے۔ بے نیازی کے معنی ہیں کسی کا محتاج نہ ہونا، کسی فکر کا نہ ہونا، کسی کی پروانہ کرنا، بالکل چہ غم[1] ہونا۔'' بولے۔ ''چہ غم'' کیا میں نے کہا۔

مجھے جو کچھ آتا تھا میں نے بتا دیا۔ اب کے ذاکر صاحب[2] آئیں تو ان سے پوچھنا چہ غم کسے کہتے ہیں؟ اس طرح کا کاروبار وہی کرتے ہیں۔

شیخ مسکرائے، میں نے کہا۔ اس میں مسکرانے کی کیا بات ہے۔ بولے، ''میں سمجھ گیا'' پھر اس طرح جھومے جیسے ذاکر صاحب کا نام بیچ میں لا کر ان کو دھوکا دے رہا تھا۔ لیکن دراصل دھوکا کھا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''آخر کیا سمجھے؟'' فرمایا، وہی مٹھے! اس مٹھے کا قصہ یہ ہے کہ بیماری کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے ایک بار میرے ہاں قیام کیا تھا۔ اس زمانے میں موصوف کے وطن سے بڑی کثرت سے مٹھے، موسمی اور مالٹے آئے۔ ظاہر ہے اس میں شیخ صاحب کا کیا حصہ رہا ہوگا۔ ایک بار عذرا کے کمرے کی چٹخنی اندر سے گر گئی اور کواڑ بند ہو گئے۔ سب نے ہر طرح کی کوشش کی، لیکن دروازہ نہ کھل سکا۔ عذرا کی پریشانی بڑھی تو شیخ نے اپنے ذہن میں ایک اسکیم بنائی۔ دوپہر میں جب گھر کے ان لوگوں نے جن کو شیخ صاحب کو قابو میں رکھنے کے لیے ہر طرح کے اختیارات حاصل تھے۔ کمرہ کھول دیا تو شیخ صاحب معلوم نہیں کیسے اور کدھر گھر کی چھت پر چڑھ کر، ہمسایہ کی چھت پر کود پڑے۔ جس پر عذرا کے کمرے کا روشن دان کھلتا تھا۔ روشن دان کی کنڈی میں رسّی باندھ اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کس طرح روشن دان سے گزر کر رسّی کے سہارے پندرہ فٹ دیوار طے کرتے ہوئے کمرے میں اُترے اور چٹخنی کھول دی۔

پولیس کو خبر ہوئی تو فوراً گرفتار کر لیا اور جیسا کہ ان بزرگوں کا قاعدہ ہے انھوں نے یہ تو دیکھا نہیں کہ شیخ نے کتنی عقل اور اس سے زیادہ ہمت کا کام کیا تھا۔ ان کا چالان کر دیا۔

مقدمہ ایک ایسی شری متی حاکم کے سامنے پیش ہوا، جو نہ قانون جانتی تھیں نہ مانتی تھیں۔ ظاہر ہے ایسے حاکم کے اختیارات کیا ہوں گے۔ ان کو اس کی فکر نہیں کہ کس نے کس پر ظلم

---

1. بے فکر، بے غم۔
2. ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سابق وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

یا زیادتی کی۔ ان کے لیے بس اتنا کافی تھا کہ کس پر ظلم و زیادتی کرنے کا ان کا دل چاہتا ہے۔ ایسے حاکم نہ خطا سنتے ہیں نہ سزا سناتے ہیں۔ بس سزا دینا جانتے ہیں، اور سزا کے فوراً بعد رونا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ اُن سے کوئی غلطی ہوئی تھی اور یہ رونا اس کا دھونا تھا بلکہ اس لیے کہ روئیں اور دھوئیں کوئی اور مثلاً یہ خاکسار۔

عدالتوں کے بارے میں یہ شکایت عام ہے کہ وہاں مقدمہ کے فیصلے میں بڑی دیر ہو جاتی ہے اور اس طرح مقدمہ والوں کا بڑا حرج اور خرچ ہوتا ہے۔ گھریلو عدالت نے اس کا حل نکال لیا ہے یعنی فوراً سزا دے دو۔ دوسری کارروائیاں بعد میں ہوتی رہیں گی۔

میں پہنچا تو دیکھا "گرم بازارِ فوج داری ہے"[1] شیخ سے زیادہ عذرا چوربنی، ان سے ملی کھڑی ہیں اور شیخ صاحب ریت میں اَٹے ایسے نظر آتے تھے جیسے کبھی ان کو دیوار میں چُن دیا گیا تھا۔ جسے رفتہ رفتہ یہ چاٹ کر باہر نکل آئے تھے۔

بغیر کچھ سوچے سمجھے غصّہ آ گیا۔ بے وقوفوں اور جاہلوں کو اسی طرح غصّہ آتا بھی ہے اور جس موقع پر اردو کے شاہنامہ میں ایک شعر آتا ہے۔

پکڑ کر کمر بند سہراب کا
زمین سے لیا پیلتن نے اُٹھا

میں نے بھی چاہا کہ شیخ کے ساتھ وہی سلوک کروں جو پیلتن[2] نے کیا تھا، لیکن سہراب کو بالکل گیو، گودرز پا کر اور کچھ اس خیال سے کہ تہمتن[3] کا مقابلہ سہراب سے نہیں بلکہ

1۔ غالبؔ کا مصرعہ ہے۔ فوج داری کے معنی ہیں مار پیٹ، دنگا، فساد۔

2۔ شاہنامہ فارسی کی مشہور کتاب ہے جس میں بہادروں اور بادشاہوں کی لڑائی کے قصے ہیں۔ شاہنامہ کا سب سے بڑا سورما رستم ہے۔ اس کا بیٹا سہراب ہے جو کہ دھوکہ میں باپ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ پیلتن کے معنی ہیں ہاتھی جیسا جسم رکھنے والا یا ہاتھی جیسا طاقت ور رستم کا لقب تھا۔ اس کتاب کو ضرور پڑھو۔

3۔ گیو اور گودرز ایران کے دو مشہور پہلوان تھے۔ گیو گودرز کا بیٹا تھا، لیکن یہاں ان پہلوانوں سے مراد نہیں ہے بلکہ یہ ہے "گیا گزرا یعنی نہایت کمزور اور بُرے حال میں۔"

رستم کا لقب ہے۔

تہمینہ[1] سے تھا۔ سپر[2] ڈال دی۔ اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کیا ہوا۔ لڑائی کے میدان سے آخری خبر یہ آئی:

''تہمتن سہراب کو نہلا دھلا رہے ہیں۔ تہمینہ سہراب کے کپڑے درست کر رہی ہیں اور عذرا ایک ہاتھ میں ایک لڈو اور دوسرے ہاتھ میں ایک لڈو لیے کھڑی ہیں۔''

●●●

1. تہمینہ رستم کی بیوی اور سہراب کی ماں۔
2. سپر کے معنی ہیں ڈھال کے، سپر ڈال دینا کے معنی ہیں ہار مان لینے کے۔